شرح
دیوانِ غالب
ناصر دہلوی
پی ڈی ایف اہتمام : غلام مصطفیٰ دائم

سیّد محمّد الیاس ناصر دہلوی

کتاب کا نام	شارح دیوان غالب
مصنف	سیّد محمد الیاس ناصر دہلوی
ناشر	گلفراز احمد
	علم و عرفان پبلشرز، لاہور
مطبع	زاہدہ نوید پرنٹرز، لاہور
خطاطی	خالد محمود اعوان
سرورق	خالد محمود اعوان
سال اشاعت	اپریل ۲۰۰۷ء
قیمت اندرون پاکستان	۲۵۰ روپے
قیمت بیرونی ممالک سے	۵.۵۰ پاؤنڈ یا ۱۰ ڈالرز

☆ ملنے کے پتے ☆

علم و عرفان پبلشرز

34۔ اردو بازار، لاہور فون: 7352332-7232336

معرفت سینا لیبارٹریز، 16 اے چوہان روڈ، اسلام پورہ، لاہور

انتساب

میں اپنی اِس شرح دیوانِ غالبؔ کو استاذی المکرم والمحترم جناب سیّد سلیم شاہجہانپوری، حضرت قبلہ حافظ سیّد مختار احمد صاحب مختارؔ شاہجہانپوری (نوراللہ مرقدہ) اپنے بڑے بھائی سیّد محمد اسحاق خان شورؔ۔ اپنی پیاری اہلیہ بیگم فاطمہ ناصرہ بنت محمد زکریا خانصاحب (مرحوم و مغفور) اپنی پیاری والدہ رشیدہ بیگم غفراللہ لہا بنت سیّد نظیر علی (مرحوم و مغفور) اپنے والد سیّد محمد ابراہیم خاں صاحب (غفراللہ لہٗ) اپنے تینوں بیٹوں سیّد محمد عارف ناصرؔ، بیرسٹر سیّد محمد صالح ناصرؔ بیرسٹر سیّد محمد شعیب ناصر ڈاکٹر، اپنی دونوں بیٹیوں عزیزہ امۃ الشافی بیرسٹر عزیزہ اسماء شیریں بیرسٹر اہلیہ ڈاکٹر عمران رفیع، اپنے پوتوں، پوتیوں اپنے نواسہ ضمیر موسیٰ اور اپنی نواسی مدحیہ اور اپنے پیارے اور عزیز منہ بولے بھائی محمد رحیم فیض، کے پیارے ناموں کے ساتھ منسوب کرنے میں دلی مسرت محسوس کرتا ہوں۔

دُعا ہے کہ اللہ تعالیٰ میرے مخدوم و محسن حضرت مختارؔ شاہجہانپوری اور میرے مرحوم والدین کی مغفرت فرمائے اور انہیں جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام قرب سے نوازے نیز میری تمام اولاد کو فلاح دارین عطا فرمائے اور سب کو اپنی رضا کی راہوں پر چلنے کی توفیق دے اور قدم قدم پر ان کی دستگیری فرمائے اور ہر حال میں ان کا حافظ و ناصر ہو۔ آمین

سیّد محمد الیاس ناصرؔ دہلوی

عرضِ حال

مرزا غالب مرحوم دنیائے ادب کے وہ باکمال شاعر ہیں جن کا ثانی اُردو ادب میں آج تک پیدا نہیں ہوا۔ آئندہ کے متعلق سوائے اللہ تبارک تعالیٰ کے کوئی نہیں جانتا لیکن بالفرض کوئی پیدا ہو بھی جائے تو ایسی شہرت و عزت یکدم حاصل نہیں کر سکے گا۔ مرزا غالب کے تخیل کی بلندی، تصور کی اطافت، بلند پروازی، فصیح و بلیغ انشا پردازی، پُر حکمت معنی آفرینی اور فلسفہ و تصوف کے گہرے رنگ اُس دور کے شرابِ تغزل کو کس شیشے میں ڈال کر میکدۂ غزل میں پیش کرے گا اور یہ بقائے دوام جو مرزا غالب کو حاصل ہو چکا کیسے پیچھے چھوڑے گا۔ مرزا غالب کا اُردو فارسی کلام بلا تردید غالب ہے آپ کے تخیل اور تصور کا احاطہ کرنا نہ صرف محال بلکہ ناممکن ہے۔ ہاں الفاظ کی قید و بند میں رہ کر سخن و فہم کے لیے کچھ اُچک لینا ممکن ہے جو کچھ اس ناچیز نے حاصل کر لیا ہے وہ ناظرین کے پیشِ خدمت ہے۔ خاکسار اپنے متعلق "کلامِ ناصر" میں بہت کچھ لکھ چکا ہے۔ لہٰذا یہاں اس کا اعادہ کرنا نہیں چاہتا۔ شرح دیوانِ غالب، کے متعلق اتنا عرض کرنا غیر ضروری نہ ہوگا کہ کلامِ غالب کو سمجھنے کی کوشش بچپن سے ہی تھی۔ یہ میرا ذوق و شوق بعض قارئین کے لئے موجبِ حیرت ہوگا کہ کم سنی میں غالب کو پڑھنے سمجھنے کا خیال کیسے پیدا ہوا۔ یہ ہے تو عجیب و غریب بات مگر امرِ واقعہ یہی ہے۔

میری عمر سات یا آٹھ برس کی ہوگی کہ میں نے اپنی پیاری والدہ مرحومہ کو یہ کہتے ہوئے سُنا کہ "شعر و شاعری کا شوق زبان یعنی اردو سیکھنے کے لئے بہت اچھا ہے۔ کچھ ایسے ہی مفہوم کے الفاظ تھے جو والدہ مرحومہ کسی سے کہہ رہی تھیں۔ پھر کیا تھا ہمارے شوق کو پَر لگ گئے اور ہم بازار میں کتابوں کی ایک دکان پر پہنچے اور اپنا مُدعا کُتب فروش کو بتایا جس پر کُتب فروش نے پوچھا کہ برخوردار آپ

کے پاس کتنے پیسے ہیں۔ ہم نے جو کچھ ہماری جیب میں تھا اُس کی نذر کر دیا جس پر اُس نے غالباً پرانی غیر مجلد دیوانِ غالب کی ایک کاپی ہمارے حوالہ کر دی۔ ہم گھر آئے اور غالباً کوٹھے پر جا کر پہلی بار کلامِ غالب پڑھنا شروع کیا۔ مگر پلے کچھ نہیں پڑا چونکہ الفاظ ثقیل تھے اور روزمرہ کی زبان سے مختلف۔ سوچا کہ اردو کی لغت ہو تو پھر کام نکلے گا۔ غالباً گھر ہی میں سے کوئی چھوٹی سی لغت مل گئی جس میں الفاظ کے معنی تلاش کرنے شروع کئے لیکن پھر بھی کچھ زیادہ پلے نہیں پڑا۔ مگر ہمت نہیں ہاری۔ نہ جانے کتنے عرصہ بعد کسی قدر سمجھ میں آیا اور اس میں ایک خاص لطف و سرور تھا جس کی وجہ سے ہم دیوانِ غالب سے ساری عمر چمٹے رہے۔ حتیٰ کہ جب بغرضِ اعلیٰ تعلیم ہالینڈ سے ہوتے ہوئے انگلینڈ آئے تو قرآنِ کریم اور دیوانِ غالب ہمارے رختِ سفر کی زینت تھے۔ جب کبھی انگریزی لکھنے پڑھنے سے طبیعت اُکتا جاتی تو دیوانِ غالب اُٹھاتے اور ایک دو غزلیں پڑھ کر اپنی روح میں تر و تازگی پیدا کر لیتے۔ ۱۹۵۴ء سے لندن میں مستقل قیام رہا۔ البتہ تقریباً ہر سال پاکستان کا دورہ کرتے رہے اور اپنے والدین بھائیوں اور عزیز و اقارب سے مل آتے۔ اب بھی یہی دستورِ زندگی ہے۔ ۱۹۹۰ء میں حضرت سلیم شاہجہانپوری سے پہلی دفعہ ملاقات لندن کے ایک مشاعرہ میں ہوئی۔ دورانِ گفتگو بہت سی عزیز داریاں نکل آئیں۔ آنجناب کیلیفورنیا چلے گئے لیکن باہم خط و کتابت کا سلسلہ برابر جاری رہا۔ جب آنجناب کیلیفورنیا سے واپس پاکستان آنے لگے تو خاکسار کے پاس ایک ہفتہ قیام کا وعدہ بھی پورا کیا۔ ان ہی دنوں ہماری چھوٹی بیٹی اسما شیریں کی شادی تھی۔ میری بیگم اور میں نے آنجناب سے جانے کے وقت کہا کہ ہماری خواہش ہے کہ آپ ہماری بیٹی کے لئے سہرا کہہ دیں۔ مگر اب وقت تھوڑا ہے۔ فرمایا کیوں نہیں ہمیں کاغذ قلم دو ہم ابھی لکھتے ہیں۔ وہیں بیٹھے بیٹھے اکتیس اشعار پر مشتمل بہت عمدہ سہرا لکھ دیا۔ میری حیرت و استعجاب کی انتہا نہ پوچھئے دل ہی دل میں کہتا تھا کہ اللہ اللہ آج بھی ایسی باکمال ہستیاں ہم میں موجود ہیں، جو قلم برداشتہ نظم بھی اس طرح لکھ لیتے ہیں کہ ہم نثر میں بھی نہیں لکھ پاتے۔ ساتھ ہی یہ خیال بھی دامن گیر ہوا کہ کیوں نہ شعر و شاعری کے میدان میں قدم رکھ کر آنجناب سے اصلاح لی جائے۔ ابا مرحوم بھی شعر کہہ لیتے تھے۔ ایک دادا بھی شاعر تھے اور

میرے بڑے بھائی محمد اسحٰق شور بھی بہت عمدہ کہنے والے ہیں۔ اس طرح بچپن سے جو شعر و شاعری کا شوق ہے وہ بھی آگے بڑھے گا۔ پھر کیا تھا ہم نے آنجناب سے درخواست کی جس کو آپ نے نہ صرف قبول کیا بلکہ حوصلہ افزائی بھی کی۔ (اَلحَمدُ لِلّٰہ اس تھوڑے سے عرصہ میں آج خاکسار نہ صرف صاحبِ دیوان شاعر ہے بلکہ بقول استادِ محترم صفِ اوّل کا شاعر ہے۔ سخن فہم حلقہ میں خاکسار کی غزلوں کو پسند کیا جاتا ہے۔ چند جریدے خود ہی کچھ نہ کچھ خاکسار کا کلام چھاپتے رہتے ہیں۔ تقریباً چالیس غزلیں مرزا غالبؔ کی زمین میں بھی کہی جا چکی ہیں۔ اب حضرت سلیمؔ صاحب نہ صرف میرے استادِ محترم ہیں بلکہ انہوں نے ازراہِ شفقت مجھے اپنا برادرِ خورد بھی بنا لیا۔ ایک ملاقات میں اس عاجز نے آنجناب سے یہ عرض کیا کہ میرا دل چاہتا ہے کہ میں دیوانِ غالبؔ کی شرح لکھوں۔ فرمانے لگے ضرور لکھو مگر بغیر شرح پڑھے ہوئے میں نے عرض کیا کہ لندن میں کوئی شرح دستیاب نہیں ہے اور نہ میں دوسروں جیسی شرح لکھنا چاہتا ہوں۔ میری سخن فہمی غالبؔ کے کلام کی بہت مختلف ہے۔ میں فصاحت و بلاغت کی لمبی چوڑی بحثوں میں پڑ کر شرح لکھنا نہیں چاہتا بلکہ ایک ایسی شرح لکھنا چاہتا ہوں کہ پڑھنے والے غالبؔ کے کلام کی تہ تک پہنچ جائیں اور وہ لطف اندوز بھی ہوں۔ لہٰذا کچھ عرصہ بعد میں نے نمونتاً پچاس غزلوں کی شرح لکھ کر پیشِ خدمت کر دی۔ کافی عرصہ کے بعد حضرت سلیمؔ صاحب استادِ محترم نے شرح کے متعلق یہ لکھا۔

"میرے پیارے بھائی آپ تو چھپے ہوئے رستم نکلے۔ میں نے جب آپ کی دیوانِ غالبؔ کی شرح کا مطالعہ شروع کیا تو حیرت و استعجاب میں ڈوب گیا۔ ماشاءاللہ آپ نے قرآن کریم کی روشنی میں جو مطالب بیان کئے ہیں وہ آپ کی تشریحات کو ایک منفرد مقام کا حامل بنا دیتی ہیں۔ میں نے غالبؔ کے کلام کی کئی شرحیں مطالعہ کی ہیں لیکن آپ کا تو رنگ ہی سب سے جُدا نظر آتا ہے۔ آپ کی تشریحات و توجیحات دعوتِ غور و فکر دیتی ہیں اور یہ سب قرآن کریم کی تفاسیر اور حقیقی اسلام کے علم کلام کی برکت ہے۔ ماشاءاللہ زورِ قلم اور زیادہ ہو۔ آپ اس سلسلہ کو جاری رکھیں۔"

لہٰذا حسبِ ارشادِ استادِ محترم ہم نے شرح دیوانِ غالبؔ مکمل کر کے پیشِ خدمت کر دی۔
جن امور کی میں نے سختی سے پابندی کی اُن میں سب سے اوّل یہ تھی کہ الفاظ کی حدود سے باہر قدم نہیں رکھنا۔ جن معنی و مطالب کے الفاظِ شعر حامل نہیں ہو سکتے وہ مطالب قطعی بیان نہیں کرنا۔ الفاظ کی قید میں رہتے ہوئے اعلیٰ سے اعلیٰ معنی حسبِ مراتب مرزا غالبؔ کئے ہیں۔ والحمد للہ۔
دوئم مرزا غالبؔ کی اُردو فارسی اور عربی پر عبور حاصل ہونے کی اعلیٰ صلاحیتوں کو پیشِ نظر رکھا اور اُن کی نجی زندگی کے ہر پہلو کو سامنے رکھا۔ اُن کی عربی دانی سے عام طبقہ واقف نہیں۔ لیکن حقیقت ہے کہ انہیں عربی زبان پر بھی اتنا ہی عبور حاصل تھا جتنا کہ اردو اور فارسی پر۔ اُن کی عربی زبان کی مشہور لُغت قاطع بُرہان اس بات کی سند ہے کہ انہیں قرآن و تفاسیر اور اسلامی علم کلام پر عبور حاصل تھا۔ یہی وجہ ہے کہ مرزا غالبؔ وہ حکمتیں بیان کر گئے جن کا اکثر و بیشتر آج کل کے نام نہاد علماء کو بھی پتہ نہیں۔ ایسی حکمتیں اللہ تعالیٰ کسی کو عطا نہیں کرتے جب تک کسی کے دل کے کسی گوشہ میں نیکی کا عنصر نہ ہو۔ زندگی کا یہ پہلو وہ چھپاتے رہے شاید اس کی ایک وجہ ان کی بادہ نوشی ہو۔
اُن کے کلام کے فہم سے یہ حقیقت بہت نمایاں ہے کہ اُن کا محبوب کوئی دنیاوی محبوب نہیں، کیونکہ اپنے محبوب کی جو صفات وہ بیان کرتے ہیں وہ ازلی ابدی لامحدود ہیں اور ان صفات کا مالک صرف اور صرف اللہ جلّ شانہٗ کے علاوہ اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ ظلّی طور پر تمام صفاتِ الٰہیہ کے حامل ہمارے آقا و مولا حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ ذرا غور تو کیجئے مرزا صاحب کی شادی اُن کی نوعمری میں ہوئی۔ آٹھ نو بچے پیدا ہوئے جو بچپن میں ہی فوت ہو گئے۔ مگر مرزا نے کبھی دوسری شادی کا خیال بھی نہ کیا۔ لہٰذا یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اُن کا محبوب اللہ تعالیٰ کے سوا اور کوئی نہیں تھا جس کو وہ ظاہر کرنا پسند نہیں کرتے تھے۔ نیز اُردو میں غزل غزل ہی نہیں رہتی وہ یا تو حمد ہو جائے گی یا نعت۔ لیکن مرزا غالبؔ کی بات ہی کچھ اور ہے۔ وہ غزل ہی میں وہ سب کچھ بیان کر جاتے ہیں جس کا تصور بھی ایک حمد و نعت لکھنے والا شاعر نہیں کر سکتا۔ مرزا غالبؔ کے مقام کا تعین کرنا ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں۔ میر تقی میرؔ اردو زبان کے میرِ قافلہ شمار کئے جاتے ہیں۔ اُردو زبان کو نکھارنے اور

سنوارنے میں اُن کا بڑا ہاتھ ہے لیکن غالب نے زبان کی شاہراہ کو ایک ایسا موڑ دیا جس کی مثال نہ متقدمین میں ملتی ہے نہ متاخرین میں۔ انہوں نے اُردو زبان میں تصوف اور فلسفہ کو اس بلند مقام تک پہنچا دیا جس کا جواب کسی شاعر نے کیا دینا تھا وہ اُس کے فلسفہ کی گرد تک کو نہ پا سکے۔

۱۹۵۰ء یا ۱۹۵۱ء کی بات ہے میرے ایک دوست عاشق بن صوفی مرحوم نے قبلہ حافظ مختار احمد صاحب شاہجہانپوری مرحوم سے سوال کیا کہ غالب کا اُردو، فارسی میں کیا مقام ہے۔ فرمایا "اس کا مرغِ تخیل جہاں پرواز کرتا اور لہریں لیتا ہے اس بلندی پر دوسرے پر بھی نہیں مار سکتے۔ موصوف خود اُردو میں وہ مقام رکھتے تھے کہ جب حضرت داغ دہلوی نے آپ کا واسوخت پڑھا تو ان الفاظ میں خراجِ تحسین پیش کیا۔

"میں اس نومشقی میں آپ کو ایک کہنہ مشق شاعر ہونے کی داد دیتا ہوں۔"

قبلہ حافظ صاحب داغ کے ہم عصر شاعر حضرت امیر مینائی کے شاگرد تھے میں نے جو کچھ سمجھا اور جس طرح شرح لکھی ان میں ہمیشہ یہ تین اشعار پیشِ نظر رہے۔

۱۔ یارب نہ وہ سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے میری بات
دے اور دل اُن کو جو نہ دے مجھ کو زباں اور

۲۔ ہیں اور بھی دنیا میں سخنور بہت اچھے
کہتے ہیں کہ غالب کا ہے اندازِ بیاں اور

---

۳ یہ مسائلِ تصوف، یہ تیرا بیان غالب
تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

میں قارئین کو دعوت دیتا ہوں کہ وہ بھی میرے نقطۂ نظر کو ذہن میں رکھتے ہوئے میری شرح کا مطالعہ فرمائیں تاکہ غالب کو سمجھنے میں میرے پیش کردہ نقطۂ نظر سے مدد ملے اور اس زاویہ سے بھی غالب شناسی کا حق ادا ہو جائے۔

میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ مرزا غالب کا مرغِ تخیل بہت بلندی پر پرواز کرتا ہے۔ لہٰذا عام معنی اُن کے اشعار کے کرنا سراسر ناانصافی ہے جن لوگوں نے اُن کے اشعار کو سطحی نظر سے دیکھا وہ سمجھ نہ پائے۔ اسی لئے ان کے کلام پر مشکل اور مہمل ہونے کا ٹھپّہ لگا دیا۔ دراصل ہمیں مروّجہ نقطۂ نظر سے ہٹ کر ان کے کلام کو تصوف اور فلسفی زاویۂ نگاہ سے پرکھنا چاہیئے مجھے یقین اور بھروسہ ہے کہ ناقدین اور تبصرہ نگار میری تائید کریں گے اور اس طرح میری شرح خاص وعام میں مقبول ہوگی۔

آخر میں میں ان تمام احباب کا اور خاص طور پر اپنے استاذی المکرم جناب سیّد محمد میاں سلیم شاہجہانپوری صاحب کا بے حد احسان مند اور جناب خالد محمود اعوان کا بھی شکر گزار ہوں جنھوں نے یہ شرح حسبِ منشا تحریر کی۔ اللہ تعالیٰ اِن سب کو جزائے خیر دے۔ آمین۔

احقر العباد
سیّد محمّد الیاس ناصر دہلوی
مقیم لندن
۱۶ مئی ۲۰۰۳ء

تبصرے

خدا تعالیٰ کا ہزار ہزار شکر ہے کہ جس نے محض اپنے فضل سے شرح دیوانِ غالب کے لکھنے کی توفیق عطا کی۔ اگر میرے استادِ محترم میری حوصلہ افزائی نہ کرتے تو شاید مجھ ناچیز کو جو وطن سے دور اور دنیاوی اشغال میں ہمہ تن مصروف اس کے لکھنے کی جرأت اور ہمت نہ ہوتی۔ اب جبکہ بہت سے تبصرے شعراء کرام کے اور اخبارات، و رسائل کے آچکے ہیں یہ سب میرے لئے باعثِ مسرت ہیں اللہ تبارک وتعالیٰ سے دعا ہے کہ اس شرح دیوانِ غالب کو ہمیشہ مقبولِ خاص و عام بنائے رکھے باوجود اس کے کہ شرح دیوانِ غالب بہت تھوڑی تعداد میں چھپی تھی اور اس کی ترسیل وتقسیم کے لئے کوئی انتظام نہ کیا گیا تھا۔ سوائے چند کاپیاں شرح دیوانِ غالب جو دو چار اخباروں اور چیدہ چیدہ رسائل کو برائے تبصرہ دی گئیں تھیں۔ نیز کچھ اپنے دوست احباب کو بھی جن کے علم میں تھا کہ ہم شرح دیوانِ غالب مرتب کر رہے ہیں اور نہ ہی ہم کسی ناشر کے پاس گئے اور نہ ہی اب تک شرح دیوانِ غالب کتب فروشوں کی دکان کی زینت بنی۔ دراصل ان تمام باتوں کی وجہ میں جناب اسلم فرخی صاحب کی رائے کارفرما تھی۔ جب ہم آنجناب سے مشورہ کرنے گئے کہ کتاب پر تبصرہ لکھنے کے لئے کس کس اشخاص کو چنا جائے اور پورے مسودہ کی فوٹو کاپی کرائی جائیں۔ یا نمونہ کے طور پر کچھ حصہ فراہم کر دیا جائے۔ آنجناب نے فرمایا ''بعض مصنف پہلے ہی کسی کو دکھا کر تبصرہ حاصل کر لیتے ہیں اور پھر وہ مستقل کتاب کا حصہ ہو جاتا ہے لیکن میں ایسا کرنا پسند نہیں کرتا چونکہ بعض قارئین ایسا کرنے سے یہ مطلب لیتے ہیں کہ کتاب اپنے بل بوتے پر نہیں بلکہ مشہور و معروف تبصرہ نگاروں کی بدولت چل نکلی ہے لہٰذا میرے خیال میں یہ بہتر ہوگا کہ آپ کتاب پہلے تھوڑی تعداد میں چھپوائیں اور ان شخصیتوں کو جن کو آپ چنیں

کتاب پہنچا دیں۔ اسی طرح چند اخبارات اور رسائل کو بھی بعد ازاں وہ تبصرے دوسرے ایڈیشن میں شامل کرلیں۔ اس سے آپ کو اپنی (شرح دیوانِ غالبؔ) کتاب کی مقبولیت کا اندازہ ہو جائے گا اور پھر ترسیل و تقسیم میں مدد بھی ملے گی۔'' ہم نے آنجناب کے مشورے کو مفید جانا اور عمل کیا۔ البتہ وہ تبصرہ جو میرے استادِ محترم لکھ چکے تھے اور اس کی کتابت ہو گئی تھی وہ کتاب کا حصہ بن چکا تھا رہنے دیا۔ اب جبکہ غیر جانبدار شخصیات اور رسائل و اخبارات کے بہت سے تبصرے آگئے ہیں ہم اس ایڈیشن میں استاد محترم کا تبصرہ نہیں چھاپ رہے ہاں جس قدر اس تبصرہ کے اوراق ہیں ہم دوسرے تبصرے قارئین کے لیے پیش کرتے ہیں۔ تاکہ قارئین کرام کے دل میں جانبداری کا خیال نہ آئے اور وہ شرح دیوانِ غالب کی حقیقی قدر و قیمت جان لیں۔ خدا کا شکر ہے کہ اُس نے ہماری توقع سے کہیں زیادہ اربابِ علم و فضل کے تبصروں سے ہمیں نوازا ہے جس میں سے دو تین تبصروں کا خلاصہ ہم پیش کر رہے ہیں۔ بہت سے دوست احباب نے بذریعہ خطوط اور ٹیلی فون پر اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ ان کی دلجوئی کے لیے ہم سب تو نہیں البتہ دو چار جملے لکھ رہے ہیں چونکہ ہمارے پاس صرف تین چار صفحات ہیں۔

سب سے پہلے جو تبصرہ منظرِ عام پر آیا وہ ''قومی زبان'' ماہنامہ انجمن ترقی اردو کراچی مرکزیہ کا ہے۔ اس نے اپنی اشاعت ستمبر ۲۰۰۳ء میں دو صفحات پر مشتمل تبصرہ کیا جس میں سے خاص خاص باتیں ہم قارئین کے لئے نقل کرتے ہیں۔

''ناصر دہلوی صاحب کا تعلق غالبؔ کے وطن دہلی سے ہے۔ موصوف کو غالبؔ سے بے حد عقیدت و ارادت کا حال جو اپنے دیباچہ یعنی عرض، حال میں خود لکھا ہے جو کہ انہیں بچپن سے غالب سے ہے۔ ناصر دہلوی صاحب کو مذہب سے، اردو ادب سے محبت ورثہ میں ملی ہے۔ ناصر صاحب نے جس طرح غالبؔ کے اشعار کو سمجھا ہے کم و کاست ضبطِ تحریر میں لاتے چلے گئے۔ یہ شرحیں خالص ناصر دہلوی صاحب کے اپنے انداز کی ہیں چنانچہ ان میں ایک قسم کی اوریجنلیٹی بھی پائی جاتی ہے سید ناصر دہلوی صاحب کے مختصر اظہاریہ سے ظاہر ہے کہ شعر و ادب، شعرفہمی و شعر شناسی انہیں ورثے میں ملی ہے۔ خود بھی صاحب دیوان شاعر ہیں'' (نمونتاً ایک دو غزلیں ہم قارئین کرام کے لیے اس تبصرہ کے

آخر میں پیش کرتے ہیں۔ (مصنف) بہر حال یہ ماننا پڑے گا کہ ان کے ذوقِ شعری میں پہلی اینٹ غالب کا وہ دیوان ہے جو انہیں بچپن میں کچھ پیسوں کے عوض کتب فروش نے دیا تھا۔ مختصر یہ کہ ناصر دہلوی صاحب کی یہ مساعی قابلِ تحسین و ستائش ہیں اور غالب کی شرح کے خزانے میں ایک قابلِ ذکر اضافے کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ناصر دہلوی صاحب نے مروجہ نقطۂ نظر سے (یعنی حسن و عشق کی مبالغہ آمیزی سے) ہٹ کر تصوف اور فلسفی زاویہ نگاہ سے غالب کو پرکھا اور اسی طرح پرکھنے کی ترغیب دی ہے جناب ناصر دہلوی کی شرح دیوانِ غالب کا اپنا ایک رنگ اور مزہ ہے۔"

دوسرا تبصرہ ہم جناب راغب مراد آبادی صاحب کا جو کہ چار رباعیات پر مشتمل ہے قارئین کے لیے خود انہیں کی تحریر میں بصورت فوٹو کاپی پیش کرتے ہیں۔ جناب راغب مراد آبادی کی شخصیت سے ہندو پاک میں کون واقف نہیں۔ آپ تقریباً ستر سال سے اردو ادب کی خدمت اپنے شعر و سخن سے کر رہے ہیں۔ رباعی کہنے میں تو آپ کو ایسا کمال حاصل ہے جو تاریخ اردو ادب میں ہمیشہ چمکتا دمکتا رہے گا۔ پیشتر اس کے کہ ہم رباعیات کا عکس قارئین کے لیے دکھائیں یہ کہنا ضروری خیال کرتے ہیں کیونکہ ہم آپ کی شخصیات سے متعارف نہ تھے۔ جب شکریہ ادا کرنے کی غرض سے خاکسار آنجناب کے دولت کدہ پر حاضر ہوا۔ فرمایا:

"اچھا تو آپ ناصر دہلوی ہیں۔ آپ کی شرح دیوانِ غالب میں نے بڑے ذوق و شوق سے مطالعہ کی ہے اور جو کچھ میں نے تبصرے میں لکھا ہے اُس میں کوئی مبالغہ نہیں۔ دیکھو وہ سامنے الماری میں میں نے آپ کی شرح رکھی ہے۔ اب بھی کبھی کبھی میں اٹھا کر اس کو پڑھتا رہتا ہوں۔ میں نے آنجناب کا شکریہ ادا کیا اور عرض کیا کہ آپ نے اس ناچیز کی بڑی حوصلہ افزائی فرمائی ہے۔

اب ہم قارئین کی خدمت میں رباعیات کی عکسی تصویر رکھتے ہیں تا کہ قارئین خود فیصلہ کریں کہ آنجناب کی کیا رائے ہے۔ نیز اپنی ایک غزل نمونے کے طور پر پیش کرتے ہیں۔

خاکسار احقر العباد
سید محمد الیاس ناصر دہلوی

بے گرد نو ہے یہ شرح کلام غالب
بیش ارز ہے یہ شرح کلام غالب
شرحیں تو بہت، کلام غالب کی ہیں
نو طرز ہے یہ شرح کلام غالب

پیرایۂ کلام کا حکیمانہ ہے
انداز نگارش بھی سلیمانہ ہے
ناچیز کا مشغلہ ہے، غالب فہمی
تشریح کا معیار حکیمانہ ہے

ناصر بھی تو دہلی کے ہیں رہنے والے

غالب کو ہیں غالب ہی یہ سمجھنے والے

میزان خرد پہ تو لتے ہیں اشعار

جذبات کی رو میں نہیں بہنے والے

غالب شناسوں کی ہے گہما گہمی

روح جہلا کے منہ ہے سہمی سہمی

ناصر نے جو کی شرح کلام غالب

آیا اک انقلاب غالب فہمی

راغب مراد آبادی

۲۱ مارچ ۲۰۰۰ء

له ناصر صاحب کے استاد محترم جناب سلیم شاہ جہاں پوری

غزل

ہر لحظہ رہے ذکرِ نبیؐ کا مرے آگے — ہوتا رہے اُس حسن کا چرچا مرے آگے

اے کاش کہ آجائے کسی روز بصد ناز — وہ راحتِ جاں، جانِ تمنا مرے آگے

کافور کرے خواہشِ دُنیا کو وہ دل سے — اور رکھ دے وہ آئینۂ عقبیٰ مرے آگے

سمجھائے مجھے رازِ جہاں دل میں اُتر کر — لے آئے حقیقت کا وہ نقشہ مرے آگے

اوہام کے ہر نقش کو وہ دل سے مٹا دے — ایقاں کے رکھے ساغر و مینا مرے آگے

ہے قلب مرا بادۂ عرفاں کیلئے وقف — کیوں رکھتے ہو پیمانۂ صہبا مرے آگے

تدبیر کے حیلوں سے میں تقدیر کو پاؤں — آئینہ بنے ہستیِ اشیا مرے آگے

ملتی ہے سزا اور جزا کچھ تو یہاں بھی — دکھ سکھ کا ہے ہر روز نظارہ مرے آگے

دریا ہو کہ صحرا ہو گلستاں کہ بیاباں — رہتا ہے سدا اُن کا سراپا مرے آگے

ایماں کو کہوں کفر تو کافر کو مسلماں — دستور فقیہوں نے یہ رکھا مرے آگے

ہر دور میں ظلمت پہ رہا نور ہی غالب — شیطان رہا پیچھے تو مسیحا مرے آگے

بدلا ہے نہ پیمانہ نہ بدلی ہے مۓ عشق — ساقی ہے وہی آج پرانا مرے آگے

مشغول رہوں طاعتِ محبوبِ خدا میں — ہو شام و سحر اُن کا ہی اُسوہ مرے آگے

ہے اب تو یہی ایک تمنا مرے دل میں — دنیا مرے پیچھے ہو عقبیٰ مرے آگے

ناصر میں زمانے کی ہوا دیکھ رہا ہوں
آئینۂ ایام ہے گویا مرے آگے

فہرست

سوختہ جاں

بے سرو

قصائد

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

شرح دیوانِ غالب

غزل ۱

۱۔ نقش فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا ! کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا !

معنی : شوخیِ تحریر : صفتِ خالقیت ، کاغذی پیرہن : عارضی ۔ ناپائیدار وجود

مطلب : مرزا غالب کے دیوان کا یہ پہلا شعر ہے ۔ لہٰذا قرینِ قیاس ہے کہ یہ شعر بطورِ شکوہ نہیں بلکہ خالق کی مدح میں ہے ۔ خالق اور مخلوق کا تعلق ۔ فرق اور کیفیات بیان کی ہیں ۔ مطلب یہ ہے کہ ہستی بسبب محتاجی و ناپائیداری اور عارضی ہونے کا اظہار کر رہی ہے کہ یہ عارضی اور ناپائیدار وجود دے کر کس جنجال میں ڈال دیا ۔ ہر ایک فنا کی چکی میں پس رہا ہے ۔ صرف ایک ہی وجود ہے جو ازل سے ہے اور ابد تک رہے گا ۔ اللہ باقی من کل فانی ۔

۲۔ کاوِ کاوِ سخت جانی ہائے تنہائی نہ پوچھ صبح کرنا شام کا ۔ لانا ہے جوئے شیر کا

معنی : کاوِ کاوِ : کاوش و کاہش کا مخفف ہے ۔

مطلب : مطلب یہ ہے کہ عاشق صادق کا "صبح کرنا شام کا" یعنی ایک رات تنہائی میں گذارنا کوئی معمولی بات نہیں بلکہ فرہاد کا پہاڑ کو کاٹ کر دودھ کی نہر نکالنے کے مترادف ہے ۔

۳۔ جذبۂ بے اختیارِ شوق دیکھا چاہیے سینۂ شمشیر سے باہر ہے ۔ دم شمشیر کا

معنی : سینۂ شمشیر تلوار کی باڑھ ۔ دمِ شمشیر تلوار کی دھار ۔ آبِ شمشیر کو سینۂ شمشیر سے باہر ہونے سے تشبیہ دی ہے اور عاشق کے جذبۂ بے اختیار شوق کو آبِ شمشیر کا سینے سے باہر مونہا مارلیا ہے ۔

مطلب : انسانی فطرت میں جذبۂ عشق و محبت ودیعت کیا گیا ہے ۔ کسی نے اپنا مسجود خدا کو بنایا ہے کسی

نے مال و متاع ۔ جاہ حشمت کو۔ کسی نے اولاد کو کسی نے اپنے دنیادی محبوب کو۔ غرض جذبۂ
بے اختیار شوق ہر جگہ اپنا ایک نیا منظر پیش کر رہا ہے۔ شعر بھی بہت آبدار ہے

آگہی ۔ دامِ شنیدن جس قدر چاہے بچھائے   مُدعا عنقا ہے۔ اپنے عالمِ تقریر کا

معنی :۔ آگہی ۔ اطلاع پانا، علم حاصل ہونا ۔ عنقا ۔ فرضی پرندہ ۔ نہ نظر آنے والی چیز ۔
مطالب :۔ شعر کا یہ ہے کہ سُننے والا چاہے جتنے عقل کے گھوڑے دوڑانے کتنی ہی کوشش کیوں
نہ کرے ۔ میرے کلام کو پوری طرح نہیں سمجھ سکے گا ۔ میرا کلام لوگوں کی عقل سے بالا ہے ۔
کیونکہ میں فلسفہ اسرار الٰہی اور تصوف کی باتیں کرتا ہوں ۔

بس کہ ہوں غالبؔ اسیری میں بھی آتش زیرپا   موئے آتش دیدہ ہے حلقہ مری زنجیر کا

معنی :۔ آتش زیرپا ۔ بے قرار ، بے چین ۔ موئے ۔ بال ۔ آتش دیدہ ۔ جلا ہوا ، کمزور
مطالب :۔ فرماتے ہیں میں اسیر عشق ہوں ۔ آتش عشق اور گرمیِ وحشت سے میری قید کی زنجیر
بہت کمزور ہو گئی ہے ۔ میں قیدِ حیات سے جلد آزاد ہونے والا ہوں ۔

غزل ۲

جز قیس اور کوئی نہ آیا بروئے کار   صحرا مگر بہ تنگیِ چشمِ حسود تھا

معنی :۔ بروئے کار آنا ، میدان میں آکر مقابلہ کرنا ۔ صحرا ، جزیرہ عرب مجازاً زمانہ ،
حسود ، جمع حاسد کی یا بہت حسد کرنے والا ۔

مطالب :۔ فرماتے ہیں میدانِ عشق میں قیس کے علاوہ کوئی مردِ میدان نہ ہوا ۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے
کہ زمانہ چشمِ حاسد کی طرح تنگ تھا اور اس میں کسی اور کی گنجائش نہ تھی ۔ یہ بیان مجازی عشق
میں شاید سچ ہو لیکن حقیقی عشق میں تمام انبیا ، ہیں اور ان سب سے بڑھ کر ہمارے نبی صلی اللہ
علیہ وسلم تھے ۔ آپؐ کے متعلق اہل عرب نے ہی یہ شہادت دی کہ عشق محمد علی ربہٖ

یعنی محمد اپنے رب پر عاشق ہو گیا ہے۔

آشفتگی نے نقشِ سویدا کیا درست   ظاہر ہوا کہ داغ کا سرمایہ دُود تھا

معنی:۔ آشفتگی۔ پریشان حالی، پریشان خیالی۔ نقشِ سویدا۔ کالا دھبہ۔ نفسانی خواہشات۔
دود۔ دھواں، درست کیا، مکمل کیا۔

مطلب۔ میری پریشان حالی نے میرے دل کے دھبہ کو ٹھیک کر دیا۔ لہٰذا ثابت ہوا کہ داغ کو ضرورت تھی کہ دُھواں ہو۔ اگر آشفتگی کے معنی عشقِ حقیقی کئے جائیں تو مطلب یہ ہوگا کہ نفسانی خواہشات نے جو دل پر داغ ڈال دیا تھا۔ اُس کو عشقِ الٰہی اور خدا کی یاد میں آہ و زاری کرنے سے دل کا داغ ٹھیک ہو گیا۔ جیسا کہ حدیث میں ہے کہ جب انسان کوئی گناہ کرتا ہے تو اس کے دل پر ایک سیاہ دھبہ پڑ جاتا ہے اور جب کوئی نیکی کرتا ہے تو سفید نورانی نشان پڑ جاتا ہے۔ گناہ کرتے رہنے سے دل کالا ہو جاتا ہے اور نیکیاں کرنے سے بقعۂ نور بن جاتا ہے۔

تھا خواب میں خیال کو تجھ سے معاملہ   جب آنکھ کھُل گئی نہ زیاں تھا نہ سُود تھا

معنی۔ خواب سے مراد عہدِ جوانی۔ آنکھ کھُل گئی۔ سمجھ آگئی یعنی عہدِ پیری میں داخل ہو گئے۔ علم اور تجربہ نے بہت سکھایا۔

مطلب۔ یہ ہے کہ عہدِ جوانی اور اس کی تمام خواہشات اب خواب بن گئی ہیں یعنی خیالی پلاؤ پکاتے رہے کہ ہم یہ کریں گے وہ کریں گے۔ معاملہ خیال تک ہی رہا۔ عمل کی نوبت نہ آئی۔ لہٰذا کوئی فائدہ نقصان نہیں ہوا۔

لیتا ہُوں مکتبِ غمِ دل میں سبق ہنوز   لیکن یہی کہ "رفت" گیا، اور "بُود" تھا

معنی۔ مکتبِ غمِ دل۔ حالاتِ زندگی، تجربات زندگی، تلخیاں، ناکامیاں

مطلب۔ فرماتے ہیں کہ میں مکتبِ غمِ دل میں سبق پڑھتا رہتا ہوں۔ یعنی عبرت حاصل کرتا ہوں۔

ڈھانپا کفن نے داغِ عیوبِ برہنگی　　میں، ورنہ ہر لباس میں ننگِ وجود تھا

معنی ۔ عیوب برہنگی ، برائیوں کا ظاہر ہونا ۔ ننگِ وجود ، ہستی کے لئے باعث شرم

مطلب ۔ فرماتے ہیں جیسا مجھے ہونا چاہیئے تھا ویسا نہ ہو سکا ۔ لہٰذا میری ذات انسانی وجود کے لئے باعثِ شرم تھی ۔ آخرکار مرنے کے بعد میرے کفن نے میری غلط کاریوں کو ڈھانپ دیا ۔ اس طرح داغِ عیوب کی برہنگی کو خفت سے بچا لیا ۔ اس شعر میں انسانی پیدائش کی غرض وغایت کی طرف اشارہ ہے ۔ جیسا کہ اللہ جل شانہٗ فرماتے ہیں ۔

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ (الذاریات ، ۵۰)

ترجمہ ، اور ہم نے چھوٹے بڑے انسانوں کو پیدا صرف عبادت کے لئے کیا ہے ۔

تیشے بغیر مر نہ سکا کوہکن اسدؔ　　سرگشتۂ خمارِ رسوم و قیود تھا

معنی ۔ سرگشتہ ، سرگرداں ۔ خمارِ رسوم و قیود ، رسم ورواج کا پابند

مطلب ۔ فرماتے ہیں ۔ تیشہ بغیر مارے فرہاد اپنے آپ کو ہلاک نہ کر سکا ۔ اس کا عشق اگر کامل ہوتا تو شیریں کی وفات کی خبر سنتے ہی اک آہ بھرتا اور جان دے دیتا ۔ مگر چونکہ رسم ورواج کی قید میں تھا اس لئے تیشہ مارنے کی حاجت ہوئی ۔

غزل ۲

کہتے ہو نہ دیں گے ہم، دل اگر پڑا پایا　　دل کہاں کہ گم کیجئے؟ ہم نے مدعا پایا

مطلب ۔ محبوب کا اندازِ بیان ہی بتاتا ہے کہ دل اس کو مل چکا ہے ۔ " نہ دیں گے ہم، دل اگر پڑا پایا" عاشق کہتا ہے دل ہمارے پاس رہا ہی کہاں کہ ہم اسے گم کریں ۔ ہاں تمہاری بات سے ہمیں پتہ لگ گیا کہ ہمارا دل تمہارے ہی پاس ہے ۔ ہمارا دل تم نے ہی چرایا ہے ۔ اس چوری کے الزام

سے بچنے کی خاطر بہلنے تلاش کرتے ہو۔

عشق سے طبیعت نے زیست کا مزا پایا　　درد کی دوا پائی، دردِ بے دوا پایا

مطلب۔ فرماتے ہیں۔ زندگی کا مزا طبیعت نے عشق کی بدولت پایا ہے۔ بے عشق زندگی اک دردِ لا دوا تھی عشق دوا بن کر آیا لیکن خود عشق ایک دردِ لا دوا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فطرتِ انسانی میں محبت کا نور رکھا ہے تا اس کی مخلوق اُسے پہچان کر اس سے محبت کرے۔ اور اسی عشق حقیقی کی خاطر بہت سے قرینے بنا دیئے۔ ہر انسان عشق و محبت میں مبتلا ہے۔ کسی نے اپنا محبوب کسی حسینہ کو بنایا۔ کسی نے مال و دولت و حشمت کو۔ کسی نے اولاد کو۔ ہر ایک کا کوئی نہ کوئی محبوب ضرور ہے۔

دوست دارِ دشمن ہے! اعتمادِ دل معلوم　　آہ بے اثر دیکھی، نالہ نارسا پایا

معنی۔ دوست دارِ دشمن۔ دشمن کا دوست۔ یہاں دشمن محبوب ہے جو عاشق پر جور و ستم کرتا رہتا ہے۔
مطلب۔ کہتے ہیں ہمیں اب دل پر بھروسہ نہیں رہا چونکہ یہ ظالم محبوب کا دوست بن گیا ہے جس کی وجہ سے اس کی آہ بے اثر ہے اور نالہ بھی اپنا اثر کھو چکا ہے۔ دل کی دشمنی کس انداز سے بیان کی ہے۔

سادگی و پُرکاری، بے خودی و ہشیاری!　　حُسن کو تغافل میں جرأت آزما پایا

معنی۔ سادگی، بھولاپن۔ پُرکاری، چالاکی۔ بے خودی، غفلت
مطلب۔ فرماتے ہیں محبوب بھولے بن کر جرأت کی آزمائش کرتے ہیں۔ دراصل ان کی سادگی چالاکی ہے اور ان کی غفلت نہایت ہوشیاری ہے۔ شعر معنی خیز ہے اور لفظوں کا انتخاب لاجواب ہے۔

غنچہ پھر لگا کھلنے آج ہم نے اپنا دل　　خُوں کیا ہوا دیکھا، گُم کیا ہوا پایا

معنی۔ غنچہ۔ پھول کی کلی۔ گل ناشگفتہ
مطلب۔ موسم خزاں چلا گیا۔ موسم بہار آ گیا۔ چونکہ ہم نے اپنے محبوب کو اپنے سے خوش اور ہنستا ہوا

دیکھا۔ لہٰذا ہمارا دل جو مرجھا گیا تھا۔ مغموم رہتا تھا۔ وہ ہمیں پھر سے مل گیا۔ چونکہ محبوب ہم سے خوش ہے۔ دوسرے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں۔ یار اور زمانہ کے جور و ستم سے ہمارا دل خون ہو کر آنکھوں کے راستہ سے بہہ گیا تھا وہ غنچہ کی صورت میں نمودار ہو گیا۔ لہٰذا ہم نے گمشدہ دل پالیا۔

حالِ دل نہیں معلوم لیکن اس قدر یعنی   ہم نے بارہا ڈھونڈا تم نے بارہا پایا

مطلب۔ عشق۔ بے اختیار شے ہے اس نے ہمارے دل کا قرار چھین لیا ہے۔ ہم دل کے حال سے واقف نہیں ہیں ہاں البتہ اس قدر ہم جانتے ہیں کہ جب تم پاس ہوتے ہو اور اس کی خبر لینا چاہتے ہو تو اس کو قرار ہوتا۔ اور تم اسے پالیتے ہو۔

شورِ پندِ ناصح نے زخم پر نمک چھڑکا   آپ سے کوئی پوچھے تم نے کیا مزا پایا

معنی۔ شورِ پندِ ناصح، ناصح کی پند و نصائح

مطلب۔ فرماتے ہیں ناصح نے پند و نصائح کر کے ہمارے مندمل زخموں کو پھر سے ہرا کر دیا اور ہمارا زخم کھل گیا اور لذتِ زخم سے دوبارہ مستفید ہوئے لیکن ناصح سے جا کر کوئی پوچھے کہ اُسے کیا لطف اور مزا آیا۔

غزل ۴

دلِ مرا سوزِ نہاں سے بے محابا جل گیا   آتشِ خاموش کی مانند گویا جل گیا

معنی۔ سوز، دُکھ، جلن۔ بے محابا۔ بے خوف و خطر، فوراً۔ آتشِ خاموش، وہ آگ جس میں شعلہ نہ ہو اور آہستہ آہستہ سُلگتی رہے۔

مطلب۔ فرماتے ہیں مرا دل سوزِ نہاں سے بے خوف و خطر جل کر راکھ ہو گیا اور اس کے جلنے

کی صورت آتشِ خاموش کی طرح سے تھی۔ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی۔ پہلے مصرعہ میں سوزِ نہاں اور دوسرے میں آتشِ خاموش کمال بلاغت ہے۔

دل میں ذوقِ وصل و یادِ یار تک باقی نہیں — آگ اس گھر کو لگی ایسی کہ جو تھا جل گیا

فرماتے ہیں ناامیدی اس قدر ہے جس کی وجہ سے وصلِ یار کی بھی خواہش مٹ گئی۔ یاد تک نہیں آتی۔ خانۂ دل میں ایسی آگ لگی ہے کہ کچھ چھوڑا ہی نہیں۔ اور جو چیزیں بچائی تھیں وہ بھی جل گئیں۔ حقیقت میں جب ناامیدی حد سے بڑھ جائے تو پھر توقع نہیں رہتی۔

میں عدم سے بھی پرے ہوں ورنہ غافل بارہا — میری آہِ آتشیں سے بالِ عنقا جل گیا

معنی ۔ عدم سے پرے ہونا۔ فنافی اللہ ہونا۔

مطلب ہے کہ میں عدم سے بھی آگے نکل آیا ہوں اور مجھے میرا مقصود مل گیا ہے۔ ہاں البتہ اس راہِ طریقت کی منزلوں میں میری آہِ آتشیں یعنی میری کوششوں سے بالِ عنقا جل گیا ہے۔ مجھے وہ کچھ حاصل ہو گیا ہے جو کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں۔

عرض کیجے جوہرِ اندیشہ کی گرمی کہاں! — کچھ خیال آیا تھا وحشت کا۔ کہ صحرا جل گیا

معنی ۔ جوہرِ اندیشہ، خیالات کا نچوڑ۔ استعارۃً پُر معارف کلام

مطلب ۔ فرماتے ہیں میں اپنا پُر معارف کلام کسے سناؤں۔ یہاں تو فہم رکھنے والوں کا فقدان ہے۔ ہاں جنگل کا سوچا تھا کہ درندوں کو سناؤں لیکن یہ خیال آتے ہی جنگل میں بھی آگ لگ گئی چونکہ میرا کلام پُر معارف ہونے کے علاوہ پُر سوز بھی ہے۔ میرا مرغِ تخیل وہاں پرواز کرتا اور لہریں مارتا ہے جہاں دوسرے پر بھی نہیں مار سکتے۔

دل نہیں تجھ کو دکھاتا ورنہ داغوں کی بہار　　　اس چراغاں کا کروں کیا کارفرما جل گیا

مطلب ۔ میری آرزوئیں اور تمنائیں جل رہی ہیں جس کی وجہ سے یہ چراغاں نظر آ رہا ہے۔ اگر میرے پاس میرا دل ہوتا تو پھر میں اس سے کہیں بہتر تجھے اپنے داغ ہائے حسرت کی بہار دکھاتا۔ مگر افسوس آرزوؤں کے ساتھ میرا کارفرما (یعنی دل) بھی جل گیا۔

میں ہوں اور افسردگی کی آرزو غالبؔ کہ دل　　　دیکھ کر طرزِ تپاکِ اہلِ دنیا جل گیا

مطلب ۔ مَیں تو زندہ دل انسان تھا مگر اب عالم یہ ہے کہ افسردگی کی آرزو نے دل میں جگہ لے لی ہے اور اس کا سبب دُنیا والوں کا سلوک ہے جس نے میرے شگفتہ اور خوش مزاج دل کو بھی جلا ڈالا۔

غزل ۵

شوق، ہر رنگ رقیبِ سروساماں نکلا　　　قیس تصویر کے پردے میں بھی عُریاں نکلا

معنی ۔ ہر رنگ میں، ہر حال میں، عشق و جنون میں ۔
مطلب ۔ فرماتے ہیں شوق خواہ وہ کسی قسم کا بھی ہو جب حد سے گزر جاتا ہے تو بے نیازِ سروسامان ہو جاتا ہے ۔ اس لئے قیس تصویر کے پردے میں بھی عُریاں ہی نظر آتا ہے ۔ چونکہ عشق کا رنگ اس پر پختگی سے چڑھ گیا اور وہ بے نیازِ لباس ہو چکا تھا ۔

زخم نے داد نہ دی تنگیٔ دل کی یارب　　　تیر بھی سینۂ بسمل سے پَر افشاں نکلا

معنی ۔ تنگ دلی، تنگ چشمی ۔ سب رشک کے معنی دیتے ہیں ۔ پَر افشاندن ۔ ترکِ تعلق کردن ہیں ۔
مطلب ۔ یہ ہے کہ رشکِ دل نے سینہ کو بچا لیا ۔ یعنی تیر لگتے ہی دلِ عاشق نے جان دے دی جو کہ

سینہ میں لگا تھا۔ لہٰذا تیر سینۂ بسمل سے گھبرا کر نکل گیا۔ چونکہ دل تو اس رشک میں ہی مر گیا
کہ تیر سینہ میں جا کر کیوں لگا۔

بُوئے گل، نالۂ دل، دُودِ چراغِ محفل　　جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا

مطلب۔ یہ ہے کہ سب تجھ پر عاشق ہو گئے خواہ بوئے گل ہو یا نالۂ دل ہو یا دودِ چراغِ محفل ہو۔
کوئی نہیں جو تجھ پر عاشق نہ ہو گیا ہو اور پریشانیاں اُس کا مقدر نہ بن گئی ہوں۔
دوسرے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ بزم سے مراد دُنیا لی جائے تو مطلب یہ ہے کہ جو بھی یہاں
آیا وہ اس امتحان گاہ میں رہ کر سوائے پریشانیوں کے اور کچھ حاصل نہ کر سکا۔

دلِ حسرت زدہ تھا مائدۂ لذتِ درد　　کام یاروں کا بقدرِ لب و دنداں نکلا

معنی۔ مائدہ، دسترخوان۔ بقدرِ لب و دنداں۔ ہر ایک کی صلاحیت کے مطابق
مطلب۔ میرا دل حسرت زدہ لذتِ درد کا دسترخوان تھا۔ ہر ایک نے اپنی اپنی صلاحیت کے مطابق
اس سے لذت حاصل کی۔ مطلب یہ ہے کہ میرا کلام جو میرے دل کے دسترخوان پر سجا ہوا ہے
لیکن اس سے لطف اندوز ہونے والے اپنی صلاحیت کے مطابق ہی فائدہ اُٹھاتے ہیں۔

تھی نو آموزِ فنا ہمتِ دشوار پسند　　سخت مشکل ہے کہ یہ کام بھی آساں نکلا

معنی۔ نو آموز، طالب علم۔ ہمتِ دشوار پسند، بہت ہمت اور حوصلہ والا۔
مطلب۔ فرماتے ہیں میں ایسا باحوصلہ ہوں کہ تعلیم فنا میری ابتدائی تعلیم تھی۔ میرے لیے جان دینا
کوئی مشکل امر نہیں تھا۔ اب میرے لئے یہی مشکل ہے کہ بڑے سے بڑا کام بھی آسان نظر آتا ہے

دل میں پھر گریہ نے اِک شور اٹھایا غالبؔ　　آہ جو قطرہ نہ نکلا تھا، سو طوفاں نکلا

۔ فرماتے ہیں دل میں دوبارہ گریۂ دل شور کر رہا ہے۔ پہلی بار تو ضبط کر لیا جو قطرہ تھا مگر

شور سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ تو اب طوفان بن چکا ہے جس کا ضبط کرنا میرے بس کی بات نہیں۔

غزل ۶

دھمکی میں مر گیا، جو نہ بابِ نبرد تھا   عشقِ نبرد پیشہ طلبگارِ مرد تھا

معنی۔ بابِ نبرد، جنگ کا ماہر جنگجو۔ عشق نبرد پیشہ، میدانِ عشق میں ہر وقت لڑنے والا

مطلب۔ فرماتے ہیں جو جنگجو نہ تھا (شاید اشارہ فرہاد کی جانب ہے) وہ دھمکی دینے سے ہی مر گیا۔ چونکہ عشقِ نبردِ پیشہ بہادر سپاہی کو چاہتا ہے۔ تا ہمت و عزم کے ساتھ مصائبِ عشق کا مقابلہ کرتا ہے۔ اور وہ عشقِ نبرد بہادر سپاہی ہم ہیں۔ مصائبِ عشق کا مقابلہ کر رہے ہیں۔

تھا زندگی میں مرگ کا کھٹکا لگا ہوا   اُڑنے سے پیشتر بھی مرا رنگ زرد تھا

معنی۔ کھٹکا، خوف۔ رنگ زرد ہونا۔ خوف سے رنگ پیلا پڑ جانا

مطلب۔ فرماتے ہیں مجھے زندگی میں ہمیشہ ہی موت کا خوف رہا۔ اور وہ اس وجہ سے کہ مالکِ حقیقی کے حضور پیش ہونا ہے۔ اسی وجہ سے میرا رنگ زرد رہا۔ اللہ جل شانہٗ فرماتے ہیں۔

موتوا قبل ان تموتوا۔

ترجمہ۔ یعنی موت سے پہلے ہی اپنی نفسانی خواہشات کو مار ڈالو۔

مصرعہ اول میں موت کو یاد رکھنے کی تلقین۔ دوسرے مصرعہ میں بتایا کہ اس پر عمل کرتا رہا ہوں۔ دو مصرعوں میں کس قدر مشکل مضمون ادا کیا ہے۔

تالیفِ نسخہ ہائے وفا کر رہا تھا مَیں   مجموعۂ خیال ابھی فرد فرد تھا

مطلب۔ ابتدا میں ہی وفا سے متعلق میں نے کتابیں لکھنی شروع کر دی تھیں۔ جبکہ ابھی دوسرے تمام امور میں میرے خیالات اکٹھے نہ ہوئے تھے۔ مطلب یہ ہے کہ عاشقی کے تمام امور میں مہارت حاصل کر لی تھی۔

دل تا جگر، کہ ساحلِ دریائے خوں ہے اب　　　اس رہ گزر میں جلوۂ گل، آگے گرد تھا

معنی ۔ جلوۂ گل، خوشی مسرت ۔ رہ گزر، استعارۃً زندگی
مطلب ۔ فرماتے ہیں انقلابِ زمانہ نے وہ ستم ڈھائے ہیں کہ دل سے جگر تک خون کا دریا بہہ رہا ہے یا اس سے قبل یہ حالت تھی کہ جلوۂ گل بھی گرد تھا یعنی اس کی بھی کوئی حیثیت نہ تھی۔

جاتی ہے کوئی، کشمکش اندوہِ عشق کی　　　دل بھی اگر گیا، تو وہی دل کا درد تھا

مطلب ۔ فرماتے ہیں عشق ہونے سے پہلے عشق کرنا چاہتے تھے اور جبکہ اب عشق ہو گیا ہے۔ جس کے نتیجہ میں دل کھو بیٹھے ہیں تو اب دل کے کھونے کا ملال ہے اور عشق میں جور و ستم جھیلنے پڑ رہے ہیں یعنی ہر حال میں اندوہِ عشق کی کشمکش باقی رہتی ہے اور عاشق دل کے درد سے چھٹکارا نہیں پاتا۔

احباب چارہ سازیٔ وحشت نہ کر سکے　　　زنداں میں بھی خیال، بیاباں نورد تھا

مطلب ۔ فرماتے ہیں احباب نے دیوانگی سے بچانے کے لئے قید کر دیا۔ بیڑیاں پہنا دیں مگر میرا علاج نہ کر سکے چونکہ زنداں میں بھی ہمہ وقت میرا خیال عالمِ وحشت میں ہی گشت کرتا رہا۔

یہ لاشِ بے کفن اسدؔ خستہ جاں کی ہے　　　حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا!

معنی ۔ لاشِ بے کفن، بغیر کفن کے، یعنی وہ لاش جس کے تمام عیوب ظاہر ہیں۔ ہر طرح کے زخموں سے پُر ہے۔
مطلب ۔ یہ نعش اس گنہ گار اسدِ خستہ جاں کی ہے۔ جو ہر قسم کی قید سے آزاد تھا۔ اسی وجہ سے مذہب کے احکام پورے نہ کر سکا۔ حق مغفرت کرے دعائیہ کلمات سے دُعا کی تلقین کی ہے۔ اللہ تعالےٰ مرزا غالب کو اپنی رحمت کی چادر میں ڈھانک لے جس نے کروڑہا انسانوں کو اپنے کلام سے معرفت کا درس دیا ہے۔ آمین

غزل ،

شمارِ سبحہ ، مرغوبِ بُتِ مشکل پسند آیا تماشائے بہ یک کف بُردنِ صد دل ، پسند آیا

معنی ۔ شمارِ سبحہ ، تسبیح پڑھنا ۔ بُتِ مشکل پسند ، چالاک ، جس کی طینت میں مشکل پسندی شامل ہے ۔
بہ یک کف بُردن ، ایک ہی جھپٹے میں ۔
مطلب ۔ فرماتے ہیں میرے محبوب کو تسبیح پڑھنا اس لئے پسند آیا تاکہ ایک ہی جھپٹے میں عاشقوں کے
سَو دلوں کو اپنی مٹھی میں لے لے جس طرح کبھی کبھی ساری تسبیح کو ہاتھ میں لے لیتے ہیں ۔
ردیف کے علاوہ سارا شعر فارسی میں ہے ۔

بہ فیضِ بے دلی ، نومیدیِ جاوید آساں ہے کشائش کو ہمارا عقدۂ مشکل پسند آیا

مطلب ۔ فرماتے ہیں بے دلی کے فیض سے ہمیشہ کی نا اُمیدی ہمارے لئے آسان ہو گئی ہے ۔ ہماری کشائش
کو ہمارا عقدۂ مشکل پسند آ گیا ہے ۔ اس وجہ سے ہماری کوششیں ہماری مشکلات کو حل کرنا
نہیں چاہتیں ۔ یہاں بے دلی کے معنی بھی نا اُمیدی کے لئے ، ورکشائش مقصد حاصل ہونا ۔

ہوائے سیرِ گل ، آئینۂ بے مہریِ قاتل کہ اندازِ بخوں غلطیدنِ بسمل پسند آیا

معنی ۔ ہوا ، شوق ۔ انداز بخوں ، خون میں پڑے ہوئے یعنی مُرجھائے ہوئے ۔ غلطیدن بسمل ،
رقصِ بسمل ۔
مطلب ۔ فرماتے ہیں ہمارا قاتل یعنی محبوب باغ میں پھولوں کی سیر کو نہیں جاتا بلکہ اُن پھولوں کو دیکھنے
جاتا ہے جو مر گئے یا مُرجھا گئے ۔ اس سے اُسے فرحت ہوتی ہے ۔ وہ مرے ہوئے ، خون میں
تھڑے پڑے ہوئے رقصِ بسمل کا نظارہ پیش کر رہے ہوتے ہیں ۔ اور یہ ثبوت ہے بے مہری
محبوب کی ہوائے سیرِ گل کا ۔

جراحت تحفہ، الماس ارمغاں، داغِ جگر ہدیہ   مُبارک باد اسدؔ غمخوارِ جانِ دردمند، آیا

معنی ۔ جراحت، چیرنا پھاڑنا، زخم ۔ الماس، ہیرے کی کنی جس سے جراحت ہوتی ہے، ارمغان تحفہ
مطلب ۔ فرماتے ہیں میرا غمخوار میرے محبوب کو میرے لئے سمجھانے گیا تھا مگر وہ خود اس کا عاشق ہو کر
لوٹا ہے اور زخم کا تحفہ ہیرے کا تحفہ داغِ جگر ہدیہ لایا ہے۔ اسدؔ مبارک ہو کہ غمخوار جان دردمند
آگیا یا عشق اسداللہ خان غالبؔ کے پاس زخمِ جگر کا ہدیہ اور ہیرے کی کنی بن کر آیا ہے تاکہ ہر وقت
جراحی کرتا رہے۔ یہ دونوں معنی اس مقطع میں حضرتِ عشق کی عکاسی کر رہے ہیں ۔

غزل ۸

دہر میں نقشِ وفا وجہِ تسلی نہ ہُوا   ہے یہ وہ لفظ کہ شرمندۂ معنی نہ ہُوا

مطلب ۔ فرماتے ہیں وفا کرنے والوں کی دُنیا میں قدر و قیمت نہیں۔ جو وفا کرتے ہیں ان کو اس کا
پورا معاوضہ نہیں ملتا۔ اہلِ جہاں اہلِ وفا سے انصاف کا برتاؤ نہیں کرتے یعنی وفا ایک ایسا لفظ
ہے جس کے کوئی معنی نہیں

سبزۂ خط سے ترا کاکلِ سرکش نہ دبا   یہ زُمرّد بھی حریفِ دمِ افعی نہ ہُوا

معنی ۔ زمرد، سبز رنگ کا پتھر۔ کاکل، زلفیں ۔ سبزۂ خط، داڑھی۔ افعی، زہریلا سانپ
مطلب ۔ فرماتے ہیں تیرا خط نکلنے سے تیری زلفوں کی آب و تاب دلفریبی اور سرکشی میں کوئی فرق نہیں
آیا۔ سبزۂ خط کو زمرّد اور افعی کو کاکُل سے تشبیہ دی ہے ۔

میں نے چاہا تھا کہ اندوہِ وفا سے چھوٹوں   وہ ستمگر مرے مرنے پہ بھی راضی نہ ہُوا

مطلب ۔ فرماتے ہیں مر کر وفا کی تکلیف سے چھٹکارا ہو جاتا مگر میرا محبوب ایسا ستمگر واقع ہوا ہے کہ
مرنے اور جان دے دینے پر بھی راضی نہیں۔ مطلب یہ ہے کہ وہ ہمیں ہمہ وقت تڑپتے آہ و زاری

کرتے ہوئے دیکھنا چاہتا ہے۔ جیسا کہ دوسری جگہ فرماتے ہیں۔ ؎

کہوں کس سے میں کہ کیا ہے، شبِ غم بُری بلا ہے
مجھے کیا بُرا تھا مرنا اگر ایک بار ہوتا

دل گزرگاہِ خیالِ مے و ساغر ہی سہی
گر نفس جادۂ سرمنزلِ تقویٰ نہ ہوا

مطلب۔ فرماتے ہیں کچھ غم نہیں، اگر میرا ضمیر زہد و تقویٰ کی منزلیں طے نہ کر سکا۔ گذرگاہِ جام و شراب تو ہے۔ میری رندی ریاکاری کی پرہیزگاری سے ہزار درجہ بہتر ہے۔

ہُوں ترے وعدہ نہ کرنے پہ بھی راضی کہ کبھی
گوش منت کشِ گلبانگِ تسلّی نہ ہُوا

مطلب۔ فرماتے ہیں کہ تو نے وعدۂ وصل نہیں کیا میں اس پر بھی خوش ہوں۔ اگر میرے کان تسلّی کی آواز سنتے تو ممنونِ احسان ہوتے۔ شرمندۂ احسان تو نہیں ہونا پڑا

کس سے محرومیٔ قسمت کی شکایت کیجئے
ہم نے چاہا تھا کہ مر جائیں، سو وہ بھی نہ ہُوا

مطلب۔ فرماتے ہیں۔ اپنی محرومیٔ قسمت کی شکایت کس سے کریں۔ جو کام بھی کرنا چاہتے ہیں نہیں ہوتا معلوم ہوتا ہے ہماری قسمت کو ہمارے ساتھ ضد ہے حتیٰ کہ مرنا چاہا سو وہ بھی نہ ہوا۔

مر گیا صدمۂ یک جنبشِ لب سے غالبؔ
ناتوانی سے حریفِ دمِ عیسیٰ نہ ہوا

معنی۔ حریف۔ مدِّ مقابل

مطلب۔ فرماتے ہیں کہ جب دمِ عیسیٰ نے زندہ کرنا چاہا۔ تو وہ کچھ کہنے نہ پائے تھے کہ ہماری ناتوانی نے جنبشِ لب پر ہی جان دے دی اور ہمارا کام تمام ہو گیا۔

مرگِ عاشق تو کچھ نہیں لیکن ٭ اک مسیحا نفس کی بات گئی (جگر مراد آبادی)

غزل ۹

ستائش گر ہے زاہد اس قدر جس باغِ رضواں کا وہ اک گلدستہ ہے ہم بیخودوں کے طاقِ نسیاں کا

معنی ۔ستائش گر، مدح کرنے والا۔ باغِ رضواں، باغ جنّت۔ طاقِ نسیاں، جس میں چیزیں رکھ کر بھول جاتے ہیں۔

مطلب ۔ فرماتے ہیں زاہد جس باغِ جنّت کی اس قدر تعریف کر رہا ہے۔ وہ ہم بے خودوں کے طاقِ نسیاں کا گلدستہ ہے۔ مطلب شعر کا یہ ہے کہ ہم بے خودوں کو تو کسی انعام واکرام کا خیال بھی نہیں۔ ہم محبوب کی ذاتی محبت اور اُس کے حسن واحسان پر پہلے ہی فدا ہو چکے ہیں۔

بیاں کیا کیجئے بیدادِ کاوش ہائے مژگاں کا کہ ہر اک قطرۂ خوں دانہ ہے تسبیحِ مرجاں کا

معنی ۔ تسبیحِ مرجاں۔ مونگے کے دانوں سے بنی ہوئی تسبیح

مطلب ۔ فرماتے ہیں، مژگانِ یار کا کیا پوچھتے ہو۔ اُس نے ہمارا دل زخمی کر کے خون میں نہلا دیا۔ ہر بوند لہو کی دانۂ مرجان ہے اور ساری بوندوں نے مل کر تسبیح بنائی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ محبوب کے حسن واحسان کا کیا پوچھتے ہو۔ ہم تو اپنے دل کی دھڑکنوں سے اس کی تسبیح کر رہے ہیں۔

نہ آئی سطوتِ قاتل بھی مانع میرے نالوں کو لیا دانتوں میں جو تنکا، ہوا ریشہ نیستاں کا

معنی ۔ سطوتِ قاتل، محبوب کا رعب۔ نیستاں، بانس کا جنگل (نے) دانتوں میں تنکا لینا۔ اظہارِ عجز وانکسار کرنا۔

مطلب ۔ فرماتے ہیں۔ قاتل کا رعب میرے نالوں کو نہ روک سکا۔ جب میں نے اظہارِ عجز کے لئے دانتوں میں تنکا لیا تو وہ بھی بانسری بن گیا اور نالہ کرنے لگا۔

وہ اگر مل بھی گئے ناقہ تو آخر یہ خوشی مدعا کیہ دبرو اُن کے بیاں ہو جانے گا

دکھاؤں گا تماشا، دی اگر فرصت زمانے نے　　　مرا ہر داغِ دل اک تخم ہے سروِ چراغاں کا

معنی ۔ سروِ چراغاں ۔ سرو کی طرح کا جھاڑ فانوس

مطلب ۔ فرماتے ہیں اگر زمانے کے رنج و آلام نے مہلت دی تو میں تمہیں اپنے دل کے داغوں کی سیر کراؤں گا۔ چونکہ مرا ہر داغِ دل ایک بیج ہے ۔ سروِ چراغاں کا ۔ جو بہت جلد روشن ہو جائے اور اپنی بہار دکھائے گا۔

کیا آئینہ خانے کا وہ نقشہ تیرے جلوے نے　　　کرے جو پرتوِ خورشید عالم شبنمستاں کا

معنی ۔ شبنمستاں ، وہ جگہ جہاں شبنم پڑتی ہے ۔ آئینہ خانہ ، وہ گھر جس کے چاروں طرف آئینے لگے ہوں ۔ جس کو شیش محل بھی کہتے ہیں ۔

مطلب ۔ فرماتے ہیں ۔ اے میرے محبوب تیرے جلوؤں نے آئینہ خانے کا وہ حال کیا ہے جو سورج شبنم کے ساتھ کرتا ہے یعنی اسے پگھلا کر پانی بنا دیتا ہے ۔ یہی ہم اہل درد جو آئینہ خانے کے رہنے والے ہیں ۔ ہمیں پگھلا کر پانی بنا دیا ۔ یعنی ترے حسن واحسان سے پانی پانی ہو گئے ہیں ۔

مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی　　　ہیولیٰ برقِ خرمن کا ہے ، خونِ گرم دہقاں کا

معنی ۔ تعمیر ، پیدائش تخلیق ۔ مضمر ، پوشیدہ ۔ خرابی ، ویرانی ۔ ہیولا ، مادہ ۔ خونِ گرم ، محنتِ شاقہ ۔

مطلب ۔ فرماتے ہیں میرا وجود ہی فنا ہونے والا بنایا گیا ہے ۔ یہ تو گویا دہقان کی محنت شاقہ سے جو خرمن تیار ہوتا ہے وہ ہمیشہ بجلیوں کی زد میں رہتا ہے

اُگا ہے گھر میں ہر سُو سبزہ ، ویرانی تماشا کر　　　مدار اب کھودنے پر گھاس کے ہے میرے درباں کا

مطلب ہے گھر کی ویرانی کا یہ عالم ہے کہ جگہ جگہ خودرَو گھاس اُگ رہی ہے اور میرے دربان کا مشغل

کام اس کی کس کو کھودنے کا ہی رہ گیا ہے ۔

خموشی میں نہاں خوں گشتہ لاکھوں آرزوئیں ہیں چراغِ مُردہ ہوں مَیں بے زباں گورِ غریباں کا

مطلب مرزا غالب فرماتے ہیں میری خاموشی میں لاکھوں ناکام تمنائیں، حسرتیں چھپی ہوئی ہیں گویا کہ میں گورِ غریباں کا بُجھا ہوا چراغ ہوں۔ چراغ کی لَو کو زبان سے تشبیہ دی ہے اور مردہ چراغ سے بے زباں انسانوں کو۔

ہنوز اک پرتوِ نقشِ خیالِ یار باقی ہے دلِ افسُردہ گویا حُجرہ ہے یوسف کے زنداں کا

مطلب ۔ فرماتے ہیں مَیں مٹ گیا۔ دل جَل گیا۔ سب کچھ تباہ و برباد ہو گیا لیکن خیالِ یار کا عکس باقی ہے اور میرا افسردہ دل یوسف کے زنداں والے حجرے جیسا ہو گیا ہے ۔

بغل میں غیر کی آپ آج سوتے ہیں کہیں، ورنہ سبب کیا؟ خواب میں آکر تبسم ہائے پنہاں کا

معنی ۔ تبسم ہائے پنہاں ، ہلکا سا تبسم جو برائے نام ہو۔

مطلب ۔ فرماتے ہیں آپ شاید غیر کے پہلو میں آرام کرتے رہے ہو جبھی میرے خواب میں آکر ہنس رہے ہو۔

نہیں معلوم کس کس کا لہو پانی ہُوا ہو گا! قیامت ہے، سرشک آلودہ ہونا تیری مژگاں کا

مطلب ۔ فرماتے ہیں تیری مژگاں کا آنسوؤں سے تر ہونا قیامت ہے ہزاروں عشاق کا لہو پانی ہو کر بہہ گیا ہو گا ۔ شاید تیری آنکھوں میں آنسو کی ایک یہی وجہ ہو کہ تو اپنے کئے پر پچھتا رہا ہے کہ میں نے کیوں ہزاروں چاہنے والوں کا دل خون کیا ہے ۔

نظر میں ہے ہماری جادۂ راہِ فنا غالبؔ کہ یہ شیرازہ ہے عالَم کے اجزائے پریشاں کا

معنی ۔ نظر میں ہونا ۔ یاد رکھنا ۔ جادہ ، راستہ ۔ راہِ فنا ، فنا ہونے کا راستہ ۔ شیرازہ ، سلسلہ ، انتظام

فرماتے ہیں ، ہم نے موت کی حقیقت کو بھلایا نہیں ہمیں جادۂ راہِ فنا کا خیال ہر وقت رہتا ہے کہ ایک دن ہم نے اس دُنیائے فانی سے گزر جانا ہے نیز ہمیں اس حقیقت کا بھی علم ہے کہ تمام کائنات ایک کتاب کے اوراق کی طرح ہیں جو فنا ہونے کے بعد پھر ایک دوسرے سے منسلک ہو جاتے ہیں۔ ہم نے اس حقیقت کو بھلایا نہیں۔ ہر وقت ہماری نظر میں ہے۔ اللہ اللہ مرزا غالب یہ حقیقت ایک سو پچاس سال پہلے فرما رہے ہیں جبکہ ماہرین فلکیات کو اس کا علم جدید دُوربینوں کے ذریعہ اب معلوم ہوا ہے کہ جتنی دُنیائیں مٹتی ہیں اتنی ہی ان کے ذرّات سے (ملبہ) اور نئی دُنیائیں پیدا ہوتی رہتی ہیں ۔

غزل ۱۰

نہ ہوگا یک بیاباں ماندگی سے ذوق کم میرا ۔ حبابِ موجۂ رفتار ہے نقشِ قدم میرا

معنی ۔ یک بیاباں ماندگی ، بہت تھک جانا ۔ حباب موجہ رفتار ، پانی پر بلبلہ کی رفتار

مطلب ۔ فرماتے ہیں میں کتنا ہی کیوں نہ تھک جاؤں میرا ذوق دشت نوردی کم نہ ہوگا کیونکہ میں بلبلہ کے نقش قدم پر ہوں ۔ بلبلہ موجِ آب پر آگے ہی بڑھتا رہتا ہے ۔

محبت تھی چمن سے لیکن اب یہ بے دماغی ہے ۔ کہ موجِ بوئے گُل سے ناک میں آتا ہے دم میرا

معنی ۔ ناک میں دم آنا ، انتہائی پریشانی کیلئے کہتے ہیں ۔ بے دماغی ، بد دماغی ، نفرت کرنا ۔

مطلب ۔ فرماتے ہیں انقلابِ زمانہ نے مجھے بد دماغ بنا دیا ہے جن چیزوں سے مجھے محبت تھی اب نفرت ہو گئی ہے ۔ ؎ اللہ رے عندلیب کی آوازِ دلخراش ، جی ہی نکل گیا ، جو کہا اس نے ہائے گُل
میر تقی میر

غزل ۱۱

سراپا رہنِ عشق و ناگزیرِ اُلفتِ ہستی ۔ عبادت برق کی کرتا ہوں اور افسوس حاصل کا

معنی ۔ ناگزیر ، جس کا علاج نہ ہو ۔

مطلب ۔ سرتا پا گرفتارِ عشق ہوں ۔ اور اپنی جان بھی عزیز ہے ۔ عاشق کی مثال آتش پرست کی طرح ہے ۔ وہ آگ کی عبادت بھی کرتا اور اسے پوجتا بھی ہے ۔ لیکن اس کی جلانے کی قوت سے خوفزدہ بھی

رہتا ہے۔ عبادت کو الفتِ ہستی، اور برق کو عشق سے تشبیہ دی ہے۔

بقدرِ ظرف ہے، ساقی! خمارِ تشنہ کامی بھی
جو تُو دریائے مے ہے، تو میں خمیازہ ہوں ساحل کا

معنی ۔ ظرف، برتن۔ خمیازہ، بدلہ، مکافات، انگڑائی، رنج، کنارا۔

مطلب ۔ فرماتے ہیں۔ اے ساقی شراب پلانے ہیں اگر تیرا حوصلہ بڑا ہے اور تو دریا دل ہے تو میں بھی دریا کا کنارا ہوں۔ کہ ہر وقت تشنہ کام رہتا ہوں

مطلب یہ ہے کہ انسانی خواہشات کبھی کم نہیں ہوتیں اور کبھی انسان کی فطرت سیر نہیں ہوتی۔ اللہ تعالیٰ کی نعماء کس قدر ہیں لیکن پھر بھی ناشکری کرتے ہوئے مانگتا ہی رہتا ہے۔

غزل ۱۲

محرم نہیں ہے تُو ہی نوا ہائے راز کا
یاں ورنہ جو حجاب ہے، پردہ ہے ساز کا

معنی ۔ محرم نہیں، ناآشنا ہے۔ نواہائے راز، راز کے نغمات

مطلب ۔ فرماتے ہیں۔ تو خود ہی ناآشنا ہے ورنہ جو دنیا میں بظاہر حجاب نظر آتے ہیں وہ پردہ ساز ہیں جو اپنی زبانِ حال سے کائنات کے نغمات گا رہے ہیں اور اپنے خالق کا پتہ دے رہے ہیں۔ دن رات ہر چیز خدا کی تسبیح کر رہی ہے۔ انسان کو چاہیے کہ وہ عرفان حاصل کرے۔

رنگِ شکستہ صبحِ بہارِ نظارہ ہے
یہ وقت ہے شگفتنِ گُلہائے ناز کا

معنی ۔ رنگ شکستہ ہونا۔ رنگ اُڑنا۔ شگفتن، کھلنا

مطلب ۔ فرماتے ہیں میرا اُڑا ہوا رنگ صبح بہار کا نظارا ہے جو میرا محبوب دیکھ رہا ہے اب یہ وقت ہے کہ وہ بھی اپنے ناز و انداز کے پھول کھلائے۔

مطلب یہ بھی ہے کہ جب کسی فرد کی یا کسی قوم کی حالت ابتر ہو جائے تو وہ اللہ تعالیٰ کے

فضل و کرم کی متقاضی ہو جاتی ہے اور زبان حال سے کہہ رہی ہوتی کہ اب تیرا فضل و کرم درکار ہے ۔

تُو اور سُوئے غیر نظر ہائے تیز تیز　　مَیں، اور دُکھ تری مژہ ہائے دراز کا

معنی ۔ مژہ ہائے دراز ، لمبی پلکیں ۔

مطلب ۔ فرماتے ہیں تیرا غیر کو بغور دیکھنا میرے رشک و حسد کا باعث ہو رہا ہے ۔ اندیشہ ہے کہ جس طرح تیری پلکیں میرے دل پر برچھیاں بن کر گری ہیں اور مجھے اپنا صید کر لیا ہے کہیں غیر بھی تیرا عاشق نہ بن جائے ۔

صرفہ ہے ضبطِ آہ میں میرا، وگرنہ مَیں　　طعمہ ہوں ایک ہی نفسِ جاں گداز کا

مطلب ۔ فرماتے ہیں مَیں جو ضبطِ آہ کر رہا ہوں اسی میں میرا فائدہ ہے ورنہ ایک ہی آہ مجھے اپنا لقمہ بنا لے گی اور میرا خاتمہ ہو جائے گا ۔ میری آہ مجھے فنا کر دے گی ۔

ہیں بس کہ جوشِ بادہ سے شیشے اُچھل رہے　　ہر گوشۂ بساط ہے، سرِ شیشہ باز کا

معنی ۔ شیشہ باز ، بوتلوں کو اُچھال کر تماشا کرنے والا ۔

مطلب ۔ فرماتے ہیں موسم بہار آنے کی وجہ سے جوشِ بادہ نظر آ رہا ہے ۔ شیشوں نے اپنی اپنی جگہ اُچھلنا شروع کر دیا ہے ۔

مطلب یہ بھی ہے کہ جب اللہ تعالٰے کے فضل و کرم ہوتے ہیں تو ہر طرف خُوشی اور مسرّت کا منظر پیش کرتے ہیں

کاوش کا دل کرے ہے تقاضا، کہ ہے ہنوز　　ناخن پہ قرض، اُس گرہِ نیم باز کا

مطلب ۔ فرماتے ہیں ہمارا دل ہم سے تقاضا کر رہا ہے کہ محبوب کے بندِ قبا کی گرہ آدھی کھولی تھی اس

لئے ناخن پہ یہ قرض واجب ہے لہٰذا یہ صورت ہے کہ ہم جب ہی سے اپنا دل نوچ رہے ہیں تا ناخن پہ کوئی قرض باقی نہ رہے۔

تاراج کاوشِ غمِ ہجراں ہُوا اسدؔ　　سینہ، کہ تھا دفینہ گہر ہائے راز کا

مطلب۔ فرماتے ہیں غمِ ہجر نے ہمارے دل کو لوٹ کر تاراج کر دیا ہے اور جس قدر رازِ عشق تھے یا رازِ حقیقت ہمارے سینہ سے وہ سب دفینہ لوٹ لیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ہجر کی آہ وزاری سے سب راز افشاء ہو گئے ہیں۔

غزل ۱۳

بزمِ شاہنشاہ میں اشعار کا دفتر کُھلا　　رکھیو یارب! یہ درِ گنجینۂ گوہر کُھلا

معنی۔ گنجینہ۔ خزانہ، دفینہ، کان

مطلب۔ قلعہ معلّیٰ کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ بزمِ شاہنشاہ میں بزمِ سخن کا دور شروع ہو گیا ہے۔ یارب اس درِ گنجینۂ گوہر کو یعنی کانِ گوہر کو تا دیر سلامت رکھیو۔

شب ہُوئی پھر انجمِ رخشندہ کا منظر کُھلا　　اس تکلّف سے کہ گویا بُت کدے کا در کُھلا

معنی۔ رخشندہ۔ چمکتا ہوا۔ انجمِ رخشندہ سے مراد اشعار ہیں۔

مطلب۔ فرماتے ہیں، رات ہو گئی چمکنے والے ستارے جگمگانے شروع ہو گئے اور آسمان پر چمکنے والے ستاروں کا منظر پیش کر رہا ہے، اور یہ مشاعرہ نہایت تکلّف اور اہتمام سے شروع ہوا ہے گویا کہ یہ بت کدہ کُھلا ہے جو غزلیں اور اشعار پڑھے جاتے ہیں ان کو مجسمے اور بتوں سے تشبیہ دی ہے۔ ہر شعر ایک حسین اور خوبصورت بُت کی شکل میں نمودار ہو رہا ہے۔

گرچہ ہُوں دیوانہ، پر کیوں دوست کا کھاؤں فریب آستیں میں دشنہ پنہاں ہاتھ میں نشتر کھُلا

مطلب ۔ فرماتے ہیں گو کہ میں دیوانہ ہوں ۔ پر دوست نما دشمن کو پہچانتا ہوں ۔ میں اُس کے فریب میں نہیں آؤں گا ۔ اُس کی آستین میں چھُری پوشیدہ ہے ۔ گو بظاہر وہ فصد لگانے کے لئے ہاتھ میں نشتر لئے ہوئے ہیں ۔ اِس شعر میں دوست نما دشمنوں کا ذکر کیا ہے جن کی زبان شیریں لیکن دل کینہ سے بھرا ہوتا ہے ۔ ظاہر کچھ اور باطن کچھ ۔

گو نہ سمجھوں اُس کی باتیں، گو نہ پاؤں اُس کا بھید پر یہ کیا کم ہے کہ مجھ سے وہ پری پیکر کھُلا

معنی ۔ یہاں کھُلنے کے معنی بے تکلف ہونے کے ہیں ۔
مطلب ۔ فرماتے ہیں یہ سچ ہے کہ میں اُس کی باتیں نہیں سمجھتا اور نہ اُس کے پوشیدہ بھیدوں کو پا سکتا ہوں ۔ لیکن یہ کیا کم ہے کہ وہ پری پیکر بے تکلف ہو گیا ہے اور یہ میری خوش نصیبی نہیں تو اور کیا ہے ۔

ہے خیالِ حُسن میں حُسنِ عمل کا سا خیال خُلد کا اک در ہے میری گور کے اندر کھُلا

مطلب ۔ فرماتے ہیں میں خیالِ حُسن یار میں ایسا محو ہو گیا ہوں کہ اسی کو اب حسنِ عمل سمجھتا ہوں ۔ اس سے بہتر اور کوئی کام نظر نہیں آتا ۔ محبوبِ حقیقی کے تصوّر اور اُس کی صفات پر غور و فکر کرنا عبادت ہے ۔ اِسی وجہ سے جنّت کی کھڑکی میری قبر میں کھُل گئی ہے ۔ نیز ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلّم کی حدیث ہے کہ جب کوئی نیک خیال ہیں دل میں گزرتا تو اللہ کے نزدیک نیکی شمار کی جاتی ہے اور بدی کا خیال اگر آئے بھی اور اُس پر عمل نہ کیا جائے تو بدی شمار نہیں ہوتی ۔ الحمد للہ

مُنہ نہ کھُلنے پر ہے وہ عالم کہ دیکھا ہی نہیں زُلف سے بڑھ کر نقاب اُس شوخ کے منہ پر کھُلا

مطلب ۔ فرماتے ہیں مُنہ نہ کھُلنے پر وہ عالم ہے کہ اُس محبوبِ حقیقی کے حُسن کا کہ بیان نہیں کیا جا سکتا اور

وہ خود تہاں درنہاں ہے۔ باوجودِ اِس نقاب کے جو ظہورِ تجلیات ہیں اس کو بیان میں نہیں لایا جا سکتا۔ زلف پورے چہرے پر بہت خوبصورت لگتی ہے۔ اسی وجہ سے نقاب اور زلف کی تشبیہ دی ہے۔ الفاظ کا انتخاب نہایت دلفریب ہے جیسے کہ دیکھا ہی نہیں۔
میرے استاد جناب سلیم شاہجہانپوری نے کیسی حسین تصویر کھینچی ہے۔ فرماتے ہیں۔ ؎

آئینہ دارِ جلوۂ فطرت ہے کائنات
کتنی حسیں نقاب ہے رُخ پر پڑی ہوئی

در پہ رہنے کو کہا اور کہہ کے کیسا پھر گیا　　　جتنے عرصہ میں مرا لپٹا ہوا بستر کھلا

مطلب۔ شعر نہایت آسان ہے۔ محبوب کی شوخی اور تلوّن مزاجی کا نقشہ کھینچا ہے۔ اور یہ کہ محبوب کی بدگمانی کی غمازی بھی کرتا ہے۔

کیوں اندھیری ہے شبِ غم؟ ہے بلاؤں کا نزول　　　آج اِدھر کو ہی رہے گا دیدۂ اختر کھلا

مطلب۔ اپنے آپ سے ہی سوال کرتے ہیں پھر خود ہی جواب دیتے ہیں کہ اس اندھیری رات میں بلاؤں کا نزول ہو رہا ہے اسی لئے تمام تارے بھی آسمان کی طرف ہی دیکھ رہے ہیں۔

کیا رہوں غربت میں خوش جب ہو حوادث کا یہ حال　　　نامہ لاتا ہے وطن سے نامہ بر اکثر کھلا

مطلب۔ فرماتے ہیں تکالیف اور مصائب سے بچنے کے لئے وطن کو خیر باد کہا تھا کہ پردیس میں خوشی نصیب ہو گی۔ مگر وائے قسمت یہاں بھی چین نہیں ملتا۔ نامہ بر اکثر خطوط کھلے ہوئے لاتا ہے جن میں اکثر کسی عزیز کی مرگ کی خبر ہوتی ہے۔

اُس کی اُمت میں ہوں میں میرے رہیں کیوں کام بند　　　واسطے جس شہ کے غالبؔ گنبدِ بے در کھلا

مطلب۔ یہ مقطع نعتیہ ہے۔ اس میں معراج کا ذکر کس حُسن و خوبی سے کیا ہے اور ساتھ ہی نبی کریم صلی اللہ

علیہ وسلم کے واسطے اور طفیل سے اپنی مشکلات کے حل ہونے کی طرف اشارہ ہے۔

غزل ۱۴

شب کہ برقِ سوزِ دل سے زہرۂ ابر آب تھا　　　شعلۂ جوّالہ ہر اک حلقۂ گرداب تھا

معنی ۔ زہرہ، پتّا، جوّالہ، لپٹ، شعلہ، گرمی، سوزِ عشق

مطلب ۔ فرماتے ہیں کل رات میرے سوزِ دل کی گرمی سے ابر کا پتّا پھٹ گیا یعنی پانی ہو گیا اور جس سمندر یا دریا میں وہ پانی گرا اس کے بھنور بھی گرمی کی حدّت سے شعلۂ جوالہ بن گئے۔

واں کرم کو عذرِ بارش تھا عناں گیرِ خرام　　　گریہ سے یاں پنبۂ بالش کفِ سیلاب تھا

مطلب ۔ فرماتے ہیں میرے محبوب کو بارش کا بہانہ مل گیا اور اپنا وعدہ پورا نہ کر سکا۔ لیکن اس کے انتظار میں شدتِ گریہ سے ہمارا تکیہ اتنا تر ہوا کہ اُس کی روئی کف سیلاب بن گئی۔

یہاں کرم سے محبوب مُراد لیا ہے۔ (پنبہ ۔ روئی کی گولی ۔ بالش، تکیہ)

واں خود آرائی کو تھا موتی پرونے کا خیال　　　یاں ہجومِ اشک میں تارِ نگہ نایاب تھا

مطلب ۔ فرماتے ہیں وہاں تو ہمارے محبوب کو بناؤ سنگار سے فرصت ہی نہ تھی۔ اور اسی مصروفیت میں وعدہ بھی بھول گئے اور یہاں ہمارا یہ حال تھا کہ اس قدر روئے کہ تارِ نگہ بھی نایاب ہو گیا۔ یعنی نظر دھندلی ہو گئی اور تارِ نظر نے بھی اپنا کام ترک کر دیا۔

جلوۂ گل نے کیا تھا واں چراغاں آبِ جو　　　یاں رواں مژگانِ چشمِ تر سے خونِ ناب تھا

مطلب ۔ فرماتے ہیں واں تو کثرت سے پھول کھلے ہوئے تھے۔ اور اُن کے عکس نہر کے پانی میں چراغاں ہو رہا تھا اور ادھر ہماری یہ حالت تھی کہ ہماری آنکھوں سے خون کا دریا بہہ رہا تھا۔

یاں ہسرِ پُرشور بے خوابی سے تھا دیوار جو　　　　واں وہ فرقِ ناز زیبِ بالشِ کم خواب تھا

مطلب۔ فرماتے ہیں میرا سرِ پُرشور فرقت میں بیتاب تھا۔ اور نیند آتی نہیں تھی۔ اس لئے سرِ پُرشور دیوار ڈھونڈ رہا تھا اور اُدھر ہمارا فرقِ ناز (محبوب) کم خواب کے تکیہ پر سر رکھے آرام کر رہا تھا۔

یاں نفس کرتا تھا روشن شمعِ بزمِ بے خودی　　　　جلوۂ گل واں بساطِ صحبتِ احباب تھا

مطلب۔ فرماتے ہیں یہاں ہماری گرم آہیں ہماری بزم بے خودی کو روشن کر رہی تھیں۔ لیکن بزمِ محبوب میں فرش کے اُوپر پھولوں کا بچھونا تھا یعنی خوشی اور مسرت کے ساتھ ہمارا محبوب اپنے دوستوں کے ساتھ محوِ گفتگو تھا۔

فرش سے تا عرش واں طوفاں تھا موجِ رنگ کا　　　　یاں زمیں سے آسماں تک سوختن کا باب تھا

مطلب۔ فرماتے ہیں۔ وہاں یعنی بزمِ محبوب میں زمین سے آسمان تک خوشی و مسرت کے نغمات لہروں کے رنگ میں اُٹھ کر طوفان برپا کر رہے تھے۔ اور یہاں زمین سے آسمان تک جلانے کے لئے آگ ہی آگ تھی۔

ناگہاں اس رنگ سے خوں نابہ ٹپکانے لگا　　　　دل کہ ذوقِ کاوشِ ناخن سے لذت یاب تھا

مطلب۔ فرماتے ہیں یک لخت میرے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ اسی زمین میں ایک غزل اور کہی جائے جیسا کہ یہ الفاظ بتاتے ہیں کہ ناگہاں اس رنگ سے خون نابہ ٹپکانے لگا۔ وہ دل جو ناخن کی کاوش سے لذت یاب ہو چکا تھا۔

غزل ۱۵

نالۂ دل میں شب، اندازِ اثر نایاب تھا　　　　تھا سپندِ بزمِ وصلِ غیر گو بے تاب تھا

معنی ۔ سپند' کالا دانہ (جس سے بچوں کی نظر بھی اتارتے ہیں)

مطلب ۔ فرماتے ہیں نالۂ دل میں رات اثر مطلق نہ تھا گو کہ نالہ بیتاب تھا۔ بار بار زبان پہ آتا تھا۔
اور نالۂ دل بزمِ غیر کے لئے نظر اتارنے والا کالا دانہ بن گیا تھا کیونکہ وہاں ہمارا معشوق جلوہ افروز تھا۔

مقدمِ سیلاب سے دل کیا نشاط آہنگ ہے　　　　خانۂ عاشق مگر سازِ صدائے آب تھا

معنی ۔ صدائے آب ۔جل ترنگ جو مختلف مقدار پانی کی بہت سی پیالیوں کو بھر کر بجایا جاتا ہے۔

مطلب ۔ فرماتے ہیں سیلاب کی آمد سے میرا دل خوشی محسوس کر رہا ہے۔ شاید (خانۂ عاشق) یعنی
میرا دل سازِ صدائے آب سے ہم آہنگ ہے ۔ مراد یہ ہے تا اور دریا و دل کو راس آگیا ہے ۔

نازشِ ایامِ خاکستر نشینی، کیا کہوں　　　　پہلوئے اندیشہ، وقفِ بسترِ سنجاب تھا

معنی ۔ سنجاب ، پوستین ، کھال کا بنا ہوا کپڑا یا بستر۔ پہلوئے اندیشہ ، سوچ کا انداز

مطلب ۔ فرماتے ہیں ۔جب ہم خاک نشین تھے اُس وقت بھی فخر و ناز ہماری طبع تھی ۔ ہم زمین پر سوتے
تھے تو اُس کو بسترِ پوستین سمجھتے تھے ۔(مسندِ سنجاب) یہ سوچ ہماری قناعت کی شاہکار تھی۔

کچھ نہ کی، اپنے جنونِ نارسا نے، ورنہ یاں　　　　ذرہ ذرہ، روکشِ خورشیدِ عالم تاب تھا

معنی ۔ کچھ نہ کی، کچھ نہ کر سکا۔ جنونِ نارسا ، ناکام رہا۔ جنون ناقص رہا۔

مطلب ۔ فرماتے ہیں ہمارا عشق کامل نہ ہوا۔ ناقص ہی رہا۔ جو کچھ کر سکتا تھا وہ نہ کیا۔ ورنہ دنیا کا تو

ذرہ ذرہ محبوبِ حقیقی کی چہرہ نمائی کے لیے خورشید عالمتاب سے زیادہ روشن اور خوبصورت تھا۔

آج کیوں پروا نہیں اپنے اسیروں کی تجھے؛ کل تلک تیرا بھی دل مہر و وفا کا باب تھا

مطلب۔ فرماتے ہیں آج کیا بات ہے کہ تجھے اپنے عشاق کی پروا نہیں۔ کل تک تو تیرا دل مہر و وفا کا دروازہ بنا ہوا تھا اور تو ہر وقت اپنے عشاق کی خبر گیری کرتا رہتا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ اس شعر میں محبوبِ حقیقی سے خطاب ہو اور مسلمانوں کے عروج و زوال کو پیش نظر رکھ کر کہا گیا ہو۔

یاد کر وہ دن، کہ ہر اک حلقہ تیرے دام کا انتظارِ صید میں اِک دیدۂ بے خواب تھا

مطلب۔ فرماتے ہیں۔ اُن دنوں کو یاد کر کہ تیرے جال کا ہر ایک حلقہ دن رات شکار کے انتظار میں دیدۂ بے خواب کی طرح کھلا رہتا تھا۔ حلقۂ دام کو تشبیہ دیدۂ بے خواب سے دی ہے۔

مَیں نے روکا رات غالبؔ کو، وگرنہ دیکھتے اس کے سیلِ گریہ میں گردوں کفِ سیلاب تھا

مطلب۔ فرماتے ہیں۔ رات میں نے غالبؔ کو رونے اگریہ و آہ وزاری کرنے سے روک رکھا ورنہ اُس کا سیلِ گریہ اتنا بلند ہوتا کہ آسمان کو چھو لیتا اور آسمان اُس کا کفِ سیلاب بن جاتا۔

(مبالغہ آرائی اپنی حدوں کو چھو رہی ہے۔ شارح)

غزل ۱۶

ایک ایک قطرے کا مجھے دینا پڑا حساب خونِ جگر، ودیعتِ مژگانِ یار تھا

مطلب۔ فرماتے ہیں، میرے جگر میں جتنا خون تھا وہ سب مژگانِ یار کی امانت تھا۔ اس لئے مجھے ایک ایک قطرے کا حساب دینا پڑا۔ تمام تو تنبیہ حتیٰ کہ جان بھی یارِ ازل کی امانت ہے اس لئے ان سب کا جائز استعمال ہونا چاہیئے۔ ودیعت یہاں امانت کے معنوں میں استعمال کیا ہے۔

اب مَیں ہوں اور ماتمِ یک شہرِ آرزو		توڑا جو تُو نے آئنہ تمثال دار تھا

معنی ۔ تمثال، پیکر، صورت

مطلب ۔ فرماتے ہیں تونے آئینہ میں اپنا ثانی جو دیکھا تیرے غرورِ حُسن کو گوارا نہ ہوا اور تونے وہیں آئینہ توڑ ڈالا ۔ میں آئینہ میں تیرا حسن دیکھ کر محظوظ ہو رہا تھا ۔ ہائے تونے یہ کیا کیا ۔ میری تمام آرزوئیں خاک میں مل گئیں ۔ اب میرے لئے صرف ماتم ہی رہ گیا ہے کہ اے محبوب تونے میرے آئینہ دل کو توڑ کر میری ہزاروں آرزوؤں کا خون کر دیا

گلیوں میں میری نعش کو کھینچے پھرو کہ میں		جاں دادۂ ہوائے سرِ رہ گزار تھا

مطلب ۔ فرماتے ہیں ، میں نے محبوب کی رہ گذر میں جان دے دی ہے ۔ اس لئے میری نعش کو گلیوں میں گھیسٹتے پھرو یہ ہی میرا انعام ہو گا ۔ (ہو سکتا ہے اس طرح میں کوچۂ یار میں پہنچ کر اپنی مراد پا لوں)

موجِ سرابِ دشتِ وفا کا نہ پُوچھ حال		ہر ذرّہ مثلِ جوہرِ تیغ آب دار تھا

مطلب ۔ فرماتے ہیں دشتِ وفا کا کیا حال پوچھتے ہو وہ تو موجِ سراب ہے ۔ یہاں کا ہر ذرہ موجِ سراب کی مانند دھوکہ دینے والا تیغ آبِ دار کی دھار کے مانند ہے یعنی جو لوگ راہ وفا میں قدم رکھتے ہیں ، انہیں تلوار کی دھار پر چلنا ہوتا ہے ۔

کم جانتے تھے ہم بھی غمِ عشق کو پر اب		دیکھا تو کم ہوئے یہ غمِ روزگار تھا

مطلب ۔ اس غزل میں مطلع ہے نہ مقطع فرماتے ہیں ، ہم اپنی کوتاہ اندیشی کے سبب غمِ عشق کی کچھ حقیقت نہ سمجھتے تھے بلکہ ایک کھیل ایک مشغلہ جانتے تھے ۔ لیکن واسطہ پڑا تو معلوم ہوا کہ غمِ عشق تھوڑا بھی غمِ روزگار سے کہیں زیادہ ہے ۔

غزل ۱۷

بس کہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا　　آدمی کو بھی میسّر نہیں اِنساں ہونا

مطلب ۔ فرماتے ہیں، دُنیا میں آسان سے آسان کام بھی دشوار ہے۔ آدمی بوجہ آدم کی اولاد ہونے کے آدمی کہلاتا اور اُس کو انسان بھی کہا جاتا ہے لیکن حقیقت میں وہ انسان نہیں بنتا جب تک، اپنے خالق کا اُنس اور مخلوق خدا کا اُنس اُس کے دل میں پیدا نہ ہو اور اِن دو اُنسیتوں کی بدولت وہ اُنسان کہلانے کا مستحق بنتا ہے۔

گریہ چاہے ہے خرابی مرے کاشانے کی　　در و دیوار سے ٹپکے ہے بیاباں ہونا

مطلب ۔ رات دن روتے رہنا انجام کار میرے گھر کی تباہی کا باعث بنے گا۔ در و دیوار پر نحوست برس رہی ہے ہر چیز غمگین و اُداس ہے۔ یہ گریہ سیلاب کی صورت بن کر میرے گھر کو بہا لے جائے گا اور میرا گھر کھنڈر بن کر بیاباں کی صورت پیدا کرے گا۔

وائے دیوانگیِ شوق کہ ہر دم مجھ کو　　آپ جانا اُدھر اور آپ ہی حیراں ہونا

معنی ۔ دیوانگی شوق ، کثرتِ شوق ، بیتابیٔ شوق

مطلب ۔ فرماتے ہیں افسوس مجھے بیتابیٔ شوق نے پاگل کر دیا۔ ایسا خود رفتہ ہو گیا ہوں کہ بار بار کوچۂ جاناں کی جانب مشتاقِ جمال ہو کر جاتا ہوں اور باریابی نہ ہونے کی وجہ سے حیران و پریشان ہو جاتا ہوں۔

جلوہ از بس کہ تقاضائے نگہ کرتا ہے　　جوہرِ آئنہ بھی چاہے ہے مژگاں ہونا

معنی ۔ جلوۂ یار یہی چاہتا ہے کہ مجھے دیکھا جائے ، میرا دیدار کیا جائے نیز جوہرِ آئنہ بھی صاف و

شفاف ہونے کے باعث مژگان بن کے عشاق کے دلوں پر برچھیاں برسا رہا ہے۔ آئینہ کو آنکھ سے تشبیہ دی ہے۔

عشرتِ قتل گہِ اہلِ تمنا مت پوچھ   عیدِ نظارہ ہے شمشیر کا عریاں ہونا

مطلب۔ فرماتے ہیں مقتل میں اہلِ تمنا کی خوشی کا حال نہ پوچھ۔ شمشیرِ یار کی عریانی شہادت طلب لوگوں کے لئے عید کا نظارا پیش کر رہی ہے۔ شمشیر کو ہلالِ عید سے تشبیہ دی ہے۔

لے گئے خاک میں ہم داغِ تمنائے نشاط   تو ہو اور آپ بہ صد رنگِ گلستاں ہونا

مطلب۔ فرماتے ہیں کہ ہم تو قبر میں داغِ تمنائے نشاط لے کر جاتے ہیں لیکن مرتے مرتے یہ دعا کرتے ہیں کہ اے محبوب تجھے ہر قسم کی مسرتیں نصیب ہوں اور تیرا آفتاب کبھی گہنانے نہ پائے۔ تیرا باغِ آرزو ابد تک پھولتا پھلتا رہے۔

عشرتِ پارۂ دل، زخمِ تمنا کھانا   لذتِ ریشِ جگر، غرقِ نمکداں ہونا

مطلب۔ فرماتے ہیں دل کے ایک ایک ٹکڑے کا زخمِ تمنا کھانا عاشق کے لئے باعثِ مسرت و شادمانی ہے اور زخمِ جگر کا بھی نمکدان میں ڈوبے رہنا بھی اپنے اندر ایک لذت رکھتا ہے

کی مرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ   ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

مطلب۔ فرماتے ہیں زندگی بھر میرا محبوب جفائیں کرتا رہا۔ لیکن اس کو کبھی پشیمانی نہیں ہوئی لیکن میرے قتل ہوتے ہی اس نے جفا سے توبہ کرلی۔ طنزاً زود پشیماں کہا ہے۔ اگر زندگی میں وہ اپنی جفاؤں پر پشیماں ہو کر آئندہ کے لئے توبہ کر لیتا تو عاشق کو اس کی مراد مل جاتی لیکن بعد قتل اس کی پشیمانی سے عاشق کو کیا فائدہ۔

حیف اس چار گرہ کپڑے کی قسمت غالب   جس کی قسمت میں ہو عاشق کا گریباں ہونا

مطلب۔ فرماتے ہیں عشاق وحشت میں اپنا گریباں چاک کرتے ہیں۔ اور یہ گریباں چار گرہ کپڑا ہی ہوتا

ہے۔ تو اس چارگرہ کپڑے کے حال پر سوائے افسوس کے اور کیا کیا جا سکتا ہے جو ہر وقت
عاشق کی دست درازی کی زد میں رہ کر چیتھڑے چیتھڑے ہو جاتا ہے۔
یہ شعر واقعہ طلب ہے اور وہ اس طرح کہ قمار بازی کے جرم میں مرزا صاحب کو جیل میں ڈال
دیا گیا۔ وہاں اُن کے کپڑے اتنے میلے ہو گئے کہ ان میں جوئیں پڑ گئیں۔ جب قید سے رہا ہوئے تو
گریبان پھاڑ کر میلا کرتہ ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا اُس وقت یہ شعر کہا۔ بعد کی تحقیق سے پتہ چلا کہ یہ
شعر واقعۂ جیل سے پہلے کہا گیا۔

غزل ۱۸

شب خمارِ شوقِ ساقی رستخیز اندازہ تھا تا محیطِ بادہ صُورت خانۂ خمیازہ تھا

معنی۔ رستخیز، ہنگامہ، قیامت۔ خمار، نشہ کے اُتار کو کہتے ہیں۔ رستخیز انداز، قیامت کا منظر
تھا۔ کیفیت تھی۔

مطلب۔ فرماتے ہیں رات ساقی نے شراب پلانے میں تاخیر کی تو ہماری طرح شراب کے برتنوں
نے انگڑائیاں لینی شروع کر دیں (نشہ اترتے وقت انگڑائیاں آتی ہیں) اور شراب کے برتنوں
نے سر اٹھانا شروع کر دیا اور بعث بعد الموت کا منظر پیش کرنے لگے

یک قدم وحشت سے، درسِ دفترِ امکان کھُلا جادہ، اجزائے دو عالم دشت کا شیرازہ تھا

معنی۔ دشت، میدانِ عشق، صحرائے عشق، جادہ، راستہ، رسم، طریقت۔ جادۂ دشتِ دو عالم
دونوں جہان کی کیفیات

مطلب۔ فرماتے ہیں۔ میں نے ابھی وحشت میں ایک ہی قدم اٹھایا تھا کہ دفترِ امکاں کا سبق کھُل کر
میرے سامنے آگیا۔ اور مجھے علم ہو گیا کہ دونوں جہان کی کیفیات کیا ہیں۔

مطلب یہ ہے کہ راہِ عشق میں قدم رکھتے ہی مجھے دُنیا جہان کے نشیب و فراز سے آگاہی ہو گئی

مانعِ وحشت خرامی ہائے لیلیٰ کون ہے   خانۂ مجنونِ صحرا گرد بے دروازہ تھا

۔ فرماتے ہیں۔ اگر یہ سچ ہے کہ لیلیٰ کئی بار مجنوں سے ملنے دشتِ قیس میں گئی اور بغیر ملے
ہوئے واپس آگئی۔ لیلیٰ کو کس نے روکا تھا۔ کون سی وہ روک تھی حالانکہ خانۂ مجنوں میں نہ
دروازہ تھا نہ دربان۔ شاید حُسن لاپروا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر انسان کو بھی اپنے خالق و مالک
سے حقیقی محبت ہو اور وہ اس سے ملنے کا خواہش مند ہو تو اُس کے لیے کوئی روک نہیں ہے۔

پُوچھ مت رسوائیِ اندازِ استغنائے حُسن   دست مرہُونِ حنا، رخسار رہنِ غازہ تھا

مطلب۔ فرماتے ہیں حسنِ معشوق کو آرائشِ جمال سے مستغنی مت خیال کر یہ اُس کے لئے موجب رسوائی
ہوگا۔ دستِ معشوق مہندی کے منّت پذیر ہیں اور رخسارِ معشوق غازہ کے
آرائش جمال کے لئے ہاتھوں کو مہندی کی ضرورت ہے اور رخسار کو تابدار بنانے کے لئے غازہ بھی
ایک ضرورت ہے۔ لیکن حسینانِ عالم کو اس بات کی کوئی پروا نہیں کہ اُن کا حسن و جمال جو
مرہونِ حنا اور محتاجِ غازہ بنے اُن کے لئے کس رسوائی کا باعث بن رہا ہے لوگ انہیں
للچائی ہوئی نظروں سے دیکھ رہے ہیں۔ اور اُن کا سامان آرائش انہیں اپنی طرف کھینچ رہا ہے

نالۂ دل نے دیئے اوراقِ لختِ دل بہ باد   یادگارِ نالہ اک دیوانِ بے شیرازہ تھا

معنی ۔ نالۂ دل۔ دل کی بے اختیار صدا پکار ۔ اوراقِ دل۔ دل کے ٹکڑے یعنی عالی مضامین،
بہ باد، ہوا میں، ہوا میں اُڑا دیئے۔

فرماتے ہیں ۔ میرے دل نے جو بے اختیار عالی مضامین فضائے عالم میں پھیلائے ہیں وہ اصل میں
یادگارِ نالہ ایک دیوانِ بے شیرازہ تھا۔ یعنی ان اوراقِ دل کو یکجا نہیں کیا تھا۔ اور انہیں بھی
ترتیب نہیں دیا تھا۔

غزل ۱۹

دوست غم خواری میں میری سعی فرمائیں گے کیا؛ زخم کے بھرنے تلک ناخن نہ بڑھ آئیں گے کیا؛

مطلب۔ فرماتے ہیں احباب و رشتہ دار میری غم خواری کی کوشش اور کیا مدد کریں گے اگر بالفرض میرے ناخن بھی کاٹ دیئے جن سے دیوانگی میں اپنے زخموں کو نوچتا ہوں۔ تو کیا جب تلک زخم مندمل ہوگا میرے ناخن نہ بڑھ جائیں گے جن سے میں اپنے زخموں کو پھر نوچ ڈالوں گا۔ مطلب یہ ہے کہ اگر ایک مصیبت کے وقت میری مدد کریں گے تو کیا اس سے تمام مصائب ختم ہو جائیں گے۔ بلکہ اس زندگی میں تو نت نئے زخم لگتے رہتے ہیں۔

بے نیازی حد سے گزری بندہ پرور کب تلک ہم کہیں گے حالِ دل اور آپ فرمائیں گے "کیا"؛

مطلب۔ محبوب کو مخاطب کر کے فرماتے ہیں کہ بندہ پرور تمہاری لاپرواہی حد سے گذر گئی۔ ہے کہ ہم کب تک داستانِ غم تم کو سناتے رہیں گے اور آپ انجان بن کر کہتے رہیں گے کہ "کیا کہا؟" اس لفظ "کیا" میں سوال بھی ہے اور حالِ دل کہنے پر خفگی کا اظہار بھی کہا جا سکتا ہے۔

حضرتِ ناصح گر آئیں، دیدہ و دل فرشِ راہ کوئی مجھ کو یہ تو سمجھا دو کہ سمجھائیں گے کیا؛

مطلب۔ فرماتے ہیں کہ اگر حضرت ناصح مجھے نصیحت کرنے کے لئے آنا چاہتے ہیں تو بڑے شوق سے تشریف لائیں۔ لیکن میں جانتا ہوں کہ وہ مجھے جنونِ عشق سے چھٹکارا حاصل کرنے کی تلقین ہی کریں گے جو میرے بس کی بات نہیں اور وہ اپنا سا منہ لے کر واپس جائیں گے۔

آج واں تیغ و کفن باندھے ہوئے جاتا ہوں میں عذر میرے قتل کرنے میں وہ اب لائیں گے کیا؛

معنی۔ کفن سر سے باندھنا، جان دینے کے لئے تیار ہونا۔

مطلب۔ فرماتے ہیں اب ہمارے معشوق کو ہمارے قتل نہ کرنے کا کوئی بہانہ ہاتھ نہیں آئے گا۔ ہم تلوار خود ہی لے کر چلتے ہیں۔ اور کفن بھی ساتھ ہی لے جا رہے ہیں۔ وہ جان لیں گے کہ ہم جان دینے پر راضی ہیں، جب ہی تو کفن بھی ساتھ لائے ہیں۔ محبوب کی بے اعتنائی پر جان سے بیزاری اور اپنی سر فروشی کا اظہار ہے

گر کیا ناصح نے ہم کو قید۔ اچھا! یُوں سہی، یہ جنونِ عشق کے انداز چھُٹ جائیں گے کیا؟

مطلب۔ فرماتے ہیں کہ بالفرض ناصح ہمیں قید بھی کر لے اور دن رات ترکِ عشق کی تلقین بھی کرتا رہے پھر بھی اُسے کوئی کامیابی نہ ہوگی۔ ہمارے انداز جو جنونِ عشق سے پیدا ہو چکے ہیں۔ ویسے کے ویسے ہی رہیں گے۔ ہم عشق و محبت اور محبوب کے متعلق ہی سوچتے رہیں گے خواہ وہ کتنا ہی زور کیوں نہ لگائے۔

خانہ زادِ زُلف ہیں، زنجیر سے بھاگیں گے کیوں؟ ہیں گرفتارِ وفا۔ زنداں سے گھبرائیں گے کیا؟

معنی۔ خانہ زاد۔ مالک کے گھر میں پیدا ہونے والا غلام

مطلب۔ فرماتے ہیں ہم زنجیر سے نہیں ڈرتے ہم تو خانہ زادِ زلف ہیں اور زنداں سے بھی نہیں گھبراتے ہم تو پہلے ہی وفا کے دستور کے قیدی ہیں۔ زنجیر کو زُلف سے اور قیدِ وفا کو زنداں سے تشبیہ دی ہے۔

ہم تو محبوب کی گھونگر والی زُلف کے عاشق بلکہ خانہ زاد غلام ہیں اس لئے اگر ہم کو زنجیروں میں جکڑ دیا جائے تو ہم اس سے آزاد ہونا ہرگز پسند نہ کریں گے۔ اور چونکہ پہلے ہی سے وفاداری کی قید میں پڑے ہوئے ہیں۔ اس لئے زنداں میں ڈال دیئے جائیں تو ہمیں کوئی گھبراہٹ یا پریشانی لاحق نہ ہوگی۔

لذت۔ فیہ قفس بر حقی اسیر عشق را ۞ تنگ بودن در لچہ حلقہ اگر زنجیر کا (شارح)

ہے اب اس معمورہ میں قحطِ غمِ الفت اسدؔ — ہم نے یہ مانا کہ دلی میں رہیں کھائیں گے کیا؟

معنی ۔ معمورہ ، بستی

مطلب ۔ فرماتے ہیں ۔ اب اس بستی میں قحطِ غمِ اُلفت ہے حسینانِ دلی بوجہ انقلاب کے اِدھر اُدھر ہو گئے ہیں ۔ لہٰذا قحطِ غمِ الفت ہے ۔ اور ہم عاشق مزاج واقع ہوئے ہیں ۔ اگر دلی میں رہیں گے تو ہماری غذا جو عشقِ حسیناں ہے وہ کہاں سے آئے گی اور ہم فاقوں سے مر جائیں گے ۔

غزل ۲۰

یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصالِ یار ہوتا — اگر اور جیتے رہتے یہی انتظار ہوتا

مطلب ۔ مرزا صاحب مرتے وقت دل کو تسلی دیتے ہیں کہ ہماری قسمت میں وصالِ یار لکھا ہی نہ تھا ۔ اگر کچھ دن اور بھی جیتے تب بھی انتظار کی گھڑیاں گنتے رہتے ۔ انتظار رہنا دلِ عاشق کے لئے ضروری ہے ۔ ورنہ وہ کیا عشق ہے جس میں وصلِ یار کی امید ہی نہ ہو ۔

ترے وعدے پر جئے ہم ۔ تو یہ جان جھوٹ جانا — کہ خوشی سے مر نہ جاتے اگر اعتبار ہوتا

مطلب ۔ محبوب سے مخاطب ہیں اور اس کی اس غلط فہمی کو دُور کرنا چاہتے ہیں کہ ہمیں اس کے وعدہ کا اعتبار ہوتا اور ہم اس کے ایفا کے انتظار میں زندگی بسر کرتے نہیں بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اگر ہمیں اس کے وعدہ پر اعتبار ہوتا تو خوشی کی شدت کو برداشت نہ کر سکتے اور زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھتے ۔

تری نازکی سے جانا ۔ کہ بندھا تھا عہد بودا — کبھی تُو نہ توڑ سکتا ، اگر استوار ہوتا

مطلب ۔ ہم تو پہلے ہی جانتے تھے کہ تیری نزاکت اُس عہدِ وفا کو برداشت نہ کر سکے گی جو تو نے

باندھا ہے۔ اگر عہد وفا استوار ہوتا تو تو کبھی اُس کو توڑ نہ سکتا۔ یعنی تو نے اپنی نزاکت کا خیال
رکھتے عہد باندھا تھا

کوئی میرے دل سے پُوچھے ترے تیرِ نیم کش کو
یہ خلش کہاں سے ہوتی جو جگر کے پار ہوتا؟

معنی - تیر نیم کش، وہ تیر جس کو مارتے وقت کمان پوری طرح نہ کھینچی جائے۔

مطلب - فرماتے ہیں اِس تیر نیم کش کی خلش کوئی مجھ سے پوچھے کیونکہ اگر بھرپور طریقہ سے چلایا جاتا
تو ہلاک کر ڈالتا۔ اس تیر نیم کش سے جو ہر وقت میٹھا میٹھا درد پیدا ہوتا رہتا ہے وہ کس
طرح پیدا ہوتا۔ یہ مزا نیم جہاں ہے۔ مجھے شکار کرتے ہو تو ایک تیر مژگاں جو جگر کے پار ہوتا
(شارح)

یہ کہاں کی دوستی ہے کہ بنے ہیں دوست ناصح
کوئی چارہ ساز ہوتا۔ کوئی غم گُسار ہوتا

مطلب - فرماتے ہیں یہ کیسی دوستی ہے کہ ترکِ عشق کی تلقین کرتے ہو۔ چاہیئے تو یہ تھا کہ تم میں سے
کوئی محبوب سے ملانے کی کوشش کرتا۔ کوئی غم بٹاتا۔

مطلب یہ ہے کہ دوستی صرف پند و نصائح کا نام نہیں بلکہ بوقتِ مصیبت کوئی چارہ سازی
کرے کوئی غمگساری کرے۔ اسی مضمون کو ایک اور شعر میں یوں بیان کرتے ہیں۔

رگوں میں دوڑنے پھرنے کے ہم نہیں قائل
جب آنکھ ہی سے نہ ٹپکا تو پھر لہو کیا ہے

فرماتے ہیں اور کیا خوب فرماتے ہیں کہ خون تو رگوں میں گردش کرتا ہی رہتا ہے اور یہ اس
کا معمول ہے۔ لیکن جب دل پر چوٹ لگتی ہے تو پھر ہی خون شدتِ غم میں آنکھوں سے
ٹپکنے لگتا ہے جس سے اُس کے کارآمد ہونے کا پتہ چلتا ہے۔

رگِ سنگ سے ٹپکتا وہ لہو کہ پھر نہ تھمتا
جسے غم سمجھ رہے ہو یہ اگر شرار ہوتا

مطلب - فرماتے ہیں تم غم کی کیفیت سے ناواقف ہو۔ یہ شرار نہیں ہے اگر شرار ہوتا تو پتھروں
میں سے خون ٹپکنے لگتا بلکہ غم تو شرر سے کہیں زیادہ طاقت رکھنے والی شے ہے۔ غم کو

برداشت کرنے کی قوت صرف انسان کو ودیعت کی گئی ہے اور اس غم سے غمِ عشق ہی مراد ہے۔ پتھر کو یہ طاقت حاصل نہیں۔

غم اگرچہ جاں گسل ہے، پہ کہاں بچیں کہ دل ہے
غمِ عشق گر نہ ہوتا، غمِ روزگار ہوتا

معنی۔ جاں گسل۔ جان کو گھٹانے والا۔

مطلب۔ فرماتے ہیں ہمیں دل ملا ہے اور دل موردِ آفات اور مخزنِ رنج و آلام ہے۔ دل اور غم دونوں لازم و ملزوم ہیں۔ اگر غمِ عشق نہ ہوتا تو یقیناً غمِ روزگار ہوتا۔

کہوں کس سے میں کہ کیا ہے، شبِ غم بُری بلا ہے
مجھے کیا بُرا تھا مرنا، اگر ایک بار ہوتا

مطلب۔ فرماتے ہیں شبِ غم کی حقیقت کیا بتاؤں۔ کس سے کہوں کس کو سمجھاؤں۔ یہ تو بہت بُری بلا ہے۔ ہزاروں موت اپنے اندر لئے ہوئے۔ ہر گھڑی، ہر سانس موت ہے۔ میرے نزدیک ایک دفعہ جان دینا تو کوئی بڑی بات نہ تھی۔ مگر یہ عشق میں شبِ غم ایک دفعہ نہیں ہزاروں مرتبہ جان لیوا بن جاتی ہے۔

ہوئے مر کے ہم جو رسوا، ہوئے کیوں نہ غرقِ دریا؟
نہ کبھی جنازہ اُٹھتا، نہ کہیں مزار ہوتا

مطلب۔ فرماتے ہیں۔ کہیں غرقِ دریا ہوتے تو قصہ تمام ہو جاتا نہ کسی کو جنازہ اٹھانا پڑتا نہ کسی کو ہمارے مزار پر فاتحہ پڑھنے جانا ہوتا۔ اس قدر رسوائی نہ ہوتی۔ کاش گمنام جگہ پر خاموشی کے ساتھ دریا میں ڈوب کر مر جاتے۔

اُسے کون دیکھ سکتا، کہ یگانہ ہے وہ یکتا
جو دوئی کی بُو بھی ہوتی تو کہیں دوچار ہوتا

مطلب۔ فرماتے ہیں۔ محبوبِ حقیقی کا یکتا ہونا۔ یگانہ ہونا اس بات سے ثابت ہے کہ وہ کبھی کسی سے دوچار نہیں ہوا۔ اور وہ اس لئے کہ اس جیسی کوئی شے نہیں ہے۔ وہ لامحدود کہتی

ہے ہم محدود در محدود ہیں۔ وہ ایک لطیف نور ہے ہم صرف ان چیزوں کو دیکھ سکتے ہیں جن میں کثافت کا عنصر ہو۔ اللہ نور السمٰوات والارض۔

یہ مسائلِ تصوف! یہ ترا بیان غالب ۔ تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

مطلب۔ اس شعر سے متعلق یہ لطیفہ مشہور ہے کہ جس وقت یہ غزل اور مقطع بادشاہ ظفر نے سُنا تو ازراہِ مزاح فرمایا: بھئی ہم تو جب بھی ایسا نہ سمجھتے۔ مرزا صاحب نے عرض کی حضور تو اب بھی ویسا ہی سمجھتے ہیں مگر یہ اس لئے ارشاد ہوا کہ کہیں میں اپنی ولایت پر مغرور نہ ہو جاؤں۔

مطلب اس شعر کا واضح ہے۔ مرزا صاحب نے اظہارِ حقیقت کیا: واقعی جو مضامین شاعری میں مرزا غالب۔ نے بیان کئے ہیں وہ دراصل اسی قابل ہیں کہ وہ ولی خیال کئے جاتے مگر چونکہ ایک عیب تھا جو مانع ولایت تھا اُس کو خود ہی بیان کر دیا۔

غزل ۲۱

ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا ؟ ۔ نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا ؟

معنی ۔ ہوس، شوق، جھوٹا عشق، نشاط، خوشی، مزہ، فرحت

مطلب۔ فرماتے ہیں، انسان کو کام کرنے کی اُمنگیں ہیں۔ خوشی محسوس کرتا ہے۔ یہ سب چہل پہل اس وجہ سے ہے کہ انسان۔ نے مرنا ہے۔ اگر مرنا نہ ہوتا تو کچھ کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ نہ گھر بناتا نہ کھیتی کرتا نہ گرمی سردی سے بچنے کا کوئی انتظام کرتا۔ مرنا نہ ہوتا تو زندگی عزیز نہ ہوتی بلکہ وبالِ جان بن جاتی۔

تجاہل پیشگی سے مُدعا کیا ؟ ۔ کہاں تک اے سراپا ناز کیا کیا ؟

معنی ۔ تجاہل پیشگی ۔ توجہ نہ کرنا۔

مطلب ۔ فرماتے ہیں ۔ مانا کہ تم سراپا ناز ہو ۔ مگر ایسا بھی کیا ناز و ادا کہ عاشق کی بات ہی نہیں سنتے، تجاہلِ عارفانہ سے دل کو جلاتے رہتے ہو ۔

نوازش ہائے بے جا دیکھتا ہوں　　شکایت ہائے رنگیں کا، گِلا کیا ؟

معنی ۔ نوازش ہائے بیجا بے محل بے موقع نوازش ۔ شکایت ہائے رنگین، اس طرح شکایت کرنا جو بھلی لگے ۔

مطلب ۔ فرماتے ہیں رقیب پر تمہاری نوازشیں بے موقع، بے محل اور غیر ضروری ہیں جب ہیں تم سے اچھے اور احسن طریق سے رقیب کی شکایت کرتا ہوں ۔ تو آپ اُلٹا گلہ کرتے ہو ۔ دونوں مصرعوں میں الفاظ کا انتخاب لاجواب ہے

نگاہِ بے محابا چاہتا ہوں　　تغافل ہائے تمکیں آزما کیا ؟

معنی ۔ بے محابا، بے خوف و خطر ۔ تمکیں آزما، زور آزما، طاقت آزما

مطلب ۔ فرماتے ہیں ۔ اے میرے محبوب میری خواہش ہے کہ تم میری طرف بے تکلف بے خوف و خطر دیکھو تاکہ میں لطف اندوز ہوں ۔ مگر آپ تو تغافل سے میرے صبر و استقلال کو آزما رہے ہو ۔

فروغِ شعلۂ خس یک نفس ہے　　ہوس کو پاسِ ناموسِ وفا کیا ؟

مطلب ۔ فرماتے ہیں رقیب کی جھوٹی اور عارضی محبت ہے اس کو شعلۂ خس سمجھو جو دم بھر کے لئے روشن ہو کے نابود ہو جاتا ہے ۔ رقیب بوالہوس ہے اس کو پاسِ ناموس وفا نہیں ہے عشقِ حقیقی اور عشقِ ناقص میں زمین و آسمان کا فرق ہے ۔

نفس موجِ محیطِ بے خودی ہے　　تغافل ہائے ساقی کا گلا کیا ؟

مطلب ۔ فرماتے ہیں ہمارا ہر سانس موجِ بے خودی ہے ۔ ہم مست الست ہیں ۔ اپنے حال میں مطمئن خوش ہیں ۔ نہ ساقی کی ضرورت ہے نہ شراب کی ۔ ہم کیوں ساقی سے تغافل کا گلہ کریں ۔

دماغِ عطرِ پیراہن نہیں ہے　　غمِ آوارگی ہائے صبا کیا ؟

مطلب ۔ فرماتے ہیں ہم تو شرابِ عشق سے مدہوش ہیں ۔ پیراہنِ محبوب کی خوشبو کے لئے دماغ ہی نہیں ہے ۔ بے پروا ہو چکے اور اس بات سے بھی کہ صبا محبوب کی خوشبو لائے ۔ ہمیں تو محبوب سے غرض ہے وہ خود آئے تب بات ہے ۔

دلِ ہر قطرہ ہے سازِ انا البحر　　ہم اس کے ہیں ہمارا پوچھنا کیا ؟

مطلب ۔ ہر قطرہ دریا کا جزو ہوتا ہے ۔ ہمارے دل کا ہر قطرہ بھی یہی صدا دے رہا ہے یعنی انا البحر ۔ پھر ہم اشرف المخلوقات ہیں ۔ ہم بھی اپنے مبدا اور منبع جو کہ خالقِ حقیقی ہے جب ہم اس کی محبت میں فنا فی اللہ کا مقام حاصل کر چکے تو ہماری عظمت کا کیا ٹھکانا ۔

محابا کیا ہے میں ضامن ادھر دیکھ　　شہیدانِ نگہ کا خوں بہا کیا ؟

معنی ۔ محابا کیا ہے ۔ یعنی کوئی خوف نہیں ۔

مطلب ۔ فرماتے ہیں شہیدانِ نگہ کا کوئی خون بہا نہیں ہوتا ۔ تو بے خوف و خطر میری طرف دیکھ اور مجھے اپنی نگہِ ناز سے قتل کر دے ۔ میں ذمہ دار ہوں تجھ سے کوئی باز پرس نہیں کرے گا ۔

سُن ! اے غارت گرِ جنسِ وفا سُن !　　شکستِ شیشۂ دل کی صدا کیا ؟

مطلب ۔ فرماتے ہیں میرے دل کا سرمایہ جنسِ وفا تھی ۔ وہی قیمتِ دل تھی ۔ تو نے اے غارت گر

اس کو توڑ کر ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور دل کی صدا اُس کا نالہ ہے تو اس کو سننا نہیں چاہتا
میں بار بار کہتا ہوں کہ میرے نالے کو سُن ۔

کیا کس نے جگر داری کا دعویٰ شکیبِ خاطرِ عاشق بھلا کیا ؟
معنی ۔ جگر داری ۔ بہادری
مطلب ۔ فرماتے ہیں اے میرے محبوب میں نے جگر داری کا دعویٰ کب کیا ہے ۔ کیوں میرے صبر و
استقلال کو تو ہر وقت آزماتا ہے میں تو تیرے تغافل اور دن رات کے فراق سے تڑپتا ہوں ۔ ہاں دلِ عاشق
کا صبر ہی کیا ہے ۔ تُو تو ایک لمحہ میں اپنے ناز و ادا سے زیر و زبر کر سکتا ہے

یہ، قاتل وعدۂ صبر آزما کیوں ؟ یہ، کافر فتنۂ طاقت رُبا کیا ؟
مطلب ۔ فرماتے ہیں اے میرے محبوب تو مجھ سے صبر آزما وعدہ کیوں کرتا ہے اور آخر اتنا آزمانا
تو کیوں چاہتا ہے ۔ یہ تیرا صبر آزما وعدہ میری ساری قوت مدافعت کو ختم کر دیتا ہے ۔ آخر
تو ایسا کیوں کرتا ہے ۔

بلائے جاں ہے غالبؔ اُس کی ہر بات عبارت کیا، اشارت کیا، ادا کیا
مطلب ۔ اے غالبؔ محبوب کی تو ہر بات ہی امتحان و آزمائش ہے ۔ چاہے وہ عبارت ہو ۔
اشارت ہو یا ادا ہو ۔ اُس کی ہر بات جان لیوا ہے ۔

کرے ہے قتل ناوک میں تری رو دینا
تری طرح کوئی تیغ نگہ کو آب تو دے
غالبؔ

غزل ۲۲

درخورِ قہر و غضب جب کوئی ہم سا نہ ہوا پھر غلط کیا ہے کہ ہم سا کوئی پیدا نہ ہوا

معنی ۔ درخورِ قہر و غضب ۔ سزاوار

مطلب ۔ فرماتے ہیں عشق و محبت کی ذمہ داریاں پوری کرنے اور اس راہ میں جور و ستم سہنے کے قابل ہم ہی تھے ۔ اس لئے ہمارا یہ کہنا کیوں درست نہ ہوگا کہ ہم سا کوئی پیدا نہیں ہوا ۔ مطلب یہ ہے کہ عشق کی ذمہ داریاں مع تمام لوازمات کے انسان ہی اٹھا سکتا تھا ۔ اسی لئے ہمیں ابتلاؤں کی بھٹی میں ڈال کر کندن بنایا گیا ۔

بندگی میں بھی وہ آزادہ و خودبیں ہیں، کہ ہم اُلٹے پھر آئے درِ کعبہ اگر وا نہ ہوا

معنی ۔ خودبیں ، خودداری ۔ خودپسند ، دوسروں کو اپنے سے کمتر خیال کرنا ۔

مطلب ۔ فرماتے ہیں کہ ہم تو عبادت میں بھی اپنی خودداری قائم رکھتے ہیں ۔ اگر خانہ کعبہ کا دروازہ بھی بند پاتے ہیں ۔ تو اسے کھولنے کے لئے کسی کا مرہونِ منت بننا قبول نہیں کرتے ۔

سب کو مقبول ہے دعویٰ تری یکتائی کا روبرو کوئی بُتِ آئینہ سیما نہ ہوا

معنی ۔ یکتائی ، وحدت ۔ بُتِ آئینہ سیما ، صاف روشن پیشانی والا محبوب

مطلب ۔ تیرا ندِ مقابل کوئی نہیں ۔ تیرے مقابل کوئی تیرے جیسی پیشانی والا نہ ہوا ۔ کوئی بندۂ خدا، خواہ وہ ظاہری و باطنی خوبیوں سے کتنا ہی آراستہ و مزین، نہ ہو یکتائی کا دعویٰ نہیں کر سکتا ۔ یکتائی اور کبریائی تو صرف اور صرف ذاتِ احدیت کو سزاوار ہے جس کا سارا زمانہ قائل ہے ۔

تجھی سے ابتدا ہے تو ہی اک دن انتہا ہوگا ٭ صدائے ساز ہوگی اور نہ ساز بے صدا ہوگا (جگر مرادآبادی)

کم نہیں نازشِ ہم نامیٔ چشمِ خوباں تیرا بیمار، بُرا کیا ہے، گر اچھا نہ ہُوا

معنی ۔ چشمِ خوباں۔ نرگسِ بیمار۔ چشمِ بیمار

مطلب ۔ فرماتے ہیں حسینوں کی آنکھ کو نرگسِ بیمار کہہ کر اُس کی نیم خواب آنکھوں کی تعریف کی جاتی ہے ۔ غالب فرماتے ہیں کہ اگر میں بیمار ہی رہوں تو یہ اچھی بات ہے کیونکہ اس طرح حسینوں کی خوبصورت آنکھوں سے ہمنامی کا شرف حاصل ہو جاتا ہے ۔

سینے کا داغ ہے وہ نالہ۔ کہ لب تک نہ گیا خاک کا رزق۔ ہے وہ قطرہ جو دریا نہ ہُوا

مطلب ۔ فرماتے ہیں میرے وہ نالے جو نارسا ہونے کی وجہ سے میرے لب تک نہ آسکے۔ اب وہ سینہ پر داغ بن گئے ہیں۔ جیسے وہ پانی کا قطرہ جو دریا تک نہ پہنچے وہ مٹی میں جذب ہو کر خاک کی خوراک بن جاتا ہے ۔ مطلب یہ ہے کہ حصولِ مقصد اگر نہ ہو تو زندگی ضائع ہو جاتی ہے

نام کا میرے ہے وہ دُکھ، کہ کسی کو نہ ملا کام میں میرے ہے وہ فتنہ کہ برپا نہ ہُوا

مطلب ۔ فرماتے ہیں راہ عشق و محبّت کے تمام مصائب میرے۔ لئے مخصوص ہیں اور ایسے قیامت کے فتنے کسی اور کے لئے برپا کبھی نہیں ہوئے ۔

ہر بُنِ مُو سے دمِ ذکر نہ ٹپکے خُونِ ناب حمزہ کا قصہ ہوا، عشق کا چرچا نہ ہُوا

مطلب ۔ فرماتے ہیں ماجرائے عشق سُنتے وقت اگر ہر سُننے والے کی آنکھ سے خون نہ ٹپکے تو وہ عشق کا چرچا کہلانے کا مستحق نہیں بلکہ قصۂ امیر حمزہ ہے (فرضی قصہ) جو لوگ شوق سے سُنتے ہیں ۔

قطرے میں دجلہ دکھائی نہ دے اور جزو میں کُل　　کھیل لڑکوں کا ہُوا، دیدۂ بینا نہ ہُوا

مطلب۔ فرماتے ہیں کہ عارف تو وہ ہے جو قطرہ میں دریا دیکھے اور جزو میں کُل کا نظارا کرے ورنہ بچوں کا کھیل ہوگا۔ اس کو دیدۂ بینا کس طرح کہہ سکتے ہیں۔

تھی خبر گرم کہ غالب کے اُڑیں گے پُرزے　　دیکھنے ہم بھی گئے تھے، پہ تماشا نہ ہُوا

۔ ہم عصر شعراء نے مشاعرہ ہونے سے پہلے ہی مشہور کر دیا تھا کہ اس مشاعرے میں غالب کو ناکامی اور سُبکی کا سامنا ہوگا۔ فرماتے ہیں ہم بھی وہاں گئے اور حاصلِ مشاعرہ غزل پڑھ کر سارے مشاعرے کو لوٹ لیا اور حاسد منہ دیکھتے رہ گئے۔

غزل ۲۳

اسدؔ ہم وہ جنوں جولاں گدائے بے سر و پا ہیں　　کہ ہے سر پنجۂ مژگانِ آہو پشت خار اپنا

مطلب۔ فرماتے ہیں اے اسدؔ ہم بے سروسامان وحشت کے مارے صحرا میں بھاگ دوڑ رہے ہیں اور ہم اسی جولانیِ جنوں میں ہرنوں کو بھی پیچھے چھوڑ دیا ہے۔ یہاں تک کہ ان کا سر پنجۂ مژگاں ہمارے لئے پشت خار بن گیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ راہِ طریقت میں یہ نام نہاد تیز رفتار صوفیوں اور ریاکاروں سے ہم بہت آگے ہیں۔

غزل ۲۴

پئے نذرِ کرم تحفہ ہے شرمِ نارسائی کا　　بخوں غلطیدۂ صد رنگ دعویٰ پارسائی کا

مطلب۔ فرماتے ہیں میں اپنے گناہوں کے سبب رضائے الٰہی نہ حاصل کر سکا۔ مگر اس کے باوجود خدا نے ہزاروں کرم مجھ پہ کئے۔ اب میں اس کے حضور سوائے شرمِ نارسائی کے اور کون سا تحفہ پیش کروں۔ پھر میں پارسائی کا دعویٰ بھی کرتا ہوں، اور وہ اس لئے کہ بہت سے ناکردہ

گناہوں کی حسرتیں میرے دل ہیں خون ہوگئی ہیں۔ اس مفہوم کا ایک اور بھی شعر ہے۔ فرماتے ہیں

دریائے معاصی تنک آبی سے ہوا خشک
میرا سرِ دامن بھی ابھی تر نہ ہوا تھا

نہ ہو حُسنِ تماشا دوست رسوا بے وفائی کا　　　بہ مُہرِ صد نظر ثابت ہے دعویٰ پارسائی کا

معنی ۔ حسن تماشا دوست ، حُسنِ یار کے مظاہرے جو ذرہ ذرہ میں نظر آتے ہیں ۔
صد نظر ، سینکڑوں نے دیکھا ہے ۔

مطلب ۔ فرماتے ہیں حُسنِ یار ہر رنگ میں اپنا جلوہ دکھا رہا ہے ۔ پھر اس کو بے وفا کیسے کہیں یا بے وفائی کا الزام کیسے لگائیں ۔ دیکھنے والے اُسے ہر زمانہ میں دیکھتے ہیں اور انہوں نے اس بات کی شہادتیں دی ہیں ۔ کہ ہم نے اس کو دیکھا ۔ ان معنوں میں کہ اس کا کلام سُنا ۔ اس کی بتائی ہوئی باتیں پوری ہوئیں ۔ اولیاء اللہ قطب غوث صالحین اور ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء علیہم السلام نے اس کے وجود کی تصدیق کی ہے ۔

زکاتِ حُسن دے اے جلوۂ بینش کہ مہر آسا　　　چراغِ خانۂ درویش ہو کاسہ گدائی کا

معنی ۔ بینش ، نظر ، نگاہ ، بصارت ۔ آسا ، مانند ، مثل

مطلب ۔ اے میرے اللہ (محبوبِ حقیقی) مجھے اپنے حُسن کی زکات دے ۔ تا میرا کاسۂ گدائی روشن ہو کر چراغِ آفتاب کی مانند روشن ہو جائے ۔ مطلب یہ ہے کہ مجھے اپنا عرفان دے کہ میرے دل کو آفتاب کی طرح روشن کر دے ۔

نہ مارا جان کر بے جُرم قاتل تیری گردن پر　　　رہا مانندِ خُونِ بے گنہ حق آشنائی کا

مطلب ۔ فرماتے ہیں تو نے ایک مشتاقِ قتل کو اس لئے نہیں مارا کہ ایک بے گناہ کا ناحق خون تیری گردن پر ہوگا مگر حق آشنائی کا تیری گردن پہ اب بھی باقی ہے ۔

تمنائے زباں محوِ سپاسِ بے زبانی ہے مٹا جس سے تقاضا شکوہ بے دست و پائی کا

معنی۔ سپاس، شکریہ، بے دست و پا ہونا، بے سروسامان ہونا

مطلب۔ فرماتے ہیں۔ میری تمنا تھی کہ میں تجھ سے وہ زبان مانگوں جس سے تیرا قرب حاصل ہو مگر میری زباں تیری حمد میں لگ گئی اور میں نہ مانگ سکا لیکن اس بے زبانی سے یہ فائدہ بھی ہوا کہ شکوہ بے دست و پائی کا تیرے حضور پیش کرنے سے قاصر رہا۔

وہی اِک بات ہے جو یاں نفس واں نکہتِ گُل ہے چمن کا جلوہ باعث ہے مری رنگیں نوائی کا

مطلب۔ فرماتے ہیں میرا کلام اور نکہت گُل ہم معنی ہیں۔ میں چمن کی بہار دیکھ کر رنگین نوائی پہ مجبور ہو جاتا ہوں۔

دہانِ ہر بُتِ پیغارہ جو، زنجیرِ رسوائی عدم تک بے وفا چرچا ہے تیری بے وفائی کا

معنی۔ پیغارہ، طعن، تشنہ۔ زنجیرِ رسوائی، رسوائی کا سلسلہ

مطلب۔ فرماتے ہیں ایک معشوق دوسرے سے اور دوسرا تیسرے سے تیری بے وفائی کی داستان بیان کر رہا اور اب یہ زنجیرِ رسوائی کا چرچا عام ہے۔ مناسب یہی ہے کہ تو اس راستہ پر چلنا چھوڑ دے۔ اور اے بے وفا تیری بے وفائی کا چرچا عدم تک پہنچ گیا ہے

نہ دے نامے کو اتنا طُول غالب مختصر لکھ دے کہ حسرت سنج ہوں عرضِ ستم ہائے جدائی کا

مطلب۔ فرماتے ہیں کیا ضرورت ہے اتنے طویل خط کی مختصر لکھ دے اتنے گلے شکوے کرنے کی کیا ضرورت ہے کہ ستم ہائے جدائی اور آزارِ فراق کرنے کی حسرت دل میں لیے ہوں۔ آؤ اور یہاں آکر مجھ سے خود سن لو۔ یا مجھے بلا کر میری حالت زار دیکھ لو۔

حال دل فگار ہو رخ سے ہی جب عیاں ؛ یوں ختم ہے دل کے تو یہ مرے کوئی [illegible]

غزل ۲۵

گر نہ اندوہِ شبِ فرقت بیاں ہو جائے گا　　بے تکلف داغِ مہ، مُہرِ دہاں ہو جائے گا

معنی ۔ اندوہ، رنج فکر

مطلب ۔ فرماتے ہیں۔ اگر شبِ فرقت کے رنج وغم کی داستان نہ سُنو گے تو میرا ذہن ضبطِ غم سے داغدار ہو جائے گا۔ جیسا کہ چاند کے مُنہ پر داغ ہے اور اُسے سارا زمانہ دیکھتا ہے۔ تمہیں چاہیئے کہ میرا رنج وغم، میرا حال سنو تا کہ رازِ محبت کی زمانے میں تشہیر نہ ہو۔

زہرہ گر ایسا ہی شامِ ہجر میں ہوتا ہے آب　　پرتوِ مہتاب سیلِ خانماں ہو جائے گا

معنی ۔ زہرہ، پِتّا ۔ پرتوِ مہتاب، چاندکی روشنی، چاندنی ۔ سیلِ خانماں، گھر کے لئے سیلاب

مطلب ۔ فرماتے ہیں۔ اگر شامِ ہجر کی سختیاں مجھ پر اسی طرح سے ہوتی رہیں اور میرا پِتّا پانی بنتا رہا تو نتیجہ یہ ہوگا کہ چاندنی سیلابِ آب بن کر میرے گھر کو تباہ کردے گی۔ مطلب یہ ہے کہ وہ گھر جس میں میرا دل ہے (یعنی جسم) اور میں سب تباہ ہو جائیں۔

دل کو ہم صرفِ وفا سمجھے تھے کیا معلوم تھا　　یعنی یہ پہلے ہی نذرِ امتحاں ہو جائے گا

مطلب ۔ فرماتے ہیں کہ ہم یہ خیال کرتے تھے کہ دل ہمارا زندگی بھر ساتھ دے گا اور ہم اس کو وفاداری کے کاموں میں لگاتے رہیں گے۔ مگر افسوس ایسا نہ ہوا۔ یہ دل تو پہلے ہی نذرِ امتحاں ہو گیا۔ اور ایک ہی نگاہِ یار میں اس کا کام تمام ہو گیا۔

سب تو لوں سوتے میں اُسکے پاؤں کا بوسہ مگر　　ایسی باتوں سے وہ کافر بدگماں ہو جائے گا

مطلب ۔ فرماتے ہیں جوشِ محبت تقاضہ کرتا ہے کہ جب میرا معشوق سویا ہوا ہو تو میں اس کے پاؤں

کا بوسہ لے لوں مگر یہ خیال آتا ہے کہ کہیں وہ مجھے بوالہوس نہ سمجھ بیٹھے۔

رب کے دل میں ہے جگہ تیری، جو تو راضی ہُوا
مجھ پہ گویا اک زمانہ مہرباں ہو جائے گا

مطلب۔ فرماتے ہیں۔ ایک عالم تیرا گرویدہ ہے، تجھ سے محبت کرتا ہے اگر تو ہم سے راضی ہو جائے تو سارا زمانہ ہم پر مہربان ہو جائے گا۔ چونکہ پیاروں کے پیارے ہوتے ہیں۔ بہت بلیغ اعلیٰ شعر ہے۔ اس کا اصل لطف تو اہلِ تصوف ہی اُٹھا سکتے ہیں۔ اس قبیل کا ایک شعر استادی المحترم حضرت سلیم شاہجہانپوری کا بھی ہے۔ ملاحظہ ہو۔ ؎

وہ میرا ہے "مجھے" اتنا" بہت ہے
مجھے تو بس مرا مولا بہت ہے

گر نگاہِ گرم فرماتی رہی تعلیمِ ضبط
شعلہ خس میں جیسے خوں رگ میں نہاں ہو جائے گا

مطلب۔ فرماتے ہیں تیری نگاہ قہر و غضب اگر یہی کہتی رہی کہ ضبط کرتے رہو۔ تاکہ میری رسوائی نہ ہو۔ تیرا یہ کہنا اس بات کے مترادف ہے کہ شعلہ خس کو نہ جلائے اور خون جو رگوں میں پھر کر تمام احساسات کا باعث بنتا ہے وہ بھی اپنا کام چھوڑ دے۔

باغ میں مجھ کو نہ لے جا، ورنہ میرے حال پر
ہر گلِ تر ایک چشمِ خوں فشاں ہو جائے گا

مطلب۔ فرماتے ہیں، غمِ عشق سے میری حالت بہت خراب ہو چکی ہے۔ جو بھی مجھے دیکھتا ہے وہ خون کے آنسو روتا ہے۔ لہٰذا بہتر یہی ہے کہ تو اکیلا ہی باغ میں جا تاکہ تیری سیر نہ خراب ہو میرے جانے پر تو چمن چمن نہیں رہے گا۔ ویران ہو جائے گا۔ ہر گلِ تر خون کے آنسو رو رہا ہوگا۔ اس طرح تیری سیرِ باغ بجائے طرب و انبساط بے لطف منغص ہو جائے گی۔ ؎

پھول اگر اس کی رضا کے رات دن چنتے رہیں ؛ ایک دن دامن ہمارا گلستاں ہو جائے گا

شارح

وائے گر میرا ترا انصاف محشر میں نہ ہو — اب تلک تو یہ توقع ہے کہ واں ہو جائے گا

مطلب۔ فرماتے ہیں ظلم و ستم اس امید پر سہہ رہا ہوں کہ آخر محشر میں میرا ترا انصاف ہو جائے گا اور مجھے مظلومی کی داد اور صلہ مل جائے گا۔ اگر خدانخواستہ وہاں بھی انصاف نہ ہوا تو مجھ پر تو قیامت گذر جائے گی۔

فائدہ کیا؛ سوچ، آخر تو بھی دانا ہے اسدؔ — دوستی ناداں کی ہے، جی کا زیاں ہو جائے گا

مطلب۔ فرماتے ہیں اے اسدؔ تو بھی تو عقلمند ہے سوچ سمجھ سے کام لے۔ نادان کی دوستی فائدہ کی بجائے نقصان کا موجب ہو گی۔ مثل مشہور ہے نادان کی دوستی جی کا زیاں ہوتا ہے۔

غزل ۲۶

دردِ منت کشِ دوا نہ ہُوا — میں نہ اچھا ہُوا، بُرا نہ ہُوا

مطلب۔ فرماتے ہیں میرا دردِ عشق دوا سے اچھا نہ ہوا۔ اور یہ میرے لئے کوئی بُری بات نہیں ہوئی۔ اگر اچھا ہو جاتا۔ تو میرا درد بارِ منت سے دبا رہتا۔ اچھا ہُوا کسی کا احسان نہ اٹھانا پڑا۔ ۔ بیمارِ محبت کو صحت سے غرض کیا تھی :: اچھا جو کیا تُو نے اچھا نہ کیا تُو نے

جمع کرتے ہو کیوں رقیبوں کو؟ — اِک تماشا ہُوا گِلا نہ ہُوا

مطلب۔ فرماتے ہیں کوئی لڑائی جھگڑا نہیں صرف گلہ ہے۔ تم رقیبوں کو اکٹھا کر کے اُن کے سامنے ہماری کرکری کیوں کرتے ہو۔ لہٰذا گلہ شکوہ کو تماشا نہ بناؤ۔

ہم کہاں قسمت آزمانے جائیں؟ تُو ہی جب خنجر آزما نہ ہُوا

مطلب۔ فرماتے ہیں۔ محبوب سے مخاطب ہیں اور کہتے ہیں کہ اے محبوب تو ہم پر خنجر آزمائی سے گریز کرتا ہے۔ وہ کون ہے جس کے پاس ہم جائیں اور ہماری آرزوئے قتل پوری ہو۔

کتنے شیریں ہیں تیرے لب! کہ رقیب گالیاں کھا کے بے مزا نہ ہُوا

مطلب۔ فرماتے ہیں میرا محبوب جب میرے بوالہوس رقیب کی دست درازیوں پر اُسے گالیاں دیتا ہے تو وہ بُرا نہیں مانتا کیونکہ محبوب کے شیریں اور خوبصورت لبوں سے نکلی ہوئی گالی بھی اُسے بھلی معلوم ہوتی ہے۔

ہے خبر گرم اُن کے آنے کی آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا

مطلب۔ اللہ اللہ ایک طرف ذوقِ مہمانی ہے اور دوسری طرف بے سروسامانی کا یہ حال ہے کہ عاشق کے گھر میں بوریا جیسی معمولی چیز بھی نہیں۔ اس موقع پر حالی کے ایک شعر کی پیروڈی بھی ملاحظہ ہو۔

اُن کو حالی بھی بلاتے ہیں گھر اپنے مہماں:
دیکھئے آپ کی اور آپ کے گھر کی صورت

کیا وہ نمرود کی خدائی تھی؟ بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا

مطلب۔ فرماتے ہیں تیری خدائی میں تیری بندگی کرتا رہا مجھ میرا بھلا کیوں نہ ہوا؟ نمرود تو خدا نہیں تھا نہ وہ کسی کا بھلا کب کر سکتا تھا۔ مگر میرے محبوب تُو تو سب کچھ کر سکتا ہے؛ اسی لئے تجھ سے شکوہ کر رہا ہوں۔ نوٹ یہاں بندگی کے معنی عبادت نہیں بلکہ عبودیت سمجھنے چاہئیں۔

ہم کسی اور در پہ جاتے کیوں : کیا درِ یار سے بھلا نہ ہوا (شارح)

جان دی، دی ہوئی اُسی کی تھی　　حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

مطلب ۔ فرماتے ہیں اگر ہم نے اپنی جان اُس کی راہ میں دے دی تو اس میں ہمارا کوئی کمال نہیں ۔ مالک کی چیز مالک کو لوٹا دی۔ لہٰذا اس کے دینے کا احسان باقی رہا۔ اور ہم سے حق ادا نہ ہوا۔ بہت سادہ اور پُر معنی شعر ہے ۔

زخم گر دب گیا، لہو نہ تھما　　کام گر رک گیا روا نہ ہوا

مطلب ۔ لب زخم سینے سے زخم دب جاتا ہے مگر خون اندر بہتا رہتا تھا۔ اسی اصول کے مطابق ہمارا کام جو رک گیا ہے اندر ہی اندر چوڑا ہو کر روا ہو جاتا۔ مگر افسوس صد افسوس ایسا نہ ہوا۔

رہزنی ہے، کہ دل ستانی ہے؟　　لے کے دل، دل ستاں روانہ ہوا

مطلب ۔ فرماتے ہیں لب سڑک ہمارا دل ہم سے چھین کر ظالم بھاگ گیا کوئی پتہ نشان نہیں ۔ کہاں جائیں کیسے اُسے ڈھونڈیں۔ اصل میں تو وہ دلستاں نہ تھا بلکہ ایک رہزن تھا۔

کچھ تو پڑھئے کہ لوگ کہتے ہیں　　آج غالبؔ غزل سرا نہ ہوا

مطلب ۔ سنا جاتا ہے کہ ایک مشاعرہ کسی شہزادے کے گھر ہوا جس میں مصرعہ طرح میں غزل پڑھنی تھی اور مرزا غالبؔ نے کسی وجہ سے غزل طرح میں کوئی نہیں کہی تھی۔ نہایت اصرار پر غیر طرح غزل پڑھ کر اس میں مندرجہ بالا مقطع لگا دیا۔

اب بھی آتا ہے وہ تصور میں　　ختم یادوں کا سلسلہ نہ ہوا

(شارح)

غزل ۲۷

گلہ ہے شوق کو دل میں بھی تنگیٔ جا کا گُہر میں محو ہُوا اضطراب دریا کا

معنی ۔ اضطراب دریا، دریا کی روانی، دریا کا طوفان ۔

مطلب ۔ شوق کو تنگیٔ جا کا گلہ دل میں بھی ہے جس میں زمین و آسمان سما جاتے ہیں اور پھر بھی جگہ رہتی ہے۔ باوجود اس کے شوق کو جگہ کی تنگی کا گلہ ہے۔ تعجب ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ شوق کی وسعت بھی دل کی وسعت سے کم نہیں جیسے) تو گہر میں دریا کی روانی کا کوئی اثر نہیں ہوتا ۔

یہ جانتا ہوں کہ تُو اور پاسخِ مکتوب مگر ستم زدہ ہُوں ذوقِ خامہ فرسا کا

معنی ۔ پاسخ، جواب ۔ پاسخِ مکتوب، خط کا جواب

مطلب ۔ فرماتے ہیں ۔ یہ میں خوب جانتا ہوں کہ تو میرے کسی خط کا کبھی جواب نہیں دے گا۔ لیکن میں خط لکھے جاتا ہوں کیونکہ میں مجبور ہوں۔ ذوقِ خامہ فرسائی مجھ کو خط لکھنے پر مجبور کرتا ہے ۔

حنائے پائے خزاں ہے بہار اگر ہے یہی دوامِ کُلفتِ خاطر ہے عیشِ دُنیا کا

مطلب ۔ فرماتے ہیں، بہار خزاں کے پاؤں کا رنگ ہے۔ اگر اتنی قلیل ہے جیسے مہندی کا تھوڑے دنوں میں رنگ اُڑ جاتا ہے تو پھر بہار ہی کیا ہے۔ یعنی دوامِ کلفتِ خاطر کو ہے اور عیش دنیا کا بہت قلیل۔

دنیا کے عیش کو دوام نہیں ۔ اس لئے ہم ہمیشہ کبیدہ خاطر رہتے ہیں۔ دُنیا کے عیش کی مثال تو ایسی ہے جیسے کوئی خزاں کے پاؤں میں مہندی لگا دی جائے جو چند ہی دنوں میں اُڑ جائے اور پاؤں کی خوبصورتی میں فرق آجائے ۔

غمِ فراق میں تکلیفِ سیرِ گُل مت دو مجھے دماغ نہیں خندہ ہائے بیجا کا

مطلب ۔ فرماتے ہیں۔ مجھے سیر باغ کی تکلیف کیوں دیتے ہو۔ میں تو مبتلائے غمِ فراق ہوں ۔ رنج وغم کی حالت میں پھولوں کا ہنسنا اچھا نہیں لگتا۔

ہنوز محرمیٔ حُسن کو ترستا ہوں کرے ہے ہر بُنِ مو کام چشمِ بینا کا

مطلب ۔ فرماتے ہیں کہ ابھی تک حسن کا پورا عرفان حاصل نہیں ہوا۔ حالانکہ میرا رونگٹا رونگٹا چشمِ بینا بنا ہوا ہے ۔ ذرہ ذرہ میں یارِ مطلق کی تجلیاں ہیں ۔ رات دن مشاہدہ کر رہا ہوں مگر پھر بھی تشنۂ معرفت ہوں ۔

دل اُس کو پہلے ہی ناز و ادا سے دے بیٹھے ہمیں دماغ کہاں حُسن کے تقاضا کا

مطلب ۔ فرماتے ہیں ۔ محبوب کے ناز و ادا ابھی دیکھے نہیں تھے کہ ہم نے اپنا دل اس کی نذر کر دیا۔ ہمیں یہ اچھا نہیں لگتا کہ وہ تقاضا کرتا تب اُس کو دل دیتے ہم عاشق مزاج ہیں حسن کو دُور سے پہچان لیتے ہیں ۔

نہ کہہ کہ گریہ بہ مقدارِ حسرتِ دل ہے مری نگاہ میں ہے جمع و خرچ دریا کا

مطلب ۔ فرماتے ہیں ۔ اے مرے محبوب یہ نہ کہہ کہ میرا گریہ وزاری میری حسرتِ دل کے مطابق ہے نہیں نہیں یہ بات نہیں ہے ۔ ہمیں دریا کا جمع خرچ معلوم ہے ۔ جتنا گریہ تو نے دیکھا ہے۔ اس سے کہیں زیادہ میرے دل میں بھرا پڑا ہے ۔

فلک کو دیکھ کے کرتا ہُوں اُس کو یاد اسدؔ جفا میں اُس کی ہے اندازِ کارفرما کا

مطلب ۔ فلک کو دیکھ کر مجھے خدا یاد آتا ہے ۔ اس لئے کہ جو کچھ مجھ پہ ظلم و ستم ہوتے ہیں ۔ وہ اُسی کے حکم سے ہی ہوتے ہیں ۔ بغیر اس کے حکم کے تو پتہ بھی نہیں ہلتا ۔

ایک دوسری جگہ فرماتے ہیں ؎

چرخ کو کب یہ سلیقہ ہے ستم گاری میں
کوئی معشوق ہے اس پردۂ زنگاری میں

غزل ۲۸

قطرۂ مے بس کہ حیرت سے نفس پرور ہوا — خطِ جام مے سراسر رشتۂ گوہر ہوا

مطلب ۔ بادۂ عرفاں کا ایک قطرہ حیرت خیز نفس پرور ہے جسے یہ نصیب ہو جائے سمجھو کہ وہ گوہر بن گیا۔ خطِ جام رشتۂ گوہر کی مانند ہو گیا۔

اعتبارِ عشق کی خانہ خرابی دیکھنا — غیر نے کی آہ لیکن، وہ خفا مجھ پر ہوا

مطلب ، فرماتے ہیں میرے معشوق کو میرے عشق کے صادق ہونے کا یقین آگیا ہے اور وہ اس حد تک کہ اگر غیر بھی آہ و فغاں کرتا ہے تو وہ سمجھتا ہے کہ میں نے ہی کی ہے اور خوف بدنامی اور رسوائی سے مجھ پر خفا ہوتا ہے ۔

غزل ۲۹

جب بہ تقریبِ سفر یار نے محمل باندھا — تپشِ شوق نے ہر ذرے پہ اک دل باندھا

مطلب ۔ فرماتے ہیں جب ہمارے یار نے سفر کے لئے اونٹنی پر محمل باندھا۔ تو ہماری تپشِ عشق نے ہر ذرہ خاک کے اوپر دل باندھ دیا۔ مطلب یہ کہ دوست کو رخصت کرتے وقت ہمارے شوق نے چاہا کہ کاش ہم بھی ساتھ ہوتے ۔

اہلِ بینش نے بہ حیرت کدۂ شوخیِ ناز　　جوہرِ آئینہ کو طوطیِ بسمل باندھا

معنی۔ اہلِ بینش، دیکھنے والے، اہلِ تماشا۔ جوہرِ آئینہ۔ فولادی آئینہ میں جو سبز رنگ ہوتا ہے جس کو طوطی بھی کہتے ہیں۔

مطلب۔ فرماتے ہیں کہ جب ہمارا معشوق بناؤ سنگھار میں مشغول ہوتا ہے تو لوگ اِدھر اُدھر کھڑے ہوئے حیرت سے دیکھ رہے ہوتے ہیں تو جوہرِ آئینہ کی لہریں اِدھر اُدھر آتی جاتی نظر آتی ہیں۔ اُس کی وجہ یہ ہے کہ یار کی شوخی و ناز نے طوطی کو بسمل کر دیا ہے۔

یاس و اُمید نے اِک عربدہ میداں مانگا　　عجزِ ہمت نے طلسمِ دلِ سائل باندھا

معنی۔ عربدہ۔ لڑائی جھگڑا۔

مطلب۔ یاس و اُمید نے باہم لڑنے کے لئے میدانِ جنگ لیا کبھی یاس کا غلبہ ہوتا ہے اور کبھی اُمید کا عجزِ ہمت۔ نے بھی ایک طلسم دلِ سائل بنا لیا ہے جب صاف جواب مل جاتا ہے تو یہ طلسم ٹوٹ جاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جو شخص ہمت سے کام نہیں لیتا وہ سائل ہو کر یاس و اُمید کے عذاب میں مبتلا رہتا ہے۔

نہ بندھے تشنگیٔ ذوق کے مضموں غالبؔ　　گرچہ دل کھول کے دریا کو بھی ساحل باندھا

معنی۔ تشنگی، پیاس، دل کھول کے کام کرنا، زیادہ سے زیادہ کرنا۔ ساحل، تشنہ لب

مطلب۔ فرماتے ہیں ذوقِ سخن کے مضمون میں جو کچھ باندھنا چاہتے تھے وہ نہ باندھ سکے حالانکہ ہم نے مبالغہ آمیزی میں دریا کو بھی تشنہ لب ہی کہا ہے۔
مطلب یہ ہے کہ طبیعت سیر نہ ہوئی۔ ابھی بہت کچھ کہنے کو تھا۔

غزل ۳۰

مَیں، اور بزم مے سے یُوں تشنہ کام آؤں! گر مَیں نے کی تھی توبہ، ساقی کو کیا ہُوا تھا!

معنی۔ تشنہ کام۔ پیاسا

مطلب۔ فرماتے ہیں اگر میں نے توبہ کی ہوئی تھی تو ساقی نے ہیں، اصرار کر کے کیوں نہ مے پلا دی اس نے تو توبہ نہیں کی ہوئی تھی۔ میں اس کی بزم سے پیاسا ہی واپس آیا۔

ہے ایک تیر جس میں، دونوں چھِدے پڑے ہیں وہ دن گئے، کہ اپنا دل سے جگر جُدا تھا

مطلب۔ فرماتے ہیں نہ دل کو قرار ہے نہ جگر کو چین ہے۔ دونوں کو تیرے تیر نظر نے گھائل کیا ہوا ہے۔ وہ دن چلے گئے جب عشق ایک کھیل ایک دل لگی تھا۔ دل اپنی جگہ تھا جگر اپنی جگہ

دل سے تیری نگاہ جگر تک اُتر گئی

دونوں کو اک ادا میں رضامند کر گئی

درماندگی میں غالبؔ کچھ بن پڑے تو جانوں جب رشتہ بے گرہ تھا، ناخن گرہ کشا تھا

معنی۔ درماندگی، مجبوری، عاجزی۔ مصیبت، تکلیف، رشتہ، دھاگا۔

مطلب۔ فرماتے ہیں جب مصائب و آلام برداشت کرنے کی طاقت رکھتے تھے تب مصیبتیں تکلیفیں نہ آئیں اب جبکہ قویٰ مضمحل ہو گئے ساری مصیبتیں آگئی ہیں۔ یہ مثال رشتہ بے گرہ اور ناخن گرہ کشا تھا خوب واضح ہے۔ بوقت مجبوری کچھ کر کے دکھاؤ تب تمہیں مان لیں گے۔

غزل ۳۱

گھر ہمارا جو نہ روتے بھی تو ویراں ہوتا ۔۔۔ بحر اگر بحر نہ ہوتا، تو بیاباں ہوتا

مطلب ۔ فرماتے ہیں ہمارے گھر کی قسمت میں ویرانی قسامِ ازل نے لکھ دی تھی۔ لوگ ہمیں رونے دھونے پہ خواہ مخواہ ملزم ٹھہراتے ہیں۔ دیکھو اگر بحر نہ ہوتا تو پھر بیابان ہی ہوتا تھا۔ بدنصیبی نے اپنا کام ضرور کرنا تھا۔

تنگیٔ دل کا گلہ کیا، یہ وہ کافر دل ہے ۔۔۔ کہ اگر تنگ نہ ہوتا تو پریشاں ہوتا

مطلب ۔ فرماتے ہیں تنگیٔ دل کا گلہ کیا کریں یہ اگر تنگ نہ ہوتا تو پریشان ہوتا۔ مطلب شعر کا یہ ہے کہ اس دل نے مورد رنج دبا ہو کر تنگ ہی ہو جانا تھا اگر کشادہ ہوتا اور کوئی چیز اندر ہی نہ ٹھہرتی تب باعثِ پریشانی ہوتا۔

بعدِ یک عمرِ ورع، بار تو دیتا، بارے ۔۔۔ کاش، رضواں ہی درِ یار کا درباں ہوتا

معنی ۔ ورع، پرہیزگاری۔ عمرِ ورع، عمر بھر کی پرہیزگاری اور پاکیزگی۔ بار دینا، اجازت دینا
بارے، ایک بار

مطلب ۔ فرماتے ہیں عمر بھر کی پاکیزگی سے جنت اگر ملی تو کیا۔ یار کے دیدار تو نہ ہوئے۔ اس کے دربار میں تو باریابی نصیب نہ ہوئی۔ کاش یہ جنت کا محافظ دریار کا درباں ہوتا اور ہمیں یہاں اس کے ذریعہ دیدارِ یار نصیب ہوتا۔ مطلب یہ ہے کہ ہم جنت کے خواہاں نہ تھے بلکہ ہم تو یار کے عاشق تھے ہمیں جنت سے کیا غرض ہے۔ جیسا کہ فرمایا

تسکیں کو ہم نہ روئیں جو ذوقِ نظر ملے ۔۔۔ حورانِ خلد میں تری صورت مگر ملے

غزل ۳۲

نہ تھا کچھ تو خدا تھا، کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا
ڈبویا مجھ کو ہونے نے، نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا؟

مطلب: نیستی کو ہستی پر ترجیح دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ جب کچھ نہیں تھا اور وہ ہر شے کا خالق ہے اور لفظ کُن بھی اپنی ذات کو کہا تھا۔ لہٰذا ثابت ہوا کہ کائنات کا منبع خدا تعالیٰ کی ذات ہے۔ لہٰذا جب میں نہ تھا تو خدا میں تھا۔ اور میری قدر و منزلت اب سے کہیں زیادہ تھی۔ "ڈبویا مجھ کو ہونے نے" یعنی میرا درجہ گھٹ گیا اور خاک ہی ہو گیا۔ اس مدرسہ خیال کا ایک صوفیا کا گروہ ہے۔

جب تک قطرہ دریا میں ہے تو وہ دریا کا ایک حصہ ہے۔ اگر باہر آ جائے تو اُس کی ہستی فنا ہو جاتی ہے۔ اسی طرح جب تک انسان کی تخلیق نہ ہوئی تھی تو یہ ذات باری تعالیٰ ہی کا ایک حصہ تھا اور جب یہ وجود میں آ گیا تو یہ مخلوقات میں شامل ہو کر اپنے اصل مقام و مرتبہ سے جُدا ہو گیا اور بلندی سے پستی کی طرف آ گیا ۔۔۔ قطرہ دریا میں ہے اور بیرونِ دریا کچھ نہیں

ہُوا جب غم سے یوں بے حس تو غم کیا سر کے کٹنے کا؟
نہ ہوتا گر جُدا تن سے، تو زانو پہ دھرا ہوتا

مطلب: فرماتے ہیں ہجومِ غم سے ہمارا سر بے حس ہو کر رہ گیا ہے۔ ہر وقت اس کو زانو پہ رکھے بیٹھے رہتے ہیں تو پھر اگر یہ کٹ بھی جائے تو کس کو غم ہو گا۔ یعنی سر تو کٹنے سے پہلے ہی بیکار ہو چکا تھا اس لئے اِس کے کٹ جانے کا غم کیا ہوتا۔

ہوئی مدت کہ غالبؔ مرگیا پر یاد آتا ہے

وہ ہر اک بات پر کہنا، کہ یوں ہوتا تو کیا ہوتا؟

مطلب ۔ فرماتے ہیں زمانہ گزر گیا غالبؔ کو گذرے ہوئے پردہ اور اُس کی باتیں اب بھی یاد آتی ہیں اور خاص طور پر وہ باتیں جن پر وہ کہا کرتا تھا کہ خوش نصیبی سے یوں نہیں تو یوں ہوجاتا پھر کیا ہوتا

غزل ۳۳

یک ذرہ زمیں نہیں بے کار باغ کا　　یاں جادہ بھی، فتیلہ ہے لالے کے داغ کا

معنی ۔ باغ، مراد باغِ جہاں ۔ جادہ، راستہ، طریقہ، پگڈنڈی ۔ فتیلہ ۔ بتی موٹی بتی ۔ زخم پر بتی بنا کر رکھی جائے ۔

مطلب ۔ فرماتے ہیں کوئی بھی چیز بلکہ ذرا سی جگہ بھی باغِ جہاں کی بے کار نہیں ۔ جو بظاہر راستہ نظر آتا ہے وہ فتیلہ بن کر بقیہ زمین کو سیراب کرتا ہے جس طرح بتی تیل کو روشنی بنانے میں کام میں آتی ہے ۔ اسی طرح لالے کا داغ فتیلہ بن کر وہی کام جادہ بقیہ باغِ جہاں کی زمین کے لئے کرتا ہے ۔ جادہ بن کر فتیلے کا کام کرتا ہے ۔ ؎

جو ذرہ جس جگہ ہے وہیں آفتاب ہے

بے مے کسے ہے طاقتِ آشوبِ آگہی　　کھینچا ہے عجزِ حوصلہ نے خطِ ایاغ کا

معنی ۔ آشوب، پریشانی، ہل چل، فتنہ و فساد ۔ آگہی، خبر، علم ۔ ایاغ، پیالہ، جام، ساغر، وہ پیالہ جس سے ماپ کا کام لیا جائے ۔

مطلب ۔ فرماتے ہیں بغیر شراب الٰہی کے کس میں یہ طاقت ہے کہ دُنیا کے مصائب و آلام کا مقابلہ کر سکے اور ہر شخص اپنے حوصلہ کے عجز سے یعنی اپنے اپنے حوصلہ کے مطابق برداشت کرتا چلا جاتا ہے ۔

بُلبُل کے کاروبار پہ ہیں خندہ ہائے گُل کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ کا

مطلب ۔ فرماتے ہیں جس طرح دیوانے کی حالت پر لوگ ہنستے ہیں ۔ اسی طرح بُلبل کے پھولوں کے گرد چکر لگانے اور نثار ہونے پر گُل بھی ہنستے ہیں ۔ عشق میں انسان وحیوان سب اپنے حواس کھو بیٹھتے ہیں ۔

تازہ نہیں ہے نشۂ فکرِ سخن مجھے تریاکیٔ قدیم ہُوں دُودِ چراغ کا

معنی ۔ تریاک ، افیون ، چنڈو کا چھینٹا ۔ قدیم ، بہت پرانا ، ازل سے ۔ دودِ چراغ ، چراغ کا دھواں

مطلب ۔ فرماتے ہیں فکر وسخن کا نشہ نیا نہیں ہے ۔ بلکہ میں تو ازل سے ساتھ لایا ہوں جیسے تریاک جلا کر لوگ حقہ کی طرح سانس کھینچتے ہیں اور دُھواں کے ذریعہ اپنا نشہ حاصل کرتے ہیں میں شمع جلا کر رات کے حصے میں فکر سخن کرتا ہوں ۔

سو بار بندِ عشق سے آزاد ہم ہوئے پر کیا کریں ، کہ دل ہی عدو ہے فراغ کا

معنی ۔ بندِ عشق سے مراد دُنیا کے دھندے ۔ فراغ ۔ فراغت

مطلب ۔ فرماتے ہیں بارہا دُنیا کے فکروں اور غموں سے چھٹکارا حاصل کیا ۔ پر کیا کریں یہ ہمارا دل دشمن ہے فارغ رہنے کا ۔ اس کو کوئی نہ کوئی غم چاہیئے ۔

بے خونِ دل ہے چشم میں موجِ نگہ غبار یہ مے کدہ خراب ہے مے کے سراغ کا

مطلب ۔ فرماتے ہیں جو آنکھ بے خون ہے اور اپنے معشوق کی یاد میں آنسو نہیں بہاتی وہ آنکھ بہت بے رونق ہے ۔ خوبصورتی نام کو نہیں رہتی ۔ اور وہ ایسا میکدہ ہے جس میں شراب ہی نہیں یعنی ویران ہے ۔ اس لئے اللہ تعالیٰ کو بھی اپنے بندوں کا رونا دھونا اچھا لگتا ہے اور دعاؤں کے مقبول ہونے کا ذریعہ ہے ۔

باغِ شگفتہ تیرا بساطِ نشاطِ دل　　ابرِ بہار خم کدہ کس کے دماغ کا

مطلب۔ فرماتے ہیں تیرے باغ حسن کی بہار میرے غنچۂ خاطر کے لئے بس ہے مجھے اور کچھ نہیں چاہیئے چونکہ تیرا باغِ حسن ہمیشہ ہرا بھرا رہنے والا ہے۔ دوسرے باغوں کی بہار دنیاوی مے گساروں کے لئے ہوگی۔ وہی اس سے لطف اندوز ہوتے ہوں گے مجھے تو بس تیری بہار چاہیئے۔

غزل ۳۴

وہ مری چینِ جبیں سے غمِ پنہاں سمجھا　　رازِ مکتوب بہ بے ربطیٔ عنواں سمجھا

معنی۔ چین، شکن، سلوٹ۔ غمِ پنہاں، یہاں معنی رنجش کے ہیں جبیں، پیشانی

مطلب۔ فرماتے ہیں جس طرح خط کا مضمون اُس کی ابتدا ہی سے بھانپ لیا جاتا ہے۔ اسی طرح میرا محبوب میرے غمِ پنہاں کو میری پیشانی پر پڑی ہوئی شکنوں سے جان گیا۔

یک الف بیش نہیں صیقلِ آئینہ ہنوز　　چاک کرتا ہوں میں جب سے کہ گریباں سمجھا

مطلب۔ فرماتے ہیں میں بھی اپنے آئینہ دل کو گریباں چاک کر کے مصفیٰ کرنا چاہتا ہوں لیکن وہ ایک لکیر سے زیادہ صاف نہیں ہوا جس طرح صوفیا سانس کو ناف سے کھینچ کر دائیں جانب قلب پر ضرب لگاتے ہیں اور خیالی طور پر اِلّا اللہ لکھتے ہیں۔

شرحِ اسبابِ گرفتاریٔ خاطر مت پوچھ　　اِس قدر تنگ ہوا دل کہ میں زنداں سمجھا

مطلب۔ فرماتے ہیں میری گرفتاریٔ خاطر کے سبب تفصیل کے ساتھ نہیں بتائے جا سکتے بس اتنا جان لو کہ میرا دل تنگ ہو گیا ہے اور میں اس کو زنداں سمجھتا ہوں۔

بدگمانی نے نہ چاہا اُسے سرگرمِ خرام　　رُخ پہ ہر قطرۂ عرق، دیدۂ حیراں سمجھا

مطلب ۔ فرماتے ہیں میری بدگمانی نے یہ گوارا نہیں کیا کہ میرا محبوب دیر تک سرگرم خرام رہے اور اس کو پسینہ آ کر اس کی پیشانی پر قطرات رقیب کے دیدۂ حیراں نظر آنے لگیں ۔

عجز سے اپنے یہ جانا کہ وہ بدخُو ہو گا　　نبضِ خس سے تپشِ شعلۂ سوزاں سمجھا

مطلب ۔ عجز کو خس سے اور بدخوئی کو شعلے سے تعبیر کیا ہے مطلب یہ ہے کہ میں نے اپنی عاجزی اور اس کی بدخوئی سے یہ سمجھ لیا ہے کہ جیسے شعلہ خس کو جلا دیتا ہے اسی طرح تندخوئی ہے یعنی غصہ میری تباہی اور قتل کا باعث ہو کر رہے گا۔

سفرِ عشق میں کی ضعف نے راحت طلبی　　ہر قدم سایہ کو میں اپنے شبستاں سمجھا

مطلب ۔ فرماتے ہیں جب عشق کے سفر میں چلتے چلتے تھکان محسوس ہوئی اور میرے ضعف نے آرام کا مطالبہ کیا ۔ تو میں نے اپنے سائے کو اپنا شبستاں سمجھ لیا ۔ مطلب یہ ہے کہ جب پے در پے ناکامیاں ہوئیں ۔ تو پھر انہی محرومیوں کو اپنا ساتھی سمجھ لیا ۔

تھا گُریزاں مژۂ یار سے دل تا دمِ مرگ　　دفعِ پیکانِ قضا اس قدر آساں سمجھا

مطلب ۔ فرماتے ہیں میں مژگان یار سے ہمیشہ ہی ڈرتا اور بھاگتا رہا ساری عمر اور سمجھتا رہا کہ جان بچ گئی اور مژۂ یار کے بالمقابل پیکانِ قضا کا دفعیہ بہت آسان سمجھا ۔ یا یہ بھی مطلب ہو سکتا ہے کہ مژۂ یار سے ساری عمر ڈر کے بھاگتا رہا اور اس کو پیکانِ قضا کا دفعیہ سمجھتا رہا لیکن دراصل یہ میری نادانی تھی ۔ مژۂ یار کے پیکان سے کس کو فرار ہے ۔

دل دیا جان کے کیوں اس کو وفادار اسدؔ　　غلطی کی کہ جو کافر کو مسلماں سمجھا

مطلب ۔ فرماتے ہیں ۔ اے اسدؔ تم نے اپنا دل اس کو وفادار سمجھ کر دیا ۔ اگر دینا ہی تھا تو اس کو بے وفا سمجھ کر دیا ہوتا ۔ تم نے کس طرح کافر کو مسلمان سمجھ لیا ۔ یعنی مسلمان کی شان تو یہ ہے کہ وہ ہمیشہ وفادار ہوتا ہے اور کافر بے وفا ۔

غزل ۳۵

پھر مجھے دیدۂ تر یاد آیا　　　دل جگر تشنۂ فریاد آیا

مطلب ۔ فرماتے ہیں پھر مجھے اپنا دیدۂ تر یاد آیا جس کے ذریعے سے میں اپنے دل کی بھڑاس نکال کر اپنے دل کو تسکین دے لیا کرتا تھا۔ دیدۂ تر یاد آتے ہی دل جگر تشنۂ فریاد ہو گئے۔ یعنی آرزومندِ فریاد ہو گئے۔ ؎ جب وہ نیرنگ نظر یاد آیا ؛ دردِ دل زخم جگر یاد آیا (شارح)

دم لیا تھا نہ قیامت نے ہنوز　　　پھر ترا وقتِ سفر یاد آیا

مطلب ۔ دوست کو جدا کرتے وقت جو کیفیت گزری تھی اس کا بار بار آنے کا اظہار کرتے ہیں۔ دم لیا تھا نہ قیامت نے ہنوز ۔ یعنی کوئی وقفہ نہ ہوا تھا کہ قیامت پہ قیامت بپا ہو رہی ہے اور تیرا رخصت ہونا بار بار یاد آ رہا ہے۔

سادگی ہائے تمنا یعنی　　　پھر وہ نیرنگِ نظر یاد آیا

مطلب ۔ فرماتے ہیں میری آرزوں اور تمناؤں کی سادگی تو دیکھو کہ پھر نگاہ یار کی نیرنگیوں کا تماشا چاہتی ہیں۔ لیکن خود ہی سمجھتے ہیں کہ آرزوں کا حاصل کچھ نہیں فقط نگاہِ یار کی نیرنگیوں کا فریب ہے۔

عذرِ واماندگی اے حسرتِ دل　　　نالہ کرتا تھا جگر یاد آیا

معنی ۔ واماندن سے ہے واماندگی، تھک جانا، تھکاوٹ۔ بے کار۔

مطلب ۔ اے حسرتِ دل میں معذرت خواہ ہوں کہ تیری خواہش کے مطابق نالہ نہ کر سکا۔ اس لئے کہ میں ڈرتا ہوں کہ نالہ کرنے سے کہیں میرے جگر کو نقصان نہ پہنچ جائے۔

حسرت گریہ و نالہ تھی بہت ؛ دل جگر اپنا مگر یاد آیا (شارح)

زندگی یُوں بھی گزر ہی جاتی　　　کیوں ترا راہ گزر یاد آیا

مطلب۔ فرماتے ہیں بغیر عشق و محبت کے بھی زندگی گزر جاتی۔ آخر زندگی نے تو گزرنا ہی ہے۔ ہزاروں لوگ بغیر عشق و محبت کے رہتے ہیں لیکن نہ جانے ہمیں کیا خیال آیا۔ کس نے تیرے حسن و احسان کی داستان سنائی۔ ہم تیری راہ گزر پہ آ بیٹھے۔ پھر جب تیرا حُسن و جمال دیکھ لیا تو اب تیرے بغیر چین نہیں آتا۔

کیا ہی رضواں سے لڑائی ہوگی　　　گھر ترا خُلد میں گر یاد آیا

مطلب۔ فرماتے ہیں ہم تیرے دالا و شیدا ہیں۔ لہٰذا خطرہ ہے کہ رضوان سے ہماری خوب لڑائی ہوگی۔ ہم تیرے گھر جانا چاہیں گے اور وہ ہمیں روکے گا۔ چونکہ اس کا فرض منصب یہی ہے کہ جو داخلِ جنّت ہے وہ وہاں سے نہ نکل پائے۔ دوسرے معنی یہ بھی ممکن ہیں کہ رضوان کو یہ بات پسند نہ آئے گی کہ اس کی جنّت کے مقابلہ میں تیرے گھر کی تعریف و توصیف کی جائے۔

آہ وہ جراُتِ فریاد کہاں　　　دل سے تنگ آکے جگر یاد آیا

مطلب۔ جگر کے ہوتے ہونے تو بہت ہمت تھی۔ نالہ کرتے تھے چاہے اثر ہو یا نہ ہو۔ مگر اب تو جگر نہیں ہے اور دل مجبور کرتا ہے کہ آہ و فغاں، نالہ و فریاد جاری رکھی جائے۔

پھر ترے کُوچے کو جاتا ہے خیال　　　دلِ گُم گشتہ مگر یاد آیا

مطلب۔ فرماتے ہیں تیری گلی کا خیال بار بار آتا ہے۔ چونکہ ہم نے اپنا دل وہیں کھویا یعنی تجھ پر عاشق ہوئے تھے۔ تو نے ہمارا دل اپنی گلی میں لوٹ لیا تھا۔ مگر براہِ راست معشوق کو شرمندگی کی وجہ سے نہیں کہتے۔ دل گم گشتہ کا ذکر کرتے ہیں۔ شاید ہم کو اپنا کھویا ہوا دل یاد آیا جسے ہم سمجھتے ہیں کہ تیرے کوچے ہی میں کھو آئے۔

کوئی ویرانی سی ویرانی ہے ! دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

مطلب ۔ فرماتے ہیں ہم تو جنون عشق میں گھر چھوڑ کر نکل آئے تھے مگر دشت کی ویرانی کو دیکھ کر ہمیں اپنے گھر کی ویرانی کا خیال آیا جس سے آپ گھر کی ویرانی کا اندازہ لگا سکتے ہیں ۔

میں نے مجنوں پہ لڑکپن میں اسدؔ سنگ اٹھایا تھا کہ سر یاد آیا

مطلب ۔ فرماتے ہیں نادانی سے لڑکوں کی دیکھا دیکھی لڑکپن میں میں نے بھی ایک دفعہ مجنوں کو مارنے کے لئے پتھر اٹھایا تھا ۔ مگر مارنے سے پہلے ہی مجھے اپنا سر یاد آیا کہ آج تم اس کو مارتے ہو ۔ کل کو اگر تم ہی عشق کی اس منزل میں پہنچ گئے تو کوئی تمہیں بھی پتھر مارے گا ۔ مطلب یہ ہے کہ دوسروں کے ساتھ برا کرنے سے پہلے سوچ لو کہ یہی معاملہ تمہارے ساتھ ہوا تو تم پر کیا گزرے گی ۔ سر حشر کیا خوف ۔ تھا لاحق ناصر ۔ فضل مولا کا مگر یاد آیا (شارح)

غزل ۱۷۶

ہوئی تاخیر، تو کچھ باعثِ تاخیر بھی تھا

آپ آتے تھے ، مگر کوئی عناں گیر بھی تھا

معنی ۔ عناں گیر ۔ روکنے والا ۔

مطلب ۔ فرماتے ہیں وعدہ کے مطابق آ تو گئے لیکن دیر سے آئے ۔ کیا اس تاخیر کا سبب رقیب تو نہ تھا کہ آپ کو روک رہا ہو ۔

تم سے بے جا ہے مجھے اپنی تباہی کا گلہ

اس میں کچھ شائبہ خوبیٔ تقدیر بھی تھا

معنی ۔ طنزاً، خوبیٔ تقدیر، شومیٔ تقدیر۔ شائبہ، حصّہ
مطلب ۔ فرماتے ہیں تم سے اپنی تباہی کا گلہ کرنا نامناسب ہے چونکہ اس میں آپ کا قصور نہیں ہے بلکہ کچھ میری بدقسمتی کا بھی ہاتھ ہے ۔

تُو مجھے بھُول گیا ہو تو پتا بتلادوں　　کبھی فتراک میں تیرے کوئی نخچیر بھی تھا

معنی ۔ فتراک ۔ وہ رسّہ جو گھوڑے کی زین کے ساتھ گھوڑے پر رکھتے ہیں۔ نخچیر، شکار
مطلب ۔ فرماتے ہیں میں وہی اک تیرا شکار ہوں جس کو تو نے حقیر جان کر اپنے فتراک سے کھول کر پھینک دیا تھا

قید میں ہے ترے وحشی کو وہی زلف کی یاد　　ہاں کچھ اک رنجِ گراں باریٔ زنجیر بھی تھا

مطلب ۔ فرماتے ہیں تیرے وحشی کو جبکہ وہ تیرا قیدی تھا تری زلف کی یاد ستاتی ہے ہاں مگر اس یاد کے ساتھ کچھ تکالیف کچھ مصائب، کچھ ناکامیاں نامرادیاں بھی تھیں مگر وہ تری زلف کے مقابلہ میں ہیچ تھیں ۔

بجلی اک کوند گئی آنکھوں کے آگے تو کیا　　بات کرتے کہ میں لب تشنۂ تقریر بھی تھا

مطلب ۔ فرماتے اے میرے دلبر تیرا آنا فانا آنا تو بجلی کوندنے کے مترادف ہے تیری صورت دیکھی ۔ ترا جلوہ نصیب ہو کر باعث مسرت و شادمانی ہوا لیکن میں تشنۂ دیدار ہی نہ تھا بلکہ لب تشنۂ تقریر بھی تھا۔ تھوڑی بہت گفتگو کرتے تو کیا ہوتا ۔

یُوسف اُس کو کہوں اور کچھ نہ کہے خیر ہوئی　　گر بگڑ بیٹھے تو میں لائقِ تعزیر بھی تھا

معنی ۔ لائقِ تعزیر ہونا، سزا کا مستحق ہونا ۔
مطلب ۔ فرماتے ہیں میرے یوسف اس کو کہنے میں خیر ہوگی۔ چونکہ یوسف حسین وجمیل ہونے کے

علاوہ ایک وقت غلام ہو کر بازار میں بھی بکے ہیں۔ اگر وہ ان ہی معنی میں میرا کلام سمجھتے اور اور مجھ پر خفا ہوتے تو میں سزاوار تھا۔

دیکھ کر غیر کو ہو کیوں نہ کلیجہ ٹھنڈا   نالہ کرتا تھا و لے طالبِ تاثیر بھی تھا

معنی۔ کلیجہ ٹھنڈا ہونا۔ صبر آنا۔

مطلب۔ فرماتے ہیں جس نے ہم پر ظلم کیا۔ اب اس پر ہو رہا ہے اب وہ بھی نالہ و فریاد کر رہا ہے اور چاہتا ہے کہ اس کا نالہ پُر اثر ہو جائے۔ یہ سب کچھ دیکھ کر ہمارا کلیجہ ٹھنڈا ہوا ہے۔

پیشے میں عیب نہیں رکھئے نہ فرہاد کو نام   ہم ہی آشفتہ سروں میں وہ جواں میر بھی تھا

مطلب۔ فرماتے ہیں پیشہ میں کوئی عیب نہیں فرہاد اگر عشق میں کوہکن بھی بن گیا تو کیا ہوا۔ آخر ہم عاشقوں کے گروہ میں اس کا بہت بڑا مقام ہے۔

ہم تو مرنے کو کھڑے، پاس نہ آیا نہ سہی   آخر اس شوخ کے ترکش میں کوئی تیر بھی تھا

مطلب۔ فرماتے ہیں ہم تو جان قربان کرنے کے لئے، سامنے آکھڑے ہوئے تھے مگر اس نے ہمیں حقیر سمجھ کر ہم سے نگاہیں چار نہ کیں۔ اگر پاس آنا اس کی کسرِ شان تھی تو دور سے ہی کوئی تیر اپنے ترکش میں سے نکال کر ہماری طرف پھینک دیتا یعنی اپنی ادا و ناز سے شکار کر لیتا۔

پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق   آدمی کوئی ہمارا دمِ تحریر بھی تھا

مطلب۔ فرماتے ہیں کراماً کاتبین کے لکھے پر کیوں ہمارے گناہوں کا شمار یعنی حساب و کتاب رکھا گیا۔ وہ تو فرشتہ ہیں ہمارے جذبات احساسات سے بے خبر ہیں۔ ان کو صحیح اندازہ کس طرح ہو سکتا ہے۔ لکھنے کے وقت ہمارا بھی کوئی نمائندہ ضرور ہونا چاہیئے تھا۔

ریختے کے تمہیں اُستاد نہیں ہو غالبؔ　　کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میرؔ بھی تھا

مطلب ۔ کہتے ہیں اُردو شاعری میں تم ہی اُستاد نہیں ہو بلکہ مشہور ہے کہ تم سے پہلے فنِ سخن میں کوئی میرؔ بھی تھا ۔ غالبؔ نے اپنے آپ کو میرؔ کا معتقد ٹھہرایا ہے ۔ ایک دوسری جگہ اس طرح اپنی عقیدت کا اظہار کرتے ہیں ۔۔۔ ؎

غالبؔ اپنا یہ عقیدہ ہے بقول ناسخؔ
آپ بے بہرہ ہے جو معتقدِ میرؔ نہیں

غزل ۲۷

لبِ خشک، درِ تشنگی مردگاں کا　　زیارت کدہ ہوں، دلِ آزردگاں کا

مطلب ۔ فرماتے ہیں لبِ خشک ہوں ان لوگوں کا جو راہِ عشق میں پیاسے ہی گزر گئے اور زیارت گاہ بن گئے یعنی اُن لوگوں کا جو عشق میں ناکام و نامراد ہیں ۔ دلِ آزردگان سے مراد عشاق ہیں ۔

ہمہ نا امیدی ہمہ بدگمانی　　میں دل ہوں، فریبِ وفا خوردگاں کا

مطلب ۔ فرماتے ہیں میں سراسر نا اُمیدی اور بدگمانی کی تصویر بن گیا ہوں ۔ اسی لئے اب میں ان لوگوں کا نمائندہ ہوں جو معشوقوں کے فریب کھاتے رہے اور ہمیشہ نامراد و ناکام ہی رہے ۔

ناصرؔ رہِ وفا میں بڑھو حوصلہ کے ساتھ
آئے جو تم ہو جان کا سودا کئے ہوئے

(شارح)

غزل ۳۸

تُو دوست کسی کا بھی ستمگر نہ ہوا تھا ۔۔۔ اوروں پہ ہے وہ ظلم کہ مجھ پر نہ ہوا تھا

معنی ۔ اوروں سے مراد رقیب ہیں ۔

مطلب ۔ فرماتے ہیں تو کسی کا بھی دوست نہیں بنا ۔ اور تیرے جور و ستم مجھ پر ہی نہیں بلکہ سب پر یکساں ہیں ۔ مگر ایک یہ بھی معنی نکلتے ہیں کہ تو دوست کسی کا بھی نہیں ۔ نہ میرا نہ رقیبوں کا مگر تیرے ظلم و ستم اوروں پر مجھ سے زیادہ ہیں ۔ اس لئے میرے دل میں آتشِ رشک بھڑک رہی ہے ۔

چھوڑا مہِ نخشب کی طرح دستِ قضا نے ۔۔۔ خورشید ہنوز اس کے برابر نہ ہوا تھا

معنی ۔ مہِ نخشب ۔ وہ چاند جو مصنوعی تھا اور نخشب ابنِ عطا نے کچھ ادویات سے تیار کر کے چاہ میں چھوڑا تھا ۔ وہ کچھ دنوں روشنی دے کر ختم ہوا ۔

مطلب ۔ فرماتے ہیں دستِ قضا نے میرے دل کو روشن ہونے سے پہلے ہی چھوڑ دیا ۔ اس میں ابھی روئے یار کی پوری تصویر نہیں آئی تھی اور وہ ابھی خورشید نہیں بنا تھا ۔

توفیق باندازۂ ہمت ہے ازل سے ۔۔۔ آنکھوں میں ہے وہ قطرہ کہ گوہر نہ ہوا تھا

مطلب ۔ فرماتے ہیں جس قدر عالی ہمت کسی کی ہوتی ہے ۔ اسی کے موافق اس کو تائیدِ غیبی حاصل ہوتی ہے ۔ اور ثبوت یہ دیتے کہ آنکھوں میں جو قطرہ ہے اگر وہ دریا میں موتی بن جانے پر قناعت کرتا تو اس کو عاشق کی آنکھ کا اشک بننے کا شرف حاصل نہ ہوتا ۔

دریائے معاصی تنک آبی سے ہوا خشک ۔۔۔ میرا سرِ دامن بھی ابھی تر نہ ہوا تھا

مطلب ۔ فرماتے ہیں ۔ گناہ کرنے میں ہمارا حوصلہ اس قدر فراخ ہے کہ باوجودیکہ دریائے معاصی

خشک ہوگیا۔ مگر ابھی ہمارے دامن کا کونہ تک بھی نہیں بھیگا۔ مراد یہی ہے کہ انسان ہوس کا پتلا ہے۔

جب تک کہ نہ دیکھا تھا قدِ یار کا عالم　　میں معتقدِ فتنۂ محشر نہ ہوا تھا

معنی۔ قدِ یار۔ کو ہمیشہ فتنۂ محشر۔ سرو اور شمشاد سے تشبیہ دیتے ہیں۔

مطلب۔ فرماتے ہیں میں نے جب تک قدِ یار کو نہ دیکھا تھا میں محشر خرامی کا قائل نہ تھا نہ میرا ایمان تھا اب جبکہ دیکھ لیا تو اب ایمان لے آیا ہوں۔ تصوف میں قدِ یار سے مراد صفات باری تعالیٰ ہیں۔ میں نے جب اللہ تعالیٰ کی صفات پر غور کیا تو میں محشر خرامی) اسکی قدرت پر ایمان لے آیا۔

میں سادہ دل آزردگیٔ یار سے خوش ہوں　　یعنی سبقِ شوق مکرر نہ ہوا تھا

معنی۔ سادہ دل یا سادہ لوح۔ بیوقوف کو کہتے ہیں۔

مطلب۔ فرماتے ہیں میں سادہ دل ہوں اور یار کے آزردہ ہونے سے بھی خوش ہوں سمجھتا ہوں کوئی بات نہیں ایک دن صلح ہو جانے پر دوبارہ سبقِ شوق لیں گے۔ سادہ دل ہی جو ٹھہرے۔

جاری تھی اسدؔ داغِ جگر سے مری تحصیل　　آتش کدہ، جاگیرِ سمندر نہ ہوا تھا

معنی۔ سمندر۔ ایک کیڑا جو آگ میں ہوتا ہے۔

مطلب۔ فرماتے ہیں میں اپنے داغِ جگر سے لذتِ آزار کی تحصیل اُس زمانے سے کر رہا ہوں جبکہ آتش کدہ ابھی سمندر کی ملکیت نہیں بنا تھا۔

غزل ۳۹

شب کہ وہ مجلس فروزِ خلوتِ ناموس تھا　　رشتۂ ہر شمع خارِ کسوتِ فانوس تھا

معنی۔ خلوت ناموس۔ شرم وحیا کی محفل۔ رشتۂ شمع۔ موم بتی کا دھاگہ۔ کسوت۔ لباس

مطلب۔ فرماتے ہیں رات ہمارا معشوق شرم وحیا کی مجلس میں جلوہ افروز تھا۔ اس کے سامنے شمع خیالات

سے پانی پانی ہو رہی تھی۔ رشتۂ شمع اس کے حق میں خار پیراہن ہو گیا تھا۔

مشہدِ عاشق سے کوسوں تک جو اگتی ہے حنا کس قدر یارب ہلاکِ حسرتِ پابوس تھا

معنی ۔ مشہد۔ شہیدوں کا قبرستان ۔ ہلاکِ حسرت۔ پابوس۔ قدموں کو چومنے کی حسرت رکھنے والے

مطلب۔ فرماتے ہیں عشاق کو پابوسی کی کس قدر خواہش تھی جبھی تو کوسوں تک ان کے قبرستان سے مہندی اگ رہی ہے تاکہ معشوق اسے اپنے پیروں میں لگائیں۔

شاید اسی طرح عشاق کو اپنے معشوق کی قدم بوسی کا موقعہ مل جائے خواہ وہ مرنے کے بعد ہی سہی۔

حاصلِ اُلفت نہ دیکھا جز شکستِ آرزو دل بہ دل پیوستہ گویا اک لبِ افسوس تھا

مطلب ۔ فرماتے ہیں عشق و محبت کا انجام سوائے ناکامیٔ آرزو کے اور کچھ نہ دیکھا اگر دل مل بھی گئے تو وہ بھی لبِ افسوس ہی کی ایک شکل تھی ۔

کیا کہوں بیماریٔ غم کی فراغت کا بیان جو کہ کھایا خونِ دل بے منتِ کیموس تھا

معنی ۔ کیموس ، جگر

مطلب ۔ بیماریٔ غم کی فارغ البالی کا کیا بیان کروں۔ جو کچھ بھی کھاتا ہوں وہ خون ہوتا ہے۔ بے منت کیموس ہے یعنی جگر کو ہضم کرنے کی زحمت نہیں اٹھانی پڑتی۔ لہٰذا مجھ پر بھی جگر کا کوئی احسان نہیں ہے

غزل ۴۰

آئینہ دیکھ، اپنا سا مُنہ لے کے رہ گئے صاحب کو دل نہ دینے پہ کتنا غرور تھا

مطلب ۔ فرماتے ہیں آپ تو میرے پر تعجب کرتے تھے کہ میں نے آپ پر فدا ہو کر اپنا دل آپ کو کیسے

دے دیا۔ اب بتاؤ کہ تم خود ہی آئینہ دیکھ کر اپنے آپ پر کیسے عاشق ہو گئے۔ اب وہ دل نہ دینے کے غرور کا کیا ہوا۔

قاصد کی اپنے ہاتھ سے گردن نہ ماریئے ۔۔۔ اس کی خطا نہیں ہے یہ میرا قصور تھا

مطلب۔ بوجہ رشک عاشق نہیں چاہتا کہ معشوق کے ہاتھوں کوئی اور مارا جائے۔ اس لئے کہتے ہیں کہ قاصد کی کوئی خطا نہیں جو کچھ قصور ہے وہ میرا ہے۔ مجھے اپنے ہاتھوں سے قتل کر ڈالو کیونکہ نامہ محبت دے کر میں نے اس کو بھیجا تھا۔

غزل ۱۴۱

عرضِ نیازِ عشق کے قابل نہیں رہا ۔۔۔ جس دل پہ ناز تھا مجھے وہ دل نہیں رہا

مطلب۔ فرماتے ہیں میرا دل عشق کی نیازمندی کے قابل نہیں رہا، چونکہ غم عشق میں جو صدمات برداشت کرنے پڑے۔ ان سے میرا دل اس قابل نہیں رہا کہ محبت کا اظہار کر سکے۔

جاتا ہوں داغِ حسرتِ ہستی لئے ہوئے ۔۔۔ ہوں شمعِ کشتہ، درخورِ محفل نہیں رہا

معنی۔ شمعِ کشتہ، بجھی ہوئی شمع

مطلب۔ فرماتے ہیں میں اس دنیا سے مجبوراً جاتا ہوں۔ جانے کو دل تو نہیں چاہتا، مگر قضا سے ہر کوئی مجبور ہے اور ویسے بھی اب میں بجھی ہوئی شمع ہوں جو محفل کے کسی کام کی نہیں رہتی اور اپنی افادیت کھو بیٹھتی ہے۔

مرنے کی اے دل اور ہی تدبیر کر کہ میں ۔۔۔ شایانِ دست و بازوئے قاتل نہیں رہا

مطلب۔ فرماتے ہیں مجھ (عاشق) کی خستہ حالت، زار و نزار پر معشوق کو رحم آگیا اور اس نے مجھے قتل کرنے سے ہاتھ اٹھا لیا۔ اب مجھے مرنے کے لئے کچھ اور ہی تدبیر کرنی چاہیئے۔

بررُوئے شش جہت درِ آئینہ باز ہے　　　یاں امتیازِ ناقص وکامل نہیں رہا

مطلب ۔ ہے جیسے آئینہ اچھا بُرا عکس قبول کر لیتا ہے ۔ دل عارف میں بھی آئینہ اسی طرح تصویر اُتر آتی ہے جس قدر دل کا آئینہ صاف ہو گا ۔ اسی قدر تصویر صاف ہو گی یعنی (اسرار الٰہی)

واکر دیئے ہیں شوق نے بندِ نقابِ حُسن　　　غیر از نگاہ اب کوئی حائل نہیں رہا

مطلب ۔ شوق خود نمائی نے نقابِ حُسن کے بند کھول دیئے ہیں ۔ یعنی ہر طرف نمودِ حُسن ہے اب بھی اگر محبوب کو کوئی نہ دیکھ پائے تو اُس کی اپنی نگاہ کا قصور ہے ۔ وہی درمیان میں پردہ بن کر حائل ہے چشم باطن کھل جائے تو محبوبِ حقیقی کا جلوہ ہر طرف نظر آنے لگتا ہے ۔

گو میں رہا رہینِ ستم ہائے روزگار　　　لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا

مطلب ۔ فرماتے ہیں ، باوجود اس کے کہ دُنیا کے آلام و مصائب میں ہمیشہ ہی گرفتار رہا لیکن اے میرے محبوب میں تجھے کسی وقت کسی حالت میں بھی نہیں بھولا ۔ ہر وقت تیرا ذکر میرے دل کی راحت بنا رہا ۔

دل سے ہوائے کشتِ وفا مٹ گئی کہ واں　　　حاصل سوائے حسرتِ حاصل نہیں رہا

معنی ۔ کشتِ وفا ، باغِ وفا ۔

مطلب ۔ فرماتے ہیں اب میرے دل سے باغِ وفا کی آرزو مٹ گئی ہے اور یہ اس لئے کہ وفا کے بعد وفا کا صلہ حسرت و افسوس کے علاوہ کچھ نہیں ملا ۔

بیدادِ عشق سے نہیں ڈرتا مگر اسدؔ　　　جس دل پہ ناز تھا مجھے وہ دل نہیں رہا

مطلب ۔ فرماتے ہیں اے اسدؔ میں عشق میں جور و ستم سے نہیں ڈرتا بلکہ بات یہ ہے کہ وہ ظلم

سہنے والا دل ہی میرے پہلو میں نہیں رہا جس پر میں نازاں تھا۔

غزل ۴۲

رشک کہتا ہے کہ اس کا غیر سے اخلاص حیف! عقل کہتی ہے کہ وہ بے مہر کس کا آشنا

مطلب ۔ فرماتے ہیں کہ رشک تو یہی کہتا ہے کہ اُس کا ملنا جلنا غیر سے نہیں ہونا چاہیے۔ مگر عقل یہ کہتی ہے کہ جب وہ بے مروت ہمارا نہیں ہوا تو وہ کسی دوسرے سے بھی محبت کرنے والا نہیں ۔

ذرہ ذرہ ساغرِ مے خانۂ نیرنگ ہے گردشِ مجنوں بہ چشمک ہائے لیلیٰ آشنا

معنی ۔ خانۂ نیرنگ ، مکر و فریب کا گھر ۔ چشمک

مطلب ۔ فرماتے ہیں دنیا کا ہر ذرّہ مکر و فریب کے میخانہ کا ساغر ہے ۔ دیکھ جبھی تو مجنوں لیلیٰ کے ہر اشارے پر ناچتا ہے ۔ مطلب یہ کہ دنیا مکر و فریب سے بھری پڑی ہے اور اہل دنیا اُس پر کیڑوں کی طرح سے چمٹے ہوئے ہیں ۔

شوق ہے ساماں طرازِ نازشِ اربابِ عجز ذرہ صحرا دستگاہ و قطرہ دریا آشنا

معنی ۔ اربابِ عجز ، عاجزی والے ۔ طراز ، زینت ۔ آرائش

مطلب ۔ فرماتے ہیں عجز اختیار کرنے والوں کا سرمایہ نازِ عشق ہے ۔ جسکی وجہ سے ایک ذرۂ ناچیز صحرا بن جاتا ہے اور قطرہ دریا بن جاتا ہے ۔ یہ سب کچھ عشق کی بدولت ہے مطلب یہ ہے کہ ایک مٹی کا پتلا ترقی کر کے عشق الٰہی کے مراحل طے کر کے محبوبِ خدا بن جاتا ہے ۔ گویا ایک ذرہ صحرا میں اور ایک قطرہ دریا میں تبدیل ہو گیا ہو ۔

مَیں اور اک آفت کا ٹکڑا وہ دلِ وحشی کہ ہے عافیت کا دشمن اور آوارگی کا آشنا

مطلب ۔ فرماتے ہیں میرا دل آفت کا ٹکڑا ہے اور اس وحشی سے میرا پالا پڑا ہے ۔ یہ عافیت کا دشمن مجھے آرام نہیں کرنے دیتا ۔ عشق کی دنیا میں مجھے آوارہ لئے پھرتا ہے ۔

شکوہ سنجِ رشکِ ہم دیگر نہ رہنا چاہیئے میرا زانو مونس اور آئینہ تیرا آشنا

مطلب ۔ فرماتے ہیں شکوہ اور بدگمانی دونوں بے لطف چیزیں ہیں ان دونوں کو باہم نہیں ہونا چاہیے ۔ اسی لئے میرا سر بزانو رہتا ہے اور آئینہ تمہارا آشنا ہے ۔ تم شکوہ کرنا چھوڑ دو اور میں رشک کرنا چھوڑ دوں گا ۔

ربطِ یک شیرازۂ وحشت ہیں اجزائے بہار سبزہ بیگانہ صبا آوارہ گُل ناآشنا

مطلب ۔ فرماتے ہیں اجزائے بہار کے ضروری عنصر کو ایک لڑی میں پرو جیسے بہار سبزہ بیگانہ صبا آوارہ کو اور گلِ ناآشنا کو ایک ہی جگہ نظم کر دیتی ہے ۔ تو سب بہار کا جزو بن کر بہار ہو جاتے ہیں ۔

کوہ کن نقاشِ یک تمثالِ شیریں تھا اسدؔ سنگ سے سر مار کر ہووے نہ پیدا آشنا

مطلب ۔ فرماتے ہیں کوہ کن جب پتھر پر کدال چلاتا تھا تو پتھر سے جو چنگاری نکلتی تھی اُس میں فرہاد کو شیریں کی تصویر نظر آتی تھی لیکن اس طرح پتھر توڑنے سے تو اصلی محبوب حاصل نہیں ہو سکتا ۔

تمناؤں میں اُلجھایا گیا ہوں ؛ بتِ شیریں سے بہلایا گیا وہ
(شارح)

غزل ۴۳

ذکر اُس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا   بن گیا رقیب آخر تھا جو رازداں اپنا

مطلب۔ فرماتے ہیں میں نے بھی اپنے اوپر ظلم کیا کہ میں نے اپنے رازداں کے سامنے اپنے محبوب کے حُسن کی تعریف اس رنگ میں کر میٹھا کہ وہ بھی میرے معشوق پر نادیدہ عاشق ہوگیا اور میرا رقیب بن گیا۔ حالانکہ وہ میرا رازداں اور دوست تھا۔ لیکن اک تو میرا بیان حُسن اور وہ بھی اس پری وش کے حُسن کا بیان یعنی سونے پر سہاگہ۔

مے وہ کیوں بہت پیتے بزمِ غیر میں یارب   آج ہی ہُوا منظور اُن کو امتحاں اپنا

مطلب۔ فرماتے ہیں اگر انہوں نے اپنی عالی ظرفی کا امتحان لینا تھا تو بزمِ غیر میں کیوں زیادہ مے پی۔ یہ میرے لئے بے حد باعثِ رشک ہوا۔ ایسا امتحان ہی لینا تھا تو میری بزم میں پیتے تاکہ میں ان کی بے خودی اور مستی سے لطف اندوز ہوتا۔

منظر اک بلندی پر اور ہم بنا سکتے   عرش سے اُدھر ہوتا کاش کہ مکاں اپنا

مطلب۔ فرماتے ہیں ہم اپنی حقیقت سے آشنا نہیں ہو سکے اور نہ ہی تیرے متعلق ہمیں زیادہ علم ہوا۔ کاش عرش سے پرے ہوتا ہمارا ٹھکانہ تا ہم دیکھ سکتے۔

دے وہ جس قدر ذلت ہم ہنسی میں ٹالیں گے   بارے آشنا نکلا اُن کا پاسباں اپنا

مطلب۔ فرماتے ہیں بہت ہی اچھا ہوا اُن کا پاسباں ہمارا دوست نکلا۔ اگر وہ ہماری تحقیر و تذلیل بھی کرے گا تو ہم اس کو مذاق کا رنگ دیتے رہیں گے۔ اور ظاہر کریں گے کہ پاسباں ہمارا پرانا آشنا ہے۔

دردِ دل لکھوں کب تک؟ جاؤں اُن کو دکھلاؤں
اُنگلیاں فگار اپنی، خامہ خونچکاں اپنا

مطلب۔ فرماتے ہیں خط میں دردِ دل کب تک لکھتا رہوں گا مجھے چاہیئے کہ اُن کے پاس جا کر اُن کو اپنی انگلیاں اور خون آلود قلم دکھلاؤں تاکہ ان کو بھی میرے دردِ دل کا کچھ احساس ہو جائے۔

گھِستے گھِستے مٹ جاتا آپ نے عبث بدلا
ننگِ سجدہ سے میرے سنگِ آستاں اپنا

مطلب۔ فرماتے ہیں آپ نے اپنا سنگِ آستاں عبث بدلا۔ اس لئے کہ وہ میرے سجدوں سے خراب یا ناپاک ہو گیا تھا۔ کیا ضرورت تھی وہ تو میرے سجدوں سے خود ہی گھس جاتا۔ پھر بدل دیتے

تا کرے نہ غمّازی، کر لیا ہے دشمن کو
دوست کی شکایت میں، ہم نے ہمزباں اپنا

مطلب۔ فرماتے ہیں ہم نے دوست کی شکایت دشمن کی زبان سے نکل والی ہے۔ اب وہ ہمارے دوست سے جا کر چغلی نہ کر سکے گا۔

ہم کہاں کے دانا تھے کس ہنر میں یکتا تھے
بے سبب ہوا غالبؔ دشمن آسماں اپنا

مطلب۔ کسرِ نفسی کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ہم تو نہ دانا تھے نہ کسی ہنر میں یکتا تھے پھر آسمان ہمارا کیوں دشمن ہو گیا۔ وہ تو اہلِ کمال کا دشمن ہوتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر آسمان ہمارا دشمن ہے تو ہماری دانائی اور یکتا ہونا مسلّم ہو گیا۔ سبحان اللہ کس دانائی اور ہنرمندی سے اپنا کاملِ فن اور یکتا ہونا ظاہر کیا۔ مقطع کی تعریف نہیں کی جا سکتی

خوشی اپنی نہ غم اپنا نہ اندازِ فغاں اپنا ؎ کہاں پر چھوڑ آئے ہم زمین و آسماں اپنا

(شارح)

غزل ۴۴

سرمۂ مفتِ نظر ہوں مری قیمت یہ ہے　　کہ رہے چشمِ خریدار پہ احساں میرا

مطلب ۔ فرماتے ہیں میرے کلام کا فیض و لطف عام ہے جو چاہے اس سے فیض یاب ہو اور اس سے میری غرض یہ ہے کہ خریدار پر میرا احسان رہے ۔ (یہ شعر اپنے کلام کی تعریف میں ہے)

رخصتِ نالہ مجھے دے کہ مبادا ظالم　　تیرے چہرے سے ہو ظاہر غمِ پنہاں میرا

مطلب ۔ فرماتے ہیں ہمیں نالہ کرنے کی اجازت دے ورنہ ضبطِ غم سے ہمارا دل دھواں دھار ہو جائے گا اور اس کا اثر تیرے تک پہنچ جائے گا ۔ چونکہ دل سے دل کو راہ ہوتی ہے میں تجھے غمزدہ دیکھنا نہیں چاہتا ۔

غزل ۴۵

غافل ، بہ وہمِ ناز خود آرا ہے ، ورنہ یاں　　بے شانۂ صبا نہیں طُرّہ گیاہ کا

معنی ۔ خود آرا ، خود پسند ، فخر و غرور کرنے والے ۔ بے شانۂ صبا ، بغیر لطفِ الٰہی ۔
طرہ گیاہ ، گھاس کا تنکا

مطلب ۔ فرماتے ہیں اہلِ دُنیا حقیقت سے ناواقف ہیں ۔ اپنے کئے پر غرور کرتے رہتے ہیں ۔ حالانکہ بغیر حکمِ الٰہی گھانس کا سرا بھی نہیں ہلتا ۔ شانۂ صبا کو لطفِ حکمِ الٰہی سے تشبیہ دی ہے ۔

بزمِ قدح سے عیشِ تمنا نہ رکھ کہ رنگ　　صیدِ زِ دام جستہ ہے اس دام گاہ کا

معنی ۔ بزمِ قدح ۔ بزمِ شراب ۔ صیدِ زدام جستہ ، وہ شکار جو جال میں پھنس کر نکل گیا ہو ۔ دام گاہ ، مراد دُنیا
مطلب ۔ فرماتے ہیں بزمِ شراب سے عیشِ تمنا نہ رکھ چونکہ یہ رنگ تیرے چہرے سے جلد چلا جائیگا جیسے

شکار جال میں پھنس کر نکل بھاگتا ہے۔ مطلب، یہ کہ دُنیا کی ہر لذت عارضی و ناپائیدار ہے یہاں کی کسی چیز کو دوام نہیں ہے۔ اس لئے دُنیا کے عیش و آرام گھاٹے کا سودا ہیں۔ دام گاہ کو بزم قدح سے تشبیہ دی ہے۔

رحمت اگر قبول کرے کیا بعید ہے   شرمندگی سے عُذر نہ کرنا گناہ کا

مطلب۔ فرماتے ہیں گناہ کا عذر کرنا آسان بات ہے۔ مگر بوجہ شرم و ندامت گنہ گار عذر نہیں کرتا مگر امید کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ جو رحیم و کریم ہے وہ خود ہی رجوع بر جوت ہوگا۔

مقتل کو کس نشاط سے جاتا ہوں میں کہ ہے   پُرگُل خیالِ زخم سے دامن نگاہ کا

مطلب۔ فرماتے ہیں میں شوق شہادت میں قتل گاہ کو خوشی خوشی جاتا ہوں جیسے کوئی دولہا شادی کرنے جاتا ہے۔ میں نے اپنے دامنِ نگاہ کو خیالی زخموں سے خوب بھر لیا ہے۔

جاں درہوائے یک نگہِ گرم ہے اسدؔ   پروانہ ہے وکیل، ترے داد خواہ کا

مطلب۔ فرماتے ہیں اسد جان دینے کی شوق و آرزو رکھتا ہے تاکہ تو نگاہِ کرم سے اس کی جان لے لے۔ اسی لئے پروانہ کو وکیل بنا کر تیری بزم میں بھیجتا ہوں۔ تاکہ تو دیکھے کہ پروانہ شمع پر جل کر کس طرح جان دے رہا ہے۔

حسنِ عالم سوز کے دُنیا میں دیوانے بہت
شمع روشن ہو تو آجاتے ہیں پروانے بہت

مخمورؔ دہلوی

غزل ۴۶

جَور سے باز آئے پر، باز آئیں کیا   کہتے ہیں "ہم تجھ کو منہ دکھلائیں کیا"

مطلب۔ فرماتے ہیں وہ جور سے کب باز آنے والے ہیں۔ کہتے ہیں کہ ہم باز آگئے۔ مگر ساتھ ہی یہ بھی کہہ رہے ہیں کہ اب ہم شرمندگی کی وجہ سے تجھ کو مُنہ نہ دکھائیں گے۔ عاشق سے مُنہ چھپانا ظُلم نہیں تو اور کیا ہے۔

رات دن گردش میں ہیں سات آسماں   ہو رہے گا کچھ نہ کچھ۔ گھبرائیں کیا

مطلب۔ توکل کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ جب کسی شئے کو قیام ہی نہیں۔ رات دن زمین و آسمان گردش کر رہے ہیں تو ہمارے حالات بھی یکساں نہیں رہیں گے۔ لہٰذا گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں۔

لاگ ہو تو اُس کو ہم سمجھیں، لگاؤ   جب نہ ہو کچھ بھی تو دھوکا کھائیں کیا

معنی۔ لاگ معنی تعلق، دشمنی، بیر۔

مطلب۔ فرماتے ہیں اگر ہمارے ساتھ کسی قسم کا بھی تعلق ہوتا تو ہم اس تعلق کو اُنس سمجھ لیتے یا دشمنی سمجھ لیتے یا بیر سمجھ لیتے۔ جب کسی قسم کا تعلق ہی نہیں تو پھر ہم کیسے دھوکہ کھا سکتے ہیں۔

ہو لئے کیوں نامہ بَر کے ساتھ، ساتھ   یارب! اپنے خط کو ہم پہنچائیں کیا

مطلب۔ فرماتے ہیں اشتیاقِ جواب کی خاطر نامہ بر کے ساتھ ہی چل پڑے۔ جب ہوش آیا تو کہتے ہیں یہ تو شرم کی بات ہے کہ ہم اپنا خط آپ ہی پہنچائیں۔ دوسرے مصرعہ میں تعجب کا اظہار لطف سے خالی نہیں۔

موجِ خوں سر سے گزر ہی کیوں نہ جائے ۔۔۔ آستانِ یار سے اُٹھ جائیں کیا

مطلب: فرماتے ہیں ہمیں چاہے جس قدر تکلیف پہنچے چاہے جتنے ستم ہوں۔ ہم عاشق صادق کی طرح آستانِ یار کو ہرگز نہ چھوڑیں گے۔

عمر بھر دیکھا کیئے مرنے کی راہ ۔۔۔ مر گئے، پر دیکھئے دکھلائیں کیا

مطلب۔ فرماتے ہیں عمر بھر مرنے کی راہ دیکھتے رہے اب خدا خدا کر کے ہم مرے ہیں۔ دیکھئے ہمارے اعمال ہمیں کیا نظارہ دکھلاتے ہیں۔

پوچھتے ہیں وہ کہ غالبؔ کون ہے ۔۔۔ کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا

مطلب۔ فرماتے ہیں وہ جاننا چاہتے ہیں کہ غالبؔ کون ہے ہم کیسے بتائیں کہ وہ ہی تمہارا عاشق ہے۔ دوسرے معنی یہ ہیں کہ وہ اچھی طرح جانتے ہیں لیکن پھر تجاہل عارفانہ سے پوچھتے ہیں۔ اور اگر غالبؔ کے معنی فتح پانے والا اپنے ہم عصروں پر سمجھا جائے۔ تو فرماتے ہیں کہ اس کا فیصلہ تو کوئی اور ہی کرے۔ ہم اپنے منہ میاں مٹھو کیسے بنیں۔

غزل ۴۷

لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی ۔۔۔ چمن زنگار ہے آئینۂ بادِ بہاری کا

مطلب:۔ فرماتے ہیں لطافت بغیر کثافت کے کوئی لطف نہیں دیتی۔ بھوک ہو تو کھانا اچھا لگتا ہے۔ پیاس ہو تو پانی اچھا لگتا ہے۔ تھکے ہونے کو آرام میں مزہ آتا ہے۔ یعنی بادِ بہاری کا جلوہ چمن کے ذریعہ نمودار ہوتا ہے۔ گویا چمن اپنی سبزی کے اعتبار سے آئینہ بادِ بہاری کا زنگار بن جاتا ہے۔

حریفِ جوششِ دریا نہیں خودداریٔ ساحل   جہاں ساقی ہو تُو باطل ہے دعویٰ پارسائی کا

مطلب ۔ فرماتے ہیں دریا جب طغیانی پر آتا ہے تو خودداریٔ ساحل کام نہیں آسکتی اور ساحل اپنے آپ کو محفوظ نہیں کرسکتا ۔ اسی طرح اگر تو ساقی ہے تو پھر شراب پینے سے پارسا بھی انکار نہیں کرسکتا ۔ یہ شعر حقیقت و مجاز دونوں پر یکساں اطلاق پاتا ہے ۔ بلکہ میرے نزدیک حقیقت پر زیادہ "جہاں ساقی ہو تو" کے الفاظ صاف بتا رہے ہیں کہ یہاں ساقیٔ ازل ہی مراد ہے ۔

غزل ۴۸

عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا   درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا

مطلب ۔ فرماتے ہیں جب درد حد سے گزر جائے گا تو فنا ہو جائیں گے اور یہی مقصود ہے جیسے قطرہ دریا میں مدغم ہو کر دریا بن جاتا ہے پس درد کا حد سے گزرنا بھی درد کی دوا ہے جس کے نتیجہ میں موت کا فرشتہ ساری تکالیف سے نجات دے دیتا ہے ۔ حضرت امیر مینائیؒ کیا خوب فرماتے ہیں

؎ مدت سے امیرؔ اُس سے ملنے کی تمنا تھی
آج اُس نے بلایا ہے لینے کو قضا آئی

تجھ سے قسمت میں مری صورتِ قفلِ ابجد   تھا لکھا بات کے بنتے ہی جدا ہو جانا

معنی ۔ قفلِ ابجد ۔ حروف آپس میں ملیں تو تالا کھل جائے ورنہ نہیں ۔ جیسے تجوری یعنی سیف میں ہوتے ہیں ۔
مطلب ۔ فرماتے ہیں میرا نوشتۂ قسمت قفلِ ابجد کی طرح واقع ہوا ہے یعنی جب تجھ سے تعلق و ربط کی صورت بنی تو پھر فوراً جدائی کی صورت پیدا ہو گئی ۔

دل ہُوا کشمکشِ چارۂ زحمت میں تمام   مِٹ گیا گھسنے میں اس عُقدہ کا وا ہو جانا

مطلب ۔ فرماتے ہیں علاج دل کرنے میں جن مصائب کا سامنا کرنا پڑا ۔ تدبیروں میں پھنسے رہے اسی

زحمت میں دل تمام ہو گیا یعنی ختم ہو گیا جس طرح کسی گرہ کو کھولتے کھولتے ڈورا بھی گھس جاتا ہے۔ اور وہ مثل صادق آتی ہے کہ نہ بانس رہا نہ بانسری۔

اب جفا سے بھی ہیں محروم ہم، اللہ اللہ! اس قدر دشمنِ اربابِ وفا ہو جانا

مطلب۔ بہت پیارا شعر ہے۔ فرماتے ہیں ایک زمانہ تھا کہ ہم پر طرح طرح کے لطف و عنایات تھیں اور اب یہ وقت آگیا کہ ہم سے جفا بھی کرنا انہیں گوارا نہیں۔ افسوس ہے کہ وہ ہم جیسے وفاداروں کے اس قدر دشمن ہو گئے کہ وفا کرنا تو دور کی بات ہے انہیں جفا کرنے سے بھی گریز ہے یعنی کسی قسم کا تعلق انہیں منظور نہیں۔

ضعف سے گریہ مبدل بہ دمِ سرد ہوا باور آیا ہمیں پانی کا ہوا ہو جانا

مطلب۔ فرماتے ہیں ہم میں کمزوری کی وجہ سے گریہ وزاری کی طاقت بھی نہ رہی اور سوائے سرد سرد آہیں بھرنے کے اور کچھ نہ کر سکے۔ اب ہمیں یقین ہوا کہ پانی بھاپ بن کر اڑ جاتا ہے۔

دل سے مٹنا تری انگشتِ حنائی کا خیال ہو گیا، گوشت سے ناخن کا جدا ہو جانا

مطلب۔ فرماتے ہیں بھلا کہیں گوشت سے ناخن بھی جدا ہوتے ہیں۔ ہمارے دل سے تیری حنا آلودہ انگلی کا خیال کیسے مٹ سکتا ہے۔

ہے مجھے ابرِ بہاری کا برس کر کھلنا روتے روتے غمِ فرقت میں فنا ہو جانا

مطلب۔ فرماتے ہیں جس طرح موسم بہار میں بادل برس کر چھٹ جاتے ہیں تو مطلع صاف ہو جاتا ہے اسی طرح میں بھی غمِ فرقت میں روتے روتے فنا ہو جاؤں گا۔

گر نہیں نکہتِ گل کو ترے کوچے کی ہوس کیوں ہے گردِ رہِ جولانِ صبا ہو جانا

مطلب ۔ فرماتے ہیں اگر بوئے گل کو ترے کوچے کی ہوس نہیں ہے تو یہ کیوں بادِ صبا کے ساتھ ساتھ چکر کاٹتی ہے ۔

تا کہ تجھ پر کھلے اعجازِ ہوائے صیقل   دیکھ برسات میں سبز آئینے کا ہو جانا

مطلب ۔ فرماتے ہیں موسم بہار کی ہوا سے فرحت و انبساط حاصل ہوتا ہے۔ ہر چیز متاثر ہو جاتی ہے حتیٰ کہ فولادی آئینہ بھی زنگار سے سبز ہو جاتا ہے۔ لہٰذا تجھے موسم بہار کے اعجاز کا قائل ہو جانا چاہیئے۔

بخشے ہے جلوۂ گل ذوقِ تماشا غالبؔ   چشم کو چاہیئے ہر رنگ میں وا ہو جانا

مطلب ۔ فرماتے ہیں اے غالب رنگ برنگ کے پھول جب اپنی بہار دکھاتے تو ان کو دیکھ کر دل بہلانے کا ذوق بڑھ جاتا ہے۔ لہٰذا چشمِ انسان کو چاہیے کہ وہ ہر رنگ میں کھلی رہے حقیقت اور مجاز دونوں کے مزے لوٹے۔

اداؤ ناز کی یادیں لگے سینہ سے ؎ نگاہِ شوق مری کب سے وا ہے کیا کہیئے (شارح)

ب

غزل ۴۹

پھر ہوا وقت، کہ ہو بال کُشا موجِ شراب   دے بطِ مے کو دل و دستِ شنا موجِ شراب

معنی ۔ شنا ، پانی میں تیرنا ۔ بال ۔ پرندوں کے پر ۔ بطِ مے ، شراب کی صراحی ۔

مطلب ۔ فرماتے ہیں کہ وقت ہو گیا ہے کہ موجِ شراب اُڑنے کے لئے اپنے بازو کھولے اور بطِ مے کو تیرائی رکھنے والا دل عطا کرے ۔ مطلب یہ ہے کہ موسم بہار آ گیا ہے اور عیش کا زمانہ ہے ۔

پوچھ مت وجہ سیہ مستی اربابِ چمن   سایۂ تاک میں ہوتی ہے ہوا موجِ شراب

معنی - اربابِ چمن، درختانِ چمن - موجِ شراب، ہونا، نشاط انگیز ہونا۔ تاک، انگور کی بیل۔ بے ہستی۔ بے ہوش۔

مطلب - فرماتے ہیں تاک کے سایہ میں ہوا بے حد نشاط انگیز ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے اربابِ چمن مست ہیں اور خوب جھوم رہے ہیں۔

جو ہُوا غرقۂ مے بختِ رسا رکھتا ہے　　سر سے گزرے پہ بھی ہے بالِ ہُما موجِ شراب

مطلب - فرماتے ہیں جس نے اپنے آپ کو شراب میں غرق کر لیا اور ہوش و حواس کھو بیٹھا تو وہ بادشاہی کا درجہ حاصل کر لیتا ہے۔ یعنی جیسے ان کے سر سے بالِ ہما گذر گیا اور وہ بادشاہ بن گئے۔ [illegible]

[illegible]

ہے یہ برسات وہ موسم کہ عجب کیا ہے اگر　　موجِ ہستی کو کرے فیضِ ہوا موجِ شراب

مطلب - فرماتے ہیں برسات کے موسم میں زمینوں میں بھی سبزہ اُگ آتا ہے۔ کیا عجب ہے کہ بادِ بہاری موجِ ہستی کو بھی فیضیاب کرے اور ہماری طبیعتوں میں نئے نئے جوش اور ولولے پیدا ہوں اور بشاشت کی لہریں دوڑ جائیں۔

چار موج اُٹھتی ہیں طوفانِ طرب سے ہر سو　　موجِ گل، موجِ شفق، موجِ صبا، موجِ شراب

مطلب - فرماتے ہیں جوشِ طرب طوفان خیز ہے جس میں یہ چار موجیں اپنا اپنا طوفان بپا کر رہی ہیں۔ موجِ گل، موجِ شفق، موجِ صبا اور موجِ شراب۔

جس قدر رُوح نباتی ہے جگر تشنۂ ناز　　دے ہے تسکیں بدمِ آبِ بقا موجِ شراب

مطلب - فرماتے ہیں جس طرح بارش درختوں میں قوتِ نشو و نما کو بڑھاتی ہے اسی طرح موجِ شراب مے خوروں کے دل و دماغ میں آرزوؤں اور تمناؤں کا جوش لے آتی ہے۔

بس کہ دوڑے ہے رگِ تاک میں خوں ہو ہو کر
شہپرِ رنگ سے ہے بال کُشا موجِ شراب

مطلب۔ فرماتے ہیں انگور کی بیلوں میں عرقِ انگور اسی طرح دوڑتا ہے جیسے انسان کے جسم میں خون گردش کرتا ہے۔ اور انسان کا چہرہ گل رنگ نظر آتا ہے۔ اسی طرح انگور کی بیلیں سبز و شاداب ہیں۔ یعنی سبزی و شادابی کو رنگینی پرواز حاصل ہوئی ہے۔

موجۂ گُل سے چراغاں ہے گزرگاہِ خیال
ہے تصور میں زبس جلوہ نما موجِ شراب

مطلب۔ فرماتے ہیں رنگ برنگ کے جو پھول کھلے ہیں انہوں نے ہماری سوچ سمجھ کی گزرگاہوں میں چراغاں کر دیا ہے۔ نئے نئے خیال نئے نئے مضمون دماغ میں آتے ہیں اور یہ سب اس وجہ سے ہے کہ ہمارے خیال میں موجِ شراب بس گئی ہے۔

نشے کے پردے میں ہے محوِ تماشائے دماغ
بس کہ رکھتی ہے سرِ نشو و نما موجِ شراب

مطلب۔ فرماتے ہیں موجِ شراب نشہ کے پردے میں تماشائے دماغ میں محو رہتی ہے اور یہ اس وجہ سے ہے کہ موجِ شراب میں ترقی خیال پیدا کرنے کا مادہ پوشیدہ ہے۔

ایک عالم پہ ہیں طوفانیٔ کیفیتِ فصل
موجۂ سبزۂ نوخیز سے تا موجِ شراب

مطلب۔ فرماتے ہیں کیفیتِ فصل بادِ بہاری اور کیفیت موجِ شراب کا تمام عالم میں اثر طوفان کی طرح پھیل جاتا ہے۔ یہاں تک کہ نئے اُگے ہوئے سبزہ پر بھی رونق آجاتی ہے اور شراب کا نشہ بھی دو آتشہ ہو جاتا ہے۔

شرحِ ہنگامۂ ہستی ہے زہے موسمِ گُل
رہبرِ قطرہ بہ دریا ہے خوشا موجِ شراب

مطلب۔ فرماتے ہیں کہ موسمِ بہار میں زندگی کے تمام مشاغل میں ایک ہنگامہ کی سی کیفیت پیدا ہو جاتی

ہے اور شراب کا نشہ اتنا تیز ہو جاتا ہے کہ پینے والے کی طبیعت میں بھی اُبال آ جاتا ہے اور وہ اپنے اندر دریا کی سی طغیانی محسوس کرنے لگتا ہے ۔

ہوش اُڑتے ہیں مرے جلوۂ گُل دیکھ اسدؔ　　　　پھر ہُوا وقت اکہ ہو بال کُشا موجِ شراب

مطلب ۔ فرماتے ہیں اے اسدؔ جلوۂ گل دیکھ کر میرے ہوش اُڑنے لگے ہیں چونکہ وہ وقت آ رہا ہے کہ موجِ شراب اپنے بازوؤں کو کھول کر ہواہیں اُڑنے لگے اور ہر طرف شراب ہی کے دَور چلتے نظر آئیں ۔

ت

غزل ۵۰

افسوس، کہ دیداں کا کیا رزق فلک نے　　　　جن لوگوں کی تھی درخورِ عقدِ گہر انگشت

مطلب ۔ فرماتے ہیں افسوس ہے کہ جن لوگوں کی انگلیاں موتیوں کے چھلے پہنے ہوئے تھے ان کو مرنے کے بعد کیڑوں کا رزق بنا دیا ہے ۔

کافی ہے نشانی تری چھلے کا نہ دینا　　　　خالی مجھے دکھلا کے بوقتِ سفر انگشت

مطلب ۔ فرماتے ہیں کہ محبوب نے بوقتِ سفر چھلّہ بطور نشانی دینے کی بجائے مجھے صرف اپنی انگلی کا اشارہ کر دیا جو میرے لئے چھلّے سے زیادہ یادگار رہے گا ۔

لکھتا ہُوں اسدؔ سوزشِ دل سے سخنِ گرم　　　　تا رکھ نہ سکے کوئی مرے حرف پر انگشت

معنی ۔ حرف پر انگلی رکھنا ۔ کلام میں عیب جوئی کرنا ۔ سخن گرم ۔ تند و تیز کلام

مطلب ۔ فرماتے ہیں ہیں جلے دل سے ایسے تند و تیز اشعار کہتا ہوں کہ کوئی ان میں عیب نہیں نکال سکتا ۔ اور اگر کسی حرف پر انگلی رکھے گا تو وہ گرمی کلام سے جل جائے گا

غزل ۵۱

رہا گر کوئی تا قیامت سلامت   پھر اک روز مرنا ہے حضرت سلامت

مطلب۔ فرماتے ہیں مرنا لازمی ہے۔ اگر کوئی شخص قیامت تک بھی زندہ رہے یا لمبی عمر پائے تو پھر بھی موت یقینی ہے۔

جگر کو مرے عشقِ خوں نابہ مشرب   لکھے ہے خداوندِ نعمت سلامت

مطلب۔ فرماتے ہیں عشق کی خوراک خون ہے۔ مرے جگر کا خون پی کر عشق پلا ہے۔ اسی لئے اس نے میرے جگر کو خداوند نعمت کا خطاب دے کر سلامتی کی دعا دی ہے۔

علی الرغم دشمن شہیدِ وفا ہوں   مُبارک مبارک۔ سلامت سلامت

معنی۔ علی الرغم۔ برعکس، برخلاف

مطلب۔ فرماتے ہیں مَیں بوالہوس عاشق نہیں ہوں بلکہ میرا مشرب شہیدِ وفا ہونا ہے اور یہ بڑے فخر کی بات ہے جو مجھے مبارک ہو۔

نہیں گر بسروبرگِ ادراکِ معنی   تماشائے نیرنگِ صورت سلامت

مطلب۔ فرماتے ہیں۔ اگر تمہاری توفیق درسائی ادراک کے سروسامان تک نہیں ہے۔ نہ سہی۔ نیرنگئ صورت کا نی وشانی ہے۔ ظاہر کا دیکھنا ہی کافی ہوگا۔ اثر موثر کا پتہ دیتا ہے مخلوق خالق کا۔ عشقِ مجازی سے عشقِ حقیقی پیدا ہونا چاہیئے۔

غزل ۵۲

مُند گئیں کھولتے ہی کھولتے آنکھیں غالب — یار لائے مری بالیں پہ اُسے پر کس وقت!

مطلب ۔ فرماتے ہیں ۔ میرے یار میرے محبوب کو اس وقت میری بالیں پہ لائے جب میں نزع کی حالت میں تھا ۔ آنکھیں کھولتے ہی کھولتے بند ہوگئیں مطلب یہ ہے کہ دوستوں نے ہمدردی تو کی لیکن بہت تاخیر سے ۔

غزل ۵۳

آمدِ خط سے ہوا ہے سرد جو بازارِ دوست — دودِ شمعِ کُشتہ تھا شاید خطِ رخسارِ دوست

مطلب ۔ فرماتے ہیں رخسار دوست پر سبزہ آنے کی وجہ سے گرمیٔ حسن کی سرد بازاری ہوگئی ہے ۔ اس کا مطلب ہے کہ خطِ رخسار دوست بجھی ہوئی شمع کا دھواں تھا جس کے ظاہر ہونے سے حسن کے بازار میں اندھیرا چھا گیا ۔

اے دلِ ناعاقبت اندیش ضبطِ شوق کر — کون لاسکتا ہے تابِ جلوۂ دیدارِ دوست

مطلب ۔ فرماتے ہیں اے میرے دل ناعاقبت اندیش مت بن ۔ ضبط شوق سے کام لے ۔ جلوۂ دیدار دوست کی برداشت کس میں ہے ۔ کیا تو بھول گیا کہ موسیٰ کے ساتھ طور پر کیا ہوا تھا ۔

خانہ ویراں سازیٔ حیرت تماشا کیجیے — صورتِ نقشِ قدم ہوں رفتۂ رفتارِ دوست

مطلب ۔ فرماتے ہیں حیرت کی خانہ ویرانی کو ملاحظہ کیجیۓ ۔ ہم حیرت میں پڑ کر اپنے گھر کو بھول بیٹھے ہیں اور ہمارا گھر ہمارے بغیر ویران ہے ۔ ہم نے دوست کی رفتار کا تماشا دیکھا تھا پھر ہم اسی کے

ہو گئے اور خود کو بھول گئے یعنی نقشِ قدم کی مانند بے جان ہو گئے ۔

عشق میں بیدادِ رشکِ غیر نے مارا مجھے　　　　کشتۂ دشمن ہوں آخر گرچہ تھا بیمارِ دوست

مطلب ۔ فرماتے ہیں ۔ دوست کی فرقت نے مجھے بیمار کر دیا تھا لیکن میں زندہ تھا ۔ لیکن رشکِ غیر کی بیداد نے مجھے مار ڈالا ۔

چشمِ ما روشن کہ اُس بے درد کا دل شاد ہے　　　　دیدۂ پُرخوں ہمارا ، ساغرِ سرشارِ دوست ،

مطلب ۔ فرماتے ہیں باوجودیکہ ہم خون کے آنسو رو رہے ہیں لیکن اس وجہ سے اُس بیدرد کا دل ہمارے رونے سے شاد ہے ۔ اس لئے ہم بھی یہ کہتے ہیں کہ چشمِ ما روشن یعنی ہم بھی اپنے خون کے آنسو بہانے پر خوش ہیں ۔ ہمارا دیدۂ پُرخون ، ساغرِ سرشارِ دوست ہے اور محبوب کے خوش ہونے سے ہم بھی خوش ہیں ۔

غیر یوں کرتا ہے میری پرسش اسکے ہجر میں　　　　بے تکلف دوست ہو جیسے کوئی غم خوارِ دوست

مطلب ۔ فرماتے ہیں غیر اس طرح سے میری پرسش کرتا ہے جیسے وہ بے تکلف دوست ہو یا حقیقی غم خوار ۔ حالانکہ وہ دشمنی کے ساتھ شیخی بھی بگھارتا ہے اور منافقت بھی کرتا ہے ۔

تاکہ میں جانوں کہ ہے اس کی رسائی واں تلک　　　　مجھ کو دیتا ہے پیامِ وعدۂ دیدارِ دوست

مطلب ۔ فرماتے ہیں جس غیر کا میں اوپر ذکر کر چکا ہوں ۔ وہ یہ بھی جتانا چاہتا ہے کہ اُس کی رسائی میرے محبوب تک ہے اور وہ پیامِ وعدۂ دیدارِ دوست بھی دیتا ہے ۔

جب کہ میں کرتا ہوں اپنا شکوۂ ضعفِ دماغ　　　　سر کرے ہے وہ حدیثِ زلفِ عنبر بارِ دوست

مطلب ۔ فرماتے ہیں اس کی شیخیاں سن کر جب میں ضعفِ دماغ کا عذر کرتا ہوں یعنی یہ کہتا ہوں کہ

یہ تیری فضول شیخیاں ہیں۔ بند کر میرا سر کیوں کھاتا ہے۔ تو وہ فوراً زلف عنبر یار دوست کا بیان شروع کر دیتا ہے۔

چپکے چپکے مجھ کو روتے دیکھ پاتا ہے اگر　　　ہنس کے کرتا ہے بیانِ شوخیِ گفتارِ دوست

مطلب۔ فرماتے ہیں مجھے چپکے چپکے سے روتے دیکھ کر بیانِ شوخیِ گفتارِ دوست کرنے لگتا ہے یعنی مجھے ستانے کے لئے۔

مہربانی ہائے دشمن کی شکایت کیجیے　　　یا بیاں کیجیے سپاسِ لذتِ آزارِ دوست

مطلب۔ فرماتے ہیں دشمن کی دشمنی سے بھری ہوئی مہربانیوں کی شکایت کروں یا دوست کے جور و ستم کی تعریف کروں۔

یہ غزل اپنی مجھے جی سے پسند آتی ہے آپ　　　ہے ردیفِ شعر میں غالبؔ زبس تکرارِ دوست

مطلب۔ فرماتے ہیں اے غالب یہ غزل بہت پسند آتی ہے چونکہ اس ردیف میں دوست کی تکرار ہے۔

ج

غزل ۵۴

گلشن میں بند و بست برنگِ دگر ہے آج　　　قمری کا طوق حلقۂ بیرونِ در ہے آج

معنی۔ حلقۂ بیرونِ در۔ دروازے کی محراب

مطلب۔ فرماتے ہیں بہار کے آنے سے گلشن میں تبدیلی آگئی ہے اور اس تبدیلی کے اثر نے قمری کو بھی

طوق سے آزاد کر دیا ہے ۔

آتا ہے ایک پارۂ دل ہر فغاں کے ساتھ   تارِ نفس کمندِ شکارِ اثر ہے آج

مطلب ۔ فرماتے ہیں میری ہر آہ کے ساتھ میرے دل کا اک ٹکڑا باہر نکل آتا ہے اور اس آہ و زاری کی وجہ یہ ہے کہ تارِ نفس کی کمند نے اثر کو شکار کر لیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ میری آہ وزاری میں تاثیر پیدا ہو گئی ہے۔ اس واسطے مجھے اپنی آہوں پر بھروسہ ہو گیا ہے یا اُمید ہو گئی ہے ۔

غزل ۵۵

لو ہم مریضِ عشق کے تیمار دار ہیں   اچھا اگر نہ ہو تو مسیحا کا کیا علاج

مطلب ۔ فرماتے ہیں معشوق کا یہ الزام ہے چونکہ مریضِ عشق کی تیمار داری، دیکھ بھال نہیں ہو رہی ہے اس وجہ سے مریضِ عشق کی حالت روز بروز بگڑ رہی ہے ۔ مرزا صاحب فرماتے ہیں۔ ہم مریضِ عشق کے تیماردار بن جاتے ہیں۔ لیکن یہ بات بھی طے ہونی چاہیئے کہ اگر دوائے وصل سے بھی مریض اچھا نہ ہو تو پھر مسیحا کی کیا سزا ہوگی ۔ چونکہ [illegible] دعویٰ ہے کہ مریضِ عشق وصل سے بھی اچھا نہ ہوگا جبکہ معشوق کا منصب ہے کہ نہیں اگر صحیح طرح تیمارداری ہو تو مریض [illegible] ۔

اے عافیت کنارہ کر اے انتظام چل   سیلابِ گریہ درپئے دیوار و در ہے آج

مطلب ۔ فرماتے ہیں۔ اے عشق و آرام کے زمانے یہاں سے جا اور اے انتظام اب تیرا بھی یہاں ٹھکانہ نہ ہوگا چونکہ میرے اشکوں کا طوفان آرہا ہے جو در و دیوار کو بہا کر لے جائے گا ۔

سارا جہاں ہے ظلم و ستم کی لپیٹ میں
کیسے نہ لرزے، دل مرا، ٹکڑے جگر نہ ہو

(شارح)

ج

غزل ۵۶

نفس نہ انجمنِ آرزو سے باہر کھینچ　　　اگر شراب نہیں انتظارِ ساغر کھینچ

مطلب ۔ فرماتے ہیں اے میرے نفس مجھے آرزو کی بزم سے باہر نہ کھینچ یعنی ناکامی و نامرادی کی محفل میں نہ لے جا۔ اگر شراب نہیں ملتی تو انتظارِ ساغر میں مشغول ہو جا۔ مطلب یہ ہے کہ ناامیدی بری بلا ہے اس سے بچنا چاہیے اور اُمید کا دامن کسی حالت میں بھی نہ چھوڑنا چاہیئے ۔ لاتقنطو من رحمۃ اللہ

کمالِ گرمیِ سعیِ تلاشِ دید نہ پُوچھ　　　برنگِ خار مرے آئنے سے جوہر کھینچ

مطلب ۔ فرماتے ہیں میری کوششوں کی گرمیِ کمال کا حال مت پوچھ وہ تو اہلِ نظر اور اہلِ کمال کی جستجو میں تھک گئی ۔ بے حد تکالیف اٹھائی ہیں اب تو میرا دل چاہتا ہے کہ کوئی میرے دل سے میرا جوہر آئینہ خار کی طرح سے باہر نکال کر پھینک دے ۔

تجھے بہانۂ راحت ہے انتظار اے دل　　　کیا ہے کس نے اشارہ کہ نازِ بستر کھینچ ؟

مطلب ۔ فرماتے ہیں بستر پر لیٹ کر محبوب کا یا نیند کا انتظار کھینچنا راحت طلبی کے سوا اور کیا ہے ۔ یہ نامناسب ہے کہ عاشق بستر پر لیٹ کر بستر کے ناز اُٹھائے اسے چاہیئے کہ بجائے راحت طلبی کے انتظارِ محبوب میں غرقاب رہے ۔

تری طرف ہے بہ حسرت نظارۂ نرگس　　　بکوریِ دل و چشمِ رقیب ساغر کھینچ

مطلب ۔ فرماتے ہیں نرگس بہ نگاہِ حسرت تیری طرف دیکھ رہی ہے اور مجھے یہ گوارا نہیں ہے کہ تجھے

کوئی دیکھے مجھے احساسِ رقابت گھیر لیتا ہے مگر شکر ہے کہ نرگس دل کی بھی اور آنکھ کی بھی اندھی ہے اور اس خوشی کے موقع پر شراب نوشی سے دل کو خوش کرنا چاہیئے۔

بہ نیمِ غمزہ ادا کر حقِ ودیعتِ ناز
نیامِ پردۂ زخمِ جگر سے خنجر کھینچ

فرماتے ہیں۔ اے میرے معشوق تیرے ادا و ناز اللہ تعالیٰ کی عطا ہیں لہٰذا اس (عطا) امانت کا حق بہ نیمِ غمزہ سے ادا کر اور اگر تو ایسے طور سے کریگا تو عاشق فوراً جان دے دیگا جیسے وار کرنے کے بعد خنجر زخم سے نہ نکالا جائے تو بسمل مر جائے گا لیکن اگر نکال لیں تو مجروح کے اچھا ہونے کا امکان ہے۔

مرے قدح میں ہے صہبائے آتشِ پنہاں
بروئے سفرہ کبابِ دلِ سمندر کھینچ

مطلب۔ فرماتے ہیں میرے پیالے میں شرابِ عشق چھپی ہوئی ہے جس کی گرمی آتشِ سیال سے بہت زیادہ ہے لہٰذا اس کی مناسبت سے کباب بھی دلِ سمندر کا ہونا چاہیئے۔ (سمندر ایک کیڑے کا نام ہے جو آگ میں رہتا ہے)۔

د

غزل ۵۷

حسن، غمزے کی کشاکش سے چھٹا میرے بعد
بارے آرام سے ہیں اہلِ جفا میرے بعد

مطلب۔ فرماتے ہیں۔ حسن ناز و انداز کی کشاکش سے میرے مرنے کے بعد چھوٹ گیا۔ جب تک میں زندہ تھا حسینانِ جہاں کو مجھے فریفتہ کرنے کے لئے ہر قسم کے ناز و ادا سے کام لینا پڑتا تھا۔ اب وہ سب آرام سے ہیں۔

منصبِ شیفتگی کے کوئی قابل نہ رہا
ہوئی معزولیٔ انداز و ادا میرے بعد

مطلب۔ فرماتے ہیں محبوب کے انداز و ادا پر شیفتہ اور نثار ہونے والا مجھ جیسا عاشق جب دنیا سے رخصت ہو گیا تو پھر میرے محبوب نے بھی ناز و ادا کے تیر چلانے بند کر دیئے۔

شمع بجھتی ہے تو اس میں سے دھواں اٹھتا ہے
شعلۂ عشق سیہ پوش ہوا میرے بعد

مطلب ۔ فرماتے ہیں شمع کے بجھتے وقت جو شعلہ بجھ کر دھواں بن جاتا ہے ۔ وہ دھواں نہیں ہوتا بلکہ شمع کے کشتہ ہو جانے پر سیہ پوش ہو کر شمع کا ماتم کرتا ہے اور اسی طرح عشق کا شعلہ میرے مرجانے کے بعد غم میں سیہ پوش ہو گیا ہے

خوں ہے دل خاک میں احوالِ بتاں پر یعنی ۔۔۔ اُن کے ناخن ہوئے محتاجِ حنا میرے بعد

مطلب ۔ فرماتے ہیں خاکِ قبر میں میرا دل خون ہو گیا ۔ اس غم میں کہ محبوبوں کے ناخن محتاج حنا ہو گئے ۔ جب میں زندہ تھا تو وہ جور و ستم کرتے تھے ۔ میرا دل نوچ کر اپنے ناخنوں کو رنگ دار کر لیا کرتے تھے ۔

درخورِ عرض نہیں ، جوہرِ بیداد کو ، جا ۔۔۔ نگہِ ناز ہے سرمے سے خفا میرے بعد

مطلب ۔ فرماتے ہیں جوہر بیداد کے ظاہر کرنے کا موقع میرے مرنے کے بعد نہیں رہا ۔ اسی لئے نگہ ناز یعنی حسینوں نے بناؤ سنگھار چھوڑ دیا ہے اور سرمہ لگانے سے بھی بے نیاز ہو گئے ہیں ۔

ہے جنوں اہلِ جنوں کیلئے آغوشِ وداع ۔۔۔ چاک ہوتا ہے گریباں سے جدا میرے بعد

مطلب ۔ فرماتے ہیں دیوانے جو اپنے گریبانوں کو چاک کیا کرتے تھے ۔ اُن سے چاک گریباں جدا ہو گیا ہے یعنی میرے مرنے کے بعد کوئی گریباں چاک نہیں کرتا ۔ اب جنوں اہل جنوں سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہو گیا

کون ہوتا ہے حریفِ مئے مرد افگنِ عشق ۔۔۔ ہے مکرّر لبِ ساقی پہ صلا میرے بعد

مطلب ۔ عشق ایک ایسی شراب ہے جو قوت ارادی رکھنے والوں کو بھی اپنا متوالا بنا لیتی ہے اس کا متحمل ہر کس و ناکس نہیں ہوتا ۔ اس لئے عاشقِ صادق کے مرنے کے بعد ساقی بار بار اعلان کرتا ہے کہ ہے کوئی شرابِ حقیقی کا متحمل ہو سکے ۔ ؎

یہ رتبۂ بلند ملا جس کو مل گیا ۔۔۔ ہر مدعی کے واسطے دار و رسن کہاں

غم سے مرتا ہوں کہ اتنا نہیں دُنیا میں کوئی　　　　کہ کرے تعزیتِ مہر و وفا میرے بعد

مطلب ۔ فرماتے ہیں اس غم میں میری جان گھُل جاتی ہے کہ میرے مرجانے کے بعد کوئی ایسا نہیں جو مہر وفا کی تعزیت ہی کر سکے جو میرے ساتھ ہی قبر میں دفن ہو گئے ۔

آئے ہے بے کسیٔ عشق پہ رونا غالبؔ　　　　کس کے گھر جائے گا سیلابِ بلا میرے بعد

مطلب ۔ اے غالبؔ مجھے عشق کی بیکسی پر رونا آتا ہے کہ میرے مرجانے کے بعد اس کی میزبانی کون کرے گا اور یہ سیلاب بلا کس کے گھر جائے گا ۔

ر

غزل ۵۸

بلا سے ہیں، جو یہ پیشِ نظر در و دیوار　　　　نگاہِ شوق کو ہیں، بال و پر در و دیوار

مطلب ۔ فرماتے ہیں میرے سامنے جو در و دیوار ہیں یہ میری نگاہِ شوق کے درمیان حائل نہیں ہو سکے بلکہ جانے میں روک بنے ہوئے ہیں لیکن میری نگاہِ شوق کے لئے یہ میرے خیال اور میرے تصور کو بھی تقویت دے رہے ہیں اور میری نگاہِ شوق کے لئے بال و پر بن گئے ہیں جن کی مدد سے میری نگاہِ شوق محبوب کے حُسن کا نظارہ کر رہی ہے ۔

دفورِ اشک نے کاشانے کا کیا یہ رنگ　　　　کہ ہو گئے مرے دیوار و در، در و دیوار

مطلب ۔ فرماتے ہیں میرے جوشِ اشک نے میرے گھر کا بُرا حال کر دیا کہ دیوار جگہ جگہ سے گر کر دروازہ بن گئی ہے اور دیوار اینٹوں کا ملبہ ہو گئی ہے ۔

نہیں ہے سایہ کہ سُن کر نویدِ مقدمِ یار گئے ہیں چند قدم پیشتر در و دیوار

مطلب۔ فرماتے ہیں یہ سایۂ دیوار نہیں ہے جو کچھ آگے بڑھا ہوا نظر آرہا ہے بلکہ خود میرے در و دیوار چند قدم آگے بڑھ کر یار کا خیر مقدم کر رہے ہیں۔ کیونکہ در و دیوار کے کانوں نے بھی محبوب کے آنے کی خبر سُن لی تھی۔

ہوئی ہے کس قدر ارزانیٔ مۓ جلوہ کہ مست ہے ترے کوچے میں ہر در و دیوار

مطلب۔ فرماتے ہیں تیرا شرابِ جلوہ اس قدر سستا یعنی عام ہو گیا ہے کہ ترے کوچہ میں در و دیوار بھی شرابِ جلوہ سے مست ہو گئے ہیں۔

جو ہے تجھے سرِ سودائے انتظار تو، آ کہ ہیں دکانِ متاعِ نظر در و دیوار

مطلب۔ فرماتے ہیں کہ اے محبوب اگر تجھے انتظار کا سودا خریدنے کا خیال ہے تو میری طرف آ۔ اور دیکھ کہ میرے مکان کے در و دیوار تک متاعِ نظر کی دکان بنے ہوئے ہیں۔

ہجومِ گریہ کا سامان کب کیا میں نے؟ کہ گر پڑے نہ مرے پاؤں پر در و دیوار

مطلب۔ فرماتے ہیں جب بھی میں نے دل کھول کر رونے کا ارادہ کیا تو فوراً میرے گھر کے در و دیوار میرے پاؤں پر گر کر ملتجی ہوئے کہ اپنے ارادے سے باز آجاؤ ورنہ ہمارا حشر کیا ہوگا۔

وہ آرہا مرے ہمسائے میں تو سائے سے ہوئے فدا در و دیوار پر در و دیوار

مطلب۔ فرماتے ہیں میرا محبوب جب میرا پڑوسی بن گیا تو میرے در و دیوار کا سایہ اُس کے در و دیوار پر قربان ہو رہا ہے۔

نظر میں کھٹکے ہے بِن تیرے گھر کی آبادی　　ہمیشہ روتے ہیں ہم دیکھ کر در و دیوار

مطلب ۔ فرماتے ہیں تیرے فراق میں گھر کا آباد ہونا کھٹکتا ہے ۔ اس لئے ہم در و دیوار کو دیکھ کر ہمیشہ روتے رہتے ہیں ۔ اور تنہائی کا احساس کر کے گریہ وزاری پر مجبور ہو جاتے ہیں ۔

نہ پُوچھ بے خودیٔ عیشِ مقدمِ سیلاب　　کہ ناچتے ہیں پڑے سر بسر در و دیوار

مطلب ۔ فرماتے ہیں سیلاب کی آمد کی خوشی نے مجھے ہی بے خود نہیں کیا بلکہ میرے گھر کے در و دیوار بھی ناچ رہے ہیں اور سیلاب کو خوش آمدید کہنے کے لئے تیار ہیں ۔

نہ کہہ کسی سے کہ غالبؔ نہیں زمانے میں　　حریفِ رازِ محبت مگر در و دیوار

مطلب ۔ فرماتے ہیں رازِ محبت کو راز ہی رکھنا چاہیئے ۔ حتیٰ کہ در و دیوار سے بھی احتیاط لازم ہے کیونکہ وہ بھی کان رکھتے ہیں ۔ دوسرا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ غالبؔ اب اس جہان میں موجود نہیں تو در و دیوار سے کہہ کر اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرے تاکہ دشمنوں کو خوشی کے شادیانے بجانے کا موقع نہ ملے ۔

غزل ۵۹

گھر جب بنا لیا ترے در پر کہے بغیر　　جانے گا اب بھی تو نہ مرا گھر کہے بغیر

مطلب ۔ تیرا ہمیشہ یہ کہنا کہ ہم کیسے تیرے گھر آتے ہمیں تیرے گھر کا پتہ ہی نہیں ۔ مگر ہم نے تو اب تیری اجازت کے بغیر ہی تیرے در کو ہی اپنا گھر بنا لیا ہے ۔ کیا اب بھی تو نہ جانے گا کہ میرا گھر کہاں ہے اور وہی پرانی رٹ لگائے رکھے گا ۔

کہتے ہیں جب رہی نہ مجھے طاقتِ سخن　　"جانوں کسی کے دل کی میں کیونکر کہے بغیر؟"

مطلب۔ فرماتے ہیں کہ جب مجھ میں انتہائی نقاہت کے باعث بولنے کی طاقت نہ رہی تو میرا محبوب کہتا ہے کہ مجھے کسی کے دل کا حال کیونکر معلوم ہو جب تک کوئی خود ہی نہ بتائے۔

کام اُس سے آپڑا ہے کہ جس کا جہان میں　　لیوے نہ کوئی نام "ستمگر" کہے بغیر

مطلب۔ فرماتے ہیں ایسے ستم شعار سے واسطہ پڑا ہے جس کو ہر شخص ستمگر جانتا اور کہتا ہے۔ اب ایسے ستمگر سے کس طرح مطلب براری ہو سکتی ہے۔

جی میں ہی کچھ نہیں ہے ہمارے وگرنہ ہم　　سر جائے یا رہے نہ رہیں پر کہے بغیر

مطلب۔ فرماتے ہیں میرے دل میں کسی کے لئے کوئی بغض و عداوت نہیں ہے ہم صاف دل رکھتے ہیں اور کسی کے خلاف کچھ ہو تو ہم صاف گو ہیں۔ فوراً کہہ دیتے ہیں چاہے اس سے ہماری جان کو خطرہ ہی کیوں نہ ہو۔

چھوڑوں گا میں نہ اس بُتِ کافر کا پُوجنا　　چھوڑے نہ خلق گو مجھے کافر کہے بغیر

مطلب معنی صاف ہے جو شخص کسی بتِ کافر کو پوجے گا دُنیا اُسے ضرور کافر کہے گی۔

مقصد ہے ناز و غمزہ ولے گفتگو میں کام　　چلتا نہیں ہے دشنہ و خنجر کہے بغیر

مطلب۔ فرماتے ہیں دشنہ و خنجر سے میری مراد ناز و غمزہ ہے۔ یعنی محسوسات سے تشبیہ دیئے بغیر کام نہیں بنتا۔ ہر کس و ناکس کو کہاں سمجھ آئے گی۔

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو　　بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

مطلب اس شعر میں بھی مندرجہ بالا شعر ہی کا مضمون بیان کیا ہے۔ یہاں "بات" کا لفظ حذف کیا گیا ہے جس سے شعر کا حُسن دو بالا ہو گیا ہے۔ فرماتے ہیں اگر ہم اللہ تعالیٰ کے دیدار کے متعلق بھی بات کریں پھر بھی بادہ و ساغر کہنے کی ضرورت ہے۔ اردو شاعری کا ڈھنگ ہی اسی طرح سے ہے کہ استعارہ اور تشبیہہ کے بغیر کام نہیں چلتا۔

بہرا ہُوں میں تو چاہیئے دونا ہو التفات　　سُنتا نہیں ہوں بات مکرّر کہے بغیر

مطلب یہ شعر حسبِ حال ہے۔ غالبؔ میاں کا آخری حصّۂ عمر میں ثقلِ سماعت بہت زیادہ ہو گیا تھا۔ فرماتے ہیں اگر میں بہرا ہوں تو آپ کو چاہیئے کہ مجھ پر آپ کا لطف اور بڑھ جائے۔ اور آپ بلند آواز سے مجھ سے بات کریں۔

غالبؔ نہ کر حضور میں تو بار بار عرض　　ظاہر ہے تیرا حال سب اُن پر کہے بغیر

مطلب سب کچھ کہہ لینے کے بعد عرضِ حال بار بار نہ کر۔ ان کو تو تیرا حال بغیر کہے ہی سب کچھ معلوم ہے۔

غزل ۱۰

کیوں جل گیا نہ تابِ رُخِ یار دیکھ کر　　جلتا ہُوں اپنی طاقتِ دیدار دیکھ کر

مطلب فرماتے ہیں رُخِ یار کی آب و تاب سے کیوں نہیں جلا تجھے جل جانا چاہیئے تھا۔ اب میں اپنی طاقتِ دیدار سے جلا جاتا ہوں۔ یعنی کمالِ رشک نے میرے دل میں آگ لگا رکھی ہے۔

آتش پرست کہتے ہیں اہلِ جہاں مجھے   سرگرمِ نالہ ہائے شرر بار دیکھ کر

مطلب ۔ فرماتے ہیں : میرے نالوں کی شرر باری اس درجہ بڑھ گئی ہے کہ دنیا مجھے آتش پرست کہنے لگی ہے ۔

کیا آبروئے عشق جہاں عام ہو جفا   رُکتا ہُوں تم کو بے سبب آزار دیکھ کر

مطلب فرماتے ہیں تم نے جفا کو عام کر دیا ہے ۔ عاشق اور بوالہوس میں فرق ہی نہیں کرتے ۔ رقیب جو کہ عاشقِ صادق نہیں اس پر بھی جفا کرتے ہو ۔ میں کہتا ہوں تم بے سبب آزار ہو ۔ اور اسی وجہ سے میں تم سے کنارہ کش رہتا ہوں ۔

آتا ہے میرے قتل کو پَر جوشِ رشک سے   مرتا ہوں اُس کے ہاتھ میں تلوار دیکھ کر

مطلب فرماتے ہیں گو کہ وہ میرے قتل کرنے کو آرہا ہے لیکن دستِ ناز میں تلوار دیکھ کر میں پہلے ہی مرا جاتا ہوں کہ جس ہاتھ میں تلوار ہے وہ ہاتھ تو میرے ہاتھ میں ہوتا ۔ کمالِ رشک کی تصویر کھینچی ہے ۔

ثابت ہُوا ہے گردنِ مینا پہ خونِ خلق   لرزے ہے موجِ مے تری رفتار دیکھ کر

مطلب فرماتے ہیں مینا کی گردن پر خلقِ خدا کا خون ثابت ہو گیا ہے نہ تو شراب پیتا اور نہ یہ تری مستانہ چال ہوتی ۔ اب سارا الزام شیشہ کی گردن پر آگیا اس لئے موجِ مے خوف سے لرز رہی ہے ۔

واحسرتا کہ یار نے کھینچا ستم سے ہاتھ   ہم کو حریصِ لذتِ آزار دیکھ کر

مطلب فرماتے ہیں کس قدر افسوس ہے کہ اب ہمارے یار نے ہم پہ ظلم و ستم کرنا بھی ترک کر

دیا ہے کیونکہ ہمیں اس کے جور و ستم میں بھی لذت آنے لگی تھی ۔

بک جاتے ہیں ہم آپ متاعِ سخن کے ساتھ   لیکن، عیارِ طبع خریدار دیکھ کر

مطلب فرماتے ہیں ہم قدر دانوں کو دیکھ لیتے ہیں کہ یہ ہمارے کلام کو اچھی طرح سمجھ لیتے ہیں۔ پھر ہم خود اُن کے قدر دان ہو جاتے ہیں۔ مرزا غالب جانتے تھے کہ ان کے اشعار سمجھنے کے لئے غیر معمولی دماغ کی ضرورت ہے ۔

زنّار باندھ، سبحۂ صد دانہ توڑ ڈال   رَہرو چلے ہے راہ کو ہموار دیکھ کر

مطلب ۔ فرماتے ہیں کہ سو دانوں والی تسبیح کو توڑ دے اور صرف ایک دھاگے والے زنّار کو باندھ لے کیونکہ یہی عقل کا تقاضہ ہے کہ راہرو اس راستہ کو اختیار کرے جو سیدھا اور ہموار ہے۔

اِن آبلوں سے پاؤں کے گھبرا گیا تھا میں   جی خوش ہُوا ہے راہ کو پُرخار دیکھ کر

مطلب۔ فرماتے ہیں اِن پاؤں کے آبلوں سے میں گھبرا گیا تھا لیکن یہ دیکھ کر دل خوش ہوا ہے کہ جنگل میں کانٹے بھرے پڑے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ جب کسی سے عشق ہوتا ہے تو کیسی ہی تکالیف کیوں نہ ہوں سب آسان لگتی ہیں ۔

کیا بدگماں ہے مجھ سے کہ آئینے میں مرے   طوطی کا عکس سمجھے ہے زنگار دیکھ کر

مطلب فرماتے ہیں کہ میرا محبوب بھی کمالِ رشک کا مریض ہے ۔ مرے آئینہ میں زنگار کو عکسِ طوطی خیال کرتا ہے اور سمجھتا ہے کہ طوطی کا عاشق ہو جاؤں گا۔ کیونکہ طوطی خوش نوا ہوتی ہے۔

گرنی تھی ہم پہ برقِ تجلّی، نہ طور پر   دیتے ہیں بادہ، ظرفِ قدح خوار دیکھ کر

مطلب فرماتے ہیں جو کچھ اللہ تعالیٰ نے تمثیل کے ذریعہ قرآن کریم میں بیان فرمایا ہے کہ ہم نے

شرایعت کی امانت جس میں عشقِ الٰہی بھی شامل ہے، پہاڑوں پر پیش کی۔ انسان کے علاوہ ساری کائنات اس کا بوجھ نہ اٹھا سکی۔ جب انسان پر پیش کیا تو اس نے اس کو قبول کر لیا۔ چونکہ انسان میں صفتِ عشق تھی۔ لہٰذا جو برقِ تجلی خدا نے انسان پر گرائی ہے اس کا انسان ہی مستحق تھا چونکہ بادہ قدح خوار کے ظرف کے مطابق ملتی ہے۔

سر پھوڑنا وہ غالبِ شوریدہ حال کا ‌ ‌ ‌ یاد آگیا مجھے تری دیوار دیکھ کر

مطلب فرماتے ہیں تیری دیوار دیکھ کر وہ سارا منظر آنکھوں میں پھر گیا۔ جب غالب شوریدہ سر اس سے اپنا سر پھوڑا کرتا تھا۔ وہ وقت گذر گیا۔ وہ زمانہ ہاتھ سے نکل گیا۔ نہ جانے مرزا صاحب نے نقطۂ "وہ" میں اور کیا کیا مطالب سمو دیئے ہیں۔

غزل ۶۱

لرزتا ہے مرا دل زحمتِ مہرِ درخشاں پر ‌ ‌ ‌ میں ہوں وہ قطرۂ شبنم کہ ہو خارِ بیاباں پر

مطلب فرماتے ہیں آفتاب قطرۂ ناچیز کو اپنے اندر جذب کرنے کے لئے کیسی سرگرمی لئے ہوئے ہے اور پھر وہ قطرہ جو نوکِ خار پر ہو۔ ایسے منظر کو دیکھتا ہوں تو میرا دل اس عارضی اور ناپائیدار ہستی کو سوچ کر لرزنے لگتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اس زندگی میں چھوٹے سے چھوٹا کام مشکل ہے اور اعتبارِ زندگی کچھ نہیں۔

نہ چھوڑی حضرتِ یوسف نے یاں بھی خانہ آرائی ‌ ‌ ‌ سفیدی دیدۂ یعقوب کی پھرتی ہے زنداں پر

مطلب فرماتے ہیں کہ حضرت یوسف کو حسن و آرائش سے اس قدر لگاؤ ہے کہ زنداں جیسی جگہ کو بھی سجانا چاہتے ہیں اور در و دیوار پر سفیدی کرلی ہے یعنی والدِ ماجد کی تربیت اور

اور اس نور سے فائدہ اٹھا رہے ہو یوسفؑ کے حق میں حضرت یعقوبؑ اپنی دعاؤں کے ذریعے کر رہے تھے۔ دوسرا مطلب یہ بھی ہے کہ حضرت یعقوبؑ کی آنکھیں روتے روتے بے نور ہو گئیں تھیں اور آپ کی سپیدی یعنی یوسف کی تلاش میں در و دیوارِ زنداں پر آگئیں تھیں۔ مگر یہ خیال باطل ہے۔ حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنی آنکھیں نہیں کھوئی تھیں۔ اخلاقِ انبیاء ایسے رونے دھونے کے بالکل برخلاف ہوتے ہیں۔ وہ صبر کرتے ہیں اور صبر کی ہی تلقین کرتے ہیں۔

فنا تعلیم درسِ بے خودی ہوں اُس زمانے سے کہ مجنوں لام الف لکھتا تھا دیوارِ دبستاں پر

مطلب فرماتے ہیں میں نے فنا کی تعلیم اس زمانے میں حاصل کر لی تھی کہ مجنوں ابھی لام الف ہی مدرسے کی دیوار پر لکھ سکتا تھا۔ مطلب یہ ہے کہ میں مجنوں سے عشق میں بہت آگے نکل گیا ہوں۔ کیونکہ میرا محبوب شاہدِ مطلق ہے لیلیٰ نہیں۔

فراغت کس قدر رہتی مجھے تشویشِ مرہم سے بہم گر صلح کرتے پارہ ہائے دل نمکداں پر

مطلب فرماتے ہیں مجھ کو مرہم کے لئے ڈھونڈنے اور مرہم کے بنانے میں جس قدر تکالیف کا سامنا کرنا پڑا ہے اُس سے چھٹکارا مل جاتا اگر میرے دل کے زخم نمکداں پر صلح کر لیتے مطلب یہ ہے کہ کاش میں نے صبر و قناعت سے کام لیا ہوتا۔

نہیں اقلیمِ اُلفت میں کوئی طومارِ ناز ایسا کہ پشتِ چشم سے جس کی نہ ہووے مُہر عنواں پر

مطلب فرماتے ہیں اقلیم عشق و محبت میں کوئی کتاب، کوئی دستاویز ایسی نہیں جس میں معشوقوں کے انداز و ناز، جور و ستم نہ لکھے ہوں اور یہ بات نہ ثابت ہوتی ہو کہ عاشق صادق ہمیشہ ناکام و نامراد رہتے ہیں۔ چاہے وہ قیس ہو یا فرہاد سب کو ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا ہے۔ سب معشوقوں نے اغماض و انکار برتا ہے۔

مجھے اب دیکھ کر ابرِ شفق آلود یاد آیا　　　　کہ فرقت میں تری آتش برستی تھی گلستاں پر

مطلب معشوق کو مخاطب کر کے کہتے ہیں کہ مجھے اب ابرِ شفق آلود دیکھ کر وہ زمانہ یاد آگیا کہ تجھ بن جب کبھی سیر باغ کو گیا اور گل و لالہ پر نظر پڑی۔ تو ایسا لگا جیسے آگ برس رہی ہے گل و لالہ کو آتش سے اور فرقت میں باغ کی سیر کو ناگوار ہونا بیان کیا ہے۔

بجز پروازِ شوقِ ناز کیا باقی رہا ہوگا　　　　قیامت اک ہوائے تند ہے خاکِ شہیداں پر

مطلب۔ فرماتے ہیں شہیدانِ ناز پر ہزاروں قیامتیں برپا ہو چکی ہیں۔ ہزاروں بار ہوائے تند نے اُن کی خاک اُڑائی ہوگی۔ اب قیامت کے دن مُردے زندہ ہوں گے تو شہیدانِ ناز کی خاک اُڑ چکی ہوگی۔ دوسرا مطلب یہ بھی ہے کہ وہ تو پہلے ہی زندگی حاصل کر چکے ہیں ان کو تو یہی خواہش رہ گئی ہے کہ وہ ایک بار تجھ پر پھر نثار ہو جائیں۔

نہ لڑ ناصح سے غالبؔ کیا ہوا گر اُس نے شدت کی　　　　ہمارا بھی تو آخر زور چلتا ہے گریباں پر

مطلب۔ فرماتے ہیں اے غالبؔ ناصح کی سخت کلامی کی وجہ سے اُس سے جھگڑا مت کر خاموش ہو جا صبر کر۔ ہم بھی جب مایوس ہوتے ہیں غمگین ہوتے ہیں تو گریباں پھاڑتے ہیں اور اپنا زور دکھاتے ہیں۔

پھاڑا ہزار جا سے گریبانِ صبرِ میرؔ
کیا کہہ گئی نسیمِ سحر گُل کے کان میں　　　　(میر تقی میرؔ)

غزل ۶۲

ہے بس کہ ہر اک اُن کے اشارے میں نشاں اور　　کرتے ہیں محبت، تو گزرتا ہے گماں اور

مطلب ۔ فرماتے ہیں اُن کی کوئی بات بناوٹ، تصنع اور فریب سے خالی نہیں ہوتی۔ اس وجہ سے اگر وہ محبت سے پیش آتے ہیں تو میں بدگمانی کرتے ہوئے دشمنی ہی سمجھتا ہوں ۔ اس میں میرا کچھ قصور نہیں ۔

یارب، وہ نہ سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے مری بات　　دے اور دل اُن کو، جو نہ دے مجھ کو زباں اور

مطلب ۔ فرماتے ہیں جو لوگ میرے کلام کو بے معنی سمجھتے ہیں میری دُعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اُن کو سمجھنے والا دل عطا کرے ۔ اگر مجھ کو دوسری عام فہم زبان نہیں دیتا ۔

دوسرے معنی یہ بھی سمجھنے چاہئیں کہ مرزا صاحب معشوق کے متعلق اللہ تعالیٰ سے عرض کر رہے ہیں کہ میرا معشوق میرا دلی مُدعا نہیں سمجھتا اُس کو میرا مدعائے دلی سمجھنے کے لئے اک اور دل عطا کر دے میں تو مُدعائے دلی کھلے لفظوں میں نہیں کہہ سکتا ۔

ابرو سے ہے کیا اس نگہِ ناز کو پیوند　　ہے تیر مقرّر، مگر اُس کی ہے کماں اور

مطلب ۔ فرماتے ہیں کمانِ ابرو سے اُس نگہِ ناز کا کوئی تعلق نہیں ہے یعنی نگہِ ناز کے تیر تو نشانہ پر لگتے ہیں مگر وہ دلی ارادہ سے لگتے ہیں۔ ان تیروں کی کمان ابرو نہیں بلکہ معشوق کا دل ہے۔ کبھی وہ خوشی دے کر زخمی کرتا ہے کبھی غصہ کے پیکان سے ہلاک کرتا ہے ۔

پلتے ہیں ہر اک نقش میں جب اُس کا نشان اور
ایمان نہاں ہو کے بھی ہوتا ہے عیاں اور　　(شارح)

تم شہر میں ہو تو ہمیں کیا غم جب اُٹھیں گے　　لے آئیں گے بازار سے جا کر دل و جاں اور

مطلب ۔ فرماتے ہیں ۔ تمہارے شہر میں ہوتے ہوئے ہر شخص اپنا دل و جان ہتھیلی پہ رکھے ہوئے
ہے اور تمہارے عشق میں گرفتار ہے لہٰذا دل و جان کی کوئی کمی نہیں ہم جتنے چاہیں گے خرید
لیں گے بیچنے والے ہزاروں ہیں ۔

ہر چند سبک دست ہوئے بُت شکنی میں　　ہم ہیں تو ابھی راہ میں ہے سنگِ گراں اور

مطلب فرماتے ہیں کہ جب تک انا کا بُت (ہم ہے) نہیں ٹوٹتا کوئی فائدہ نہیں ۔ ہمیں بُت شکنی میں جس
قدر بھی سبک دستی حاصل ہے بیکار ہے ۔ اپنا وجود، اپنی ہستی یا خودی والا نفس جب تک ہے ۔
قربِ معشوق (الٰہی) حاصل نہ ہوگا ۔

ہے خونِ جگر جوش میں دل کھول کے روتا　　ہوتے جو کئی دیدۂ خوں نابہ فشاں اور

مطلب فرماتے ہیں خونِ جگر اپنے پورے جوش میں ہے دل چاہتا ہے خوب کھل کے روؤں
اور آنسوؤں کے دریا بہا دوں ۔ لیکن مجبور ہوں صرف دو آنکھیں ہیں کاش دیدۂ خوں نابہ
فشاں کئی اور ہوتے ۔

مرتا ہوں اُس آواز پہ ہر چند سر اُڑ جائے　　جلاد کو لیکن وہ کہے جائیں کہ "ہاں اور"

مطلب فرماتے ہیں معشوق کا یہ بار بار جلاد سے کہنا کہ "ہاں اور" "ہاں اور" مار اور وار کر اور زخم
لگا ۔ مجھے اس قدر بھلا لگتا ہے کہ اپنی جان کی مطلق پروا نہیں ۔ لیکن میں اپنے محبوب کی آواز
سُنتا رہوں ۔ ۔۔ کیوں وداتِ دُنیا کا ہے انسان بیچارہ جتنی بھی اُسے ملتی ہے کہتا ہے کہ ہاں اور (شارح)

لوگوں کو ہے خورشیدِ جہانتاب کا دھوکا　　ہر روز دکھاتا ہوں میں اک داغِ نہاں اور

مطلب فرماتے ہیں میرے دل جگر میں ہزاروں داغِ حسرت ہیں ہر روز میں لوگوں کو اک نیا داغ
دکھاتا ہوں تو وہ ایسا روشن اور واضح ہے کہ لوگ اس کو خورشید جہاں تاب سمجھ لیتے ہیں ۔

لیتا۔ نہ اگر دل تمہیں دیتا۔ کوئی دم چین   کرتا، جو نہ مرتا کوئی دن۔ آہ و فغاں اور

مطلب فرماتے ہیں کہ اگر میں تمھیں دل نہ دیتا تو کوئی دم چین لے لیتا اور کوئی دن اور آہ و فغاں کرتا
اگر میں نہ مرتا۔ اب تمہارا یہ کہنا کہ چین کیوں نہیں لیتا اور آہ و فغاں کیوں نہیں کرتا۔ یہ سب کچھ
معشوق کے سوال پر کہا ہے ۔

پاتے نہیں جب راہ تو چڑھ جاتے ہیں نالے   رکتی ہے مری طبع تو ہوتی ہے رواں اور

مطلب فرماتے ہیں اگر بہنے کے لئے ندی نالوں کو راہ نہ ملے تو وہ چڑھ جاتے ہیں۔ اسی طرح میری
طبع واقع ہوئی ہے۔ جب کچھ دن میں شعر نہ کہوں تو میری طبیعت خوب جوش مارتی ہے
اور رواں ہو جاتی ہے ۔

ہیں اور بھی دنیا میں سخنور بہت اچھے   کہتے ہیں کہ غالب کا ہے اندازِ بیاں اور

مطلب فرماتے ہیں اور بھی شاعر ہیں جو اچھے ہیں جن کا کلام اچھا ہے مگر اس بات پر سب متفق ہیں
کہ غالب کا ایک انوکھا اندازِ بیان ہے ۔ مولانا حالی مرزا غالب کے مرثیے میں کیا خوب فرماتے ہیں ۔

طالب و عرفی و نظیری و کلیم ٭ لوگ جو چاہیں ان کو ٹھہرائیں
ہم نے سب کا کلام دیکھا ہے ٭ ہے ادب شرط منہ نہ کھلوائیں
غالبِ نکتہ داں سے کیا نسبت   خاک کو آسماں سے کیا نسبت

غزل ۶۳

صفائے حیرت آئینہ ہے سامانِ زنگ آخر   تغیر آب برجا ماندہ ۔ پاتا ہے رنگ آخر

فرماتے ہیں صاف شفاف آئینہ اگر بیکار ڈال دیا جائے تو کچھ دن بعد اس پر زنگ آجائے گا۔ اسی طرح جہاں پانی بند ہو اس کا رنگ بدل جائے گا۔ بدبو پیدا ہو جائے گی۔ مطلب یہ ہے کہ دل و دماغ سے کام لیتے رہنا چاہیئے۔ انسان کو بیکار نہیں بیٹھنا چاہیئے۔

نہ کی سامانِ عیش و جاہ نے تدبیر وحشت کی   ہوا جامِ زمرد بھی مجھے داغِ پلنگ آخر

فرماتے ہیں میری وحشت مزاجی کا علاج سامانِ عیش و عشرت نہ کر سکے یہاں تک کہ میرا زمردی جام مجھے چیتے کا داغ نظر آنے لگا۔ مطلب سارے شعر کا یہ ہے کہ مال و دولت سے حقیقی خوشی حاصل نہیں ہوتی۔ اللہ تعالیٰ جس کو چاہتا ہے غنی دل عطا کرتا ہے وہ ہر حال میں مطمئن رہتا ہے خوش و خرم ہوتا ہے۔

بادشاہت مل گئی جس کو غنی دل مل گیا
اس پہ آئی پھر بہار ایسی، جو گلشن میں نہیں   (شارح)

غزل ۶۴

جنوں کی دستگیری کس سے ہو گر ہو نہ عریانی
گریباں چاک کا حق ہو گیا ہے میری گردن پر

فرماتے ہیں میں اپنی عریانی کا احسان مند ہوں کہ میرے جنوں کی مددگار ہو گئی ہے۔ اس لئے چاکِ گریباں کا حق میری گردن پر ہو گیا ہے۔ اگر گریبان چاک نہ ہوتا تو جنوں کی کیسے دستگیری ہوتی۔ مطلب یہ ہے چاک گریباں ہونے سے ہی جنون کا پتہ چلتا ہے۔

برنگِ کاغذِ آتش زدہ نیرنگِ بیتابی ہزار آئینہ دل باندھے ہے یک بالِ تپیدن پہ

مطلب فرماتے ہیں جس طرح جلا ہوا کاغذ روشن ہو کر بہت سے ستارے دکھاتا ہے اسی طرح نیرنگِ بیتابی نے میرے دل کے بازوؤں پر ہزاروں آئینے باندھ دیئے ہیں۔ ایک ہی تڑپ میں ہزاروں داغ روشن ہو جاتے ہیں۔

فلک سے ہم کو عیشِ رفتہ کا کیا کیا تقاضا ہے متاعِ بُردہ کو سمجھے ہوئے ہیں قرض رہزن پہ

معنی ۔ متاعِ بُردہ ، لوٹی ہوئی متاع

مطلب فرماتے ہیں ہم فلک سے اپنی چھینی ہوئی عیش و عشرت کا تقاضا کرتے ہیں کہ جو کچھ ہم سے لیا ہے وہ ہمیں واپس ملنا چاہیئے جیسے کہ لوٹ لی گئی ہوئی پونجی رہزن پر قرض ہوتی ہے مطلب یہ ہے کہ ہر وہ شخص جو اچھے دن دیکھنے کے بعد بُرے دن دیکھتا ہے ہمیشہ خیال کرتا ہے کہ فلک کو وہ سب کچھ اُسے واپس دینا چاہیئے ۔

ہم اور وہ بے سبب رنجِ آشنا دشمن کہ رکھتا ہے شعاعِ مہر سے تہمت نگہ کی چشمِ روزن پہ

مطلب ۔ فرماتے ہیں اُس بے سبب رنجِ آشنا دشمن سے پالا پڑا ہے کہ وہ شعاعِ مہر کو بھی میری نظر کہہ کر میرے پر روزن میں سے جھانکنے کی تہمت مجھ پر لگاتا ہے مطلب یہ ہے کہ معشوق بے سبب مجھ سے شکایت کرتا رہتا ہے ۔

فنا کو سونپ گر مشتاق ہو اپنی حقیقت کا فروغِ طالعِ خاشاک ہے موقوف گلخن پہ

مطلب فرماتے ہیں اپنے آپ کو اس کی راہ میں مٹا دے فنا فی اللہ ہو جا ۔ پھر بحسب قابلیت تجھے اس کی معرفت نصیب ہوگی جیسے کوڑے کرکٹ کو بھٹی جلا کر روشن کر دیتی ہے اور اس کی قابلیت کے مطابق اُسے روشن کر دیتی ہے سُبحان اللہ کیسا معرفت کا مضمون دو مصرعوں میں بیان فرما دیا ۔

اسدؔ بسمل ہے کس انداز کا قاتل سے کہتا ہے کہ مشقِ ناز کر خونِ دو عالم میری گردن پر

مطلب۔ فرماتے ہیں اسد پر تعجب آتا ہے کہ وہ کس طرح کا بسمل ہے کہ معشوق سے کہے جاتا ہے کہ تو مشقِ ناز اسی طرح جاری رکھ اور لوگوں کو اپنے ناز و انداز سے قتل کرتا رہ۔ خونِ دو عالم میری گردن پر ہے تو کوئی پروا نہ کر۔ ؎ جور و جفا و ناز سے کرتے ہیں وہ شہید
مرنا اگر یہی ہے تو مشکل نہیں رہا (شارح)

غزل

ستم کش مصلحت سے ہوں کہ خوباں تجھ پہ عاشق ہیں

تکلف برطرف مل جائے گا تجھ سا رقیب آخر

مطلب۔ فرماتے ہیں میں تیرے ظلم و ستم مصلحت سے برداشت کر رہا ہوں اور وہ یہ ہے کہ تجھ پر حسینانِ جہاں عاشق ہیں اگر تو مجھے نہ ملا تو کوئی جس پر تیرا خوب رنگ چڑھ چکا ہوگا وہ مجھے مل جائے گا۔ "تجھ سا رقیب آخر" رقیب اس لئے کہا ہے کہ وہ وہ تجھ پر عاشق ہوگا۔ (مراد کسی مرد خدا سے ہے۔

غزل ۶۵

لازم تھا کہ دیکھو مرا رستہ کوئی دن اور تنہا گئے کیوں اب رہو تنہا کوئی دن اور

مطلب یہ مرثیہ بصورت غزل ہے لیکن درحقیقت ایک قسم کا نوحہ یا مرثیہ کہنا چاہیئے۔ زین العابدین کی وفات پر کہی گئی ہے۔ مرزا صاحب کو زین العابدین خان عارف سے قرابت داری بھی تھی اور چونکہ

خوش گو، خوش فکر نہایت محبت کرنے والے تھے جب وہ جوان فوت ہو گئے تو مرزا صاحب کو بے حد قلق ہوا۔

شعر کا مطلب یہ ہے کہ تم پر واجب تھا کہ تم میرے ساتھ مرتے اور راہِ عدم ہم دونوں ساتھ ساتھ طے کرتے اب تم نے میرا انتظار نہ کیا تنہا چل دیئے اب تمہیں کچھ دن تنہا ہی رہنا پڑے گا۔

مٹ جائیگا سر، گر ترا پتھر نہ گھسے گا ہوں در پہ ترے ناصیہ فرسا کوئی دن اور

مطلب۔ فرماتے ہیں تیرے کتبہ کا پتھر گھس جائے گا یا میرا سر مٹ جائے گا دونوں باتوں میں سے ایک ضرور ہو کر رہے گی میں تیرے در پر پیشانی رگڑتا رہوں گا۔ مطلب یہ ہے کہ جلد ہی تجھ سے آکر ملوں گا۔

آئے ہو کل اور آج ہی کہتے ہو کہ جاؤں مانا، کہ ہمیشہ نہیں اچھا، کوئی دن اور

مطلب فرماتے ہیں تمہیں دنیا میں آئے ہوئے زیادہ عرصہ نہیں گزرا۔ گویا کہ کل ہی آئے ہو اور آج کہتے ہو کہ ہم جائیں۔ میں نے مانا کہ یہاں ہمیشہ کوئی نہیں رہتا مگر کچھ دن تو اور ٹھہر جاتے۔

جاتے ہوئے کہتے ہو قیامت کو ملیں گے کیا خوب قیامت کا ہے گویا کوئی دن اور

مطلب فرماتے ہیں تمہارا جانا ہمارے لئے قیامت کا سامنا ہی تو ہے پھر تمہارا یہ کہنا کہ قیامت کو ملیں گے درست نہیں کیا قیامت کا کوئی دوسرا دن بھی ہے۔

ہاں اے فلکِ پیر، جواں تھا ابھی عارف کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور

مطلب فرماتے ہیں اے پیر فلک ابھی عارف جوان تھا۔ اس میں کوئی کلام نہیں۔ میری یہ بات غلط نہیں۔ تیرا کیا بگڑ جاتا کیا نقصان ہو جاتا اگر عارف کچھ دن اور زندہ رہتا۔

غزل ۶۶

فارغ مجھے نہ جان کہ مانندِ صبح مہر ہے داغِ عشق زینتِ جیبِ کفن ہنوز

فرماتے ہیں۔ اس شعر میں جیبِ کفن کو صبح سے اور داغِ عشق کو آفتابِ صبح سے تشبیہ دی ہے
شعر نہایت ہی لطیف مضمون پر مشتمل ہے۔ فرماتے ہیں میری وفات سے میرے عشق کا قصہ
تمام نہیں ہوتا۔ مرنے کے بعد بھی فراغت حاصل نہ ہوگی بلکہ جس طرح آفتاب شام کو
غروب ہو کر صبح کو پھر نمودار ہو جاتا ہے۔ بعینہ میرا معاملہ بھی ایسا ہی ہے۔ میرا عشق مرنے
کے بعد بھی جاری رہے گا اور قربِ الٰہی یعنی محبوبِ ازلی کے لئے جدوجہد میں لگا رہے
گا۔ میرا داغِ عشق میرے جیبِ کفن کی زینت و متاعِ ابدی ہے۔

ہے نازِ مفلساں زرِ از دست رفتہ پر ہوں گل فروشِ شوخیٔ داغِ کہن ہنوز

فرماتے ہیں۔ جس طرح مفلس لوگ اپنی برباد کی ہوئی دولت پہ نازاں رہتے ہیں اور اس کے قصے
کہانیاں مزے لے لے کر لوگوں کو سناتے ہیں یہی میری حالت و کیفیت ہے جس دن میں
نے عشق کی چوٹ کھائی تھی اور داغِ عشق سے سرفراز ہوا تھا گو کہ یہ پرانی بات ہے لیکن
میں سمجھتا ہوں جیسے یہ حادثہ ابھی گزرا ہے اور میں نے اپنا دل آج ہی محبوب کو بیچ دیا ہے
جس کے بدلے مجھے اس کی دلفریبی سے داغِ عشق ملا تھا۔

میخانۂ جگر میں یہاں خاک بھی نہیں خمیازہ کھینچے ہے بتِ بیداد فن ہنوز

فرماتے ہیں۔ میخانۂ جگر میں ایک قطرہ خون کا باقی نہیں۔ عشق وصالِ یار کے سارے حربے استعمال کر
چکا اور ترکش میں کوئی تیر باقی نہیں مگر حسنِ یار یعنی محبوب ابھی تک میرے خون کا پیاسا ہے

جو ابھی تک انگڑائیاں لے رہا ہے کہ نشہ نہیں ہوا مجھے اور پلاؤ۔
الٰہی یہ قیامت ہے وہ جب لیتے ہیں انگڑائی : مرے سینے میں سب زخموں کے ٹانکے ٹوٹ جاتے ہیں۔
(حضرت امیر مینائی)

غزل ۶۷

حریفِ مطلبِ مشکل نہیں، فسونِ نیاز ۔۔۔ دُعا قبول ہو یارب کہ عمرِ خضر دراز

معنی ۔ حریف ۔ ہم پیشہ، دُشمن، اضداد میں سے ہے۔
فرماتے ہیں۔ حصولِ مقصد میں تو ہمارا عجز و نیاز کا جادو نہیں چلتا۔ اس لئے اب دُعا کرتے ہیں کہ یارب ہماری عمر بھی عمرِ خضر کی مانند لمبی ہو جائے۔

نہ ہو بہ ہرزہ بیاباں نبردِ وہم وجود ۔۔۔ ہنوز تیرے تصوّر میں ہے نشیب و فراز

فرماتے ہیں۔ اگر اللہ تعالیٰ کے علاوہ تو کسی اور وجود کی تلاش میں سرگرداں ہے تو تیرے اس فعل سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ تو ابھی تک علم الیقین کی منزل بھی طے نہیں کر سکا ہے۔ جو کہ پہلا درجہ یقین کا ہے۔ دوسرا عین الیقین اور تیسرا حق الیقین ہے۔

وصال جلوہ تماشا ہے، پر دماغ کہاں ۔۔۔ کہ دیجئے آئینۂ انتظار کو پرواز

فرماتے ہیں۔ یہ ہم تسلیم کرتے ہیں کہ اُس کے جلوے کا حصول آسان ہے لیکن یہ اُسی وقت ممکن ہے کہ ہم اپنے آئینۂ انتظار کو خوب صاف کر لیں۔ مطلب یہ ہے کہ وصالِ یار یعنی قربِ الٰہی کا تماشا دل میں ہو گا اگر دل کا آئینہ صاف ہو۔ مگر شاید ہم میں ہی یہ طاقت نہیں۔ اس میں محبوبِ ازلی کا کوئی قصور نہیں۔

ہر ایک ذرّۂ عاشق ہے آفتاب پرست ۔۔۔ گئی نہ خاک ہُوئے پر ہوائے جلوۂ ناز

فرماتے ہیں ۔ عاشقِ صادق کا عشق معشوقِ ازلی سے کبھی ختم نہیں ہوتا بلکہ مرنے کے بعد تیز سے تیز تر
ہو جاتا ہے۔ جوں جوں دنیا کے اشغال سے فراغت ہوتی جاتی ہے۔ حصولِ قربِ الٰہی کی
آرزو بڑھتی جاتی ہے جس طرح خاک کے ذرے شعاعوں کے مقابل ہو کر خوب چمکنے لگتے ہیں
اسی طرح عاشق کی خاک آفتابِ ازلی کے مقابل ہو کر زیادہ چمکنے لگے گی ۔ اور اپنے عشق میں اور
ترقی کرے گی۔

نہ پوچھ وسعتِ میخانۂ جنوں غالبؔ　　　جہاں یہ کاسۂ گردوں ہے ایک خاک انداز

فرماتے ہیں ۔ اے غالب مجھ سے میخانۂ جنوں کی وسعت نہ پوچھ۔ بس اتنا جان لے کہ یہ کاسۂ
گردوں وہاں ایک کوڑا پھینکنے کا برتن ۔ ہے جیسے انگریزی میں DUST BIN اور فارسی
میں خاک انداز کہتے ہیں یعنی اس کی کوئی حقیقت ہی نہیں۔ مطلب یہ ہے کہ جنونِ عشق کی انتہا
نہیں ہر ایک اپنے ظرف ۔ کے مطابق صحرا نوردی کرتا ہے ۔

غزل ۶۸

کیونکر اس بت سے رکھوں جان عزیز　　　کیا نہیں ہے مجھے ایمان عزیز

فرماتے ہیں ۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ ایسے حسن و جمال رکھنے والے محبوب کے سپرد جان نہ کروں ۔ اگر
ایسا نہ کروں تو میرا ایمان ہی جاتا رہے گا لیکن مجھے تو ایمان بہت عزیز ہے۔ پھر محبوب سے
جان عزیز تر کیسے رکھی جا سکتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ حُسنِ مطلق کو حسبِ ظرف دیکھ لیا
ہے۔ اب مجھے جان کی پروا نہیں بلکہ ایمان عزیز ہے ۔

دل سے نکلا پہ نہ نکلا دل سے　　　ہے ترے تیر کا پیکان عزیز

فرماتے ہیں ۔ تو نے اپنی دانست میں میرے دل سے تیر کا پیکان نکال لیا ہے مگر سچی بات یہ ہے کہ کس کی محبت میرے دل میں گڑ گئی ہے اور میں اس کی کھٹک محسوس کرتا ہوں جو کہ مجھے عزیز ہے مطلب یہ ہے کہ بظاہر تیری طرف سے تغافل ہے مگر میں تیرے عشق میں اپنے آپ کو غرق پاتا ہوں ۔

تاب لائے ہی بنے گی غالب واقعہ سخت ہے اور جان عزیز

یہ مقطع عارف مرحوم کی موت سے متعلق معلوم ہوتا ہے ۔ فرماتے ہیں اے غالب اس حادثہ کو برداشت کرنا ہی پڑے گا گو یہ سانحہ جان لیوا ہے مگر جان بھی ایک عزیز شے ہے جس کو انسان کسی حال میں دینا نہیں چاہتا ۔

غزل ۶۹

وسعتِ سعیٔ کرم دیکھ کہ سرتاسرِ خاک گزرے ہے آبلہ پا ابرِ گہربار ہنوز

فرماتے ہیں ۔ اہلِ کرم کی نوازشیں ابرِ گہربار کی طرح ہوتی ہیں جس طرح ابرِ گہربار آبلہ پا ہوتے ہوئے بھی زمین کے ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک بارش برساتا ہے ۔ آبلہ پا سے تشبیہ ابرِ گہربار کی ہے کیونکہ وہ پانی کے قطرات اٹھائے پھرتا ہے ۔

یک قلم کاغذِ آتش زدہ ہے صفحۂ دشت نقشِ پا میں ہے تپِ گرمیٔ رفتار ہنوز

فرماتے ہیں ۔ میری گرمیٔ رفتار اس قسم کی واقع ہوئی ہے کہ صفحۂ دشت یعنی سارا میدان جلے ہوئے کاغذ کی مانند خاکستر ہو گیا یعنی جہاں جہاں میرے قدم پڑتے ہیں وہ زمین جل کر راکھ ہو جاتی ہے ۔

غزل ۷۰

نہ گُلِ نغمہ ہوں نہ پردۂ ساز   مَیں ہوں اپنی شکست کی آواز

فرماتے ہیں ۔ میرا پُر درد بیان نہ گُلِ نغمہ ہے نہ کسی پردۂ ساز سے نِکلا ہوا سر ہے میں تو سراپا درد ہوں یعنی میری آواز (میرا کلام) میرے ٹوٹے ہوئے دل کی پُر درد صدا ہے ۔

تو اور آرائشِ خمِ کاکل   میں اور اندیشہ ہائے دُور دراز

فرماتے ہیں ۔ اے میرے محبوب تمہیں تو نمودِ حسن کی غرض سے اپنی زلفوں کو سنوارنے اور اُن میں پیچ و خم ڈالنے سے سروکار ہے لیکن مجھ کو تمھاری اس آرائش سے خوف اور اندیشہ پیدا ہو رہا ہے کہ نہ جانے اس غضب کے بناؤ سنگھار سے کتنے مزید عاشق یا میرے رقیب پیدا ہو جائیں گے ۔

لافِ تمکیں فریبِ سادہ دِلی   ہم ہیں اور راز ہائے سینہ گداز

فرماتے ہیں ۔ ہمارے ضبطِ غم و راز کے دعوے ہماری سادہ دلی کے مظہر ہیں ۔ ہم میں اتنی طاقت کہاں ہے کہ ضبطِ غم اور رازِ محبت کو سینہ میں دفن کئے رکھیں ۔ یہ تو ایک دن سب پر ظاہر ہو کر رہیں گے ۔

ضبطِ غم کا حوصلہ ممکن نہیں ⁂ ہاں وہ اندازِ نہانی اور ہے   (شارح)

ہو دل گرفتارِ الفتِ صیاد　　ورنہ باقی ہے طاقتِ پرواز

معنی۔ الفتِ صیاد۔ مراد دنیا کی محبت
فرماتے ہیں۔ میں دنیا کی محبت میں گرفتار ہو گیا ہوں۔ چاہوں تو اس سے چھٹکارا حاصل کر سکتا ہوں
یعنی انسان کی تخلیق میں جسمانی اور روحانی اعلیٰ سے اعلیٰ صلاحیتیں ودیعت کی گئی ہیں۔ اگر چاہے
تو ان اعلیٰ صلاحیتوں سے کام لے کر اس قید یعنی دنیا کی محبت سے آزاد ہو سکتا ہے۔

وہ بھی دن ہو کہ اس ستم گر سے　　ناز کھینچوں، بجائے حسرتِ ناز

فرماتے ہیں۔ کاش وہ دن بھی مجھے نصیب ہو، کہ بجائے حسرتِ ناز کھینچنے کے میں اس کے ناز
برداشت کرنے کی منزل میں پہنچ جاؤں۔ یعنی مجھے اس کا قرب حاصل ہو جائے۔

نہیں دل میں مرے وہ قطرۂ خوں　　جس سے مژگاں ہوئی نہ ہو گل باز

فرماتے ہیں۔ میرے دل میں ایک قطرۂ خون بھی ایسا نہیں جس سے مژگانِ یار سرخ نہ ہوئی ہو۔ یعنی
میری زندگی میں کوئی ایسا لمحہ نہیں آیا کہ مژگانِ یار میرے خون میں ڈوب کر سرخ نہ ہو گئی ہو۔

اے ترا غمزہ یک قلم انگیز　　اے ترا ظلم سر بسر انداز

فرماتے ہیں۔ فرماتے ہیں تیرا غمزہ سراسر ناز ہے اور تیرا ظلم سر بسر انداز ہے۔ یعنی تیرے لطف و
عنایت کی انتہا نہیں ہے اور اسی طرح تیرا ظلم بھی تیرا ایک انداز ہے

تو ہوا جلوہ گر مبارک ہو　　ریزشِ سجدۂ جبینِ نیاز

فرماتے ہیں۔ تیرا جلوہ گر ہونا میرے لئے مبارک ہو۔ میں تجھے دیکھ کر اپنی جبینِ نیاز کو سجدہ میں گراتا ہوں۔

مجھ کو پوچھا تو کچھ غضب نہ ہوا　　　میں غریب اور تُو غریب نواز

فرماتے ہیں۔ تو نے اگر میری حاجت روائی کی تو اس میں کونسی حیرت کی بات ہے۔ میں غریب و مسکین ہوں اور تیری شان غریب نوازی ہے۔

غضب نہ ہوا کے جملے نے بہت لطف پیدا کیا ہے۔

اسد اللہ خاں تمام ہوا　　　اے دریغا وہ رندِ شاہد باز

۔اسد اللہ خاں آج جہاں سے گزر گیا۔ افسوس صد افسوس کہ وہ شرابی اور حسینوں کو محبوب رکھنے والا آج دُنیا میں نہیں ہے

غزل ۱۷

مژدہ اے ذوقِ اسیری کہ نظر آتا ہے　　　دامِ خالی قفسِ مرغِ گرفتار کے پاس

فرماتے ہیں۔ پرندے کے پکڑنے کے طریقوں میں سے ایک یہ بھی طریقہ ہے کہ جال لگا کر اُس کے پاس ویسے ہی پرندے کو رکھ دیتے ہیں اور طائر گرفتار کی آواز پر یا مصنوعی آواز بنا کر دوسرے آزاد پرندوں کو اکٹھا کر لیتے ہیں اور کچھ ان میں سے جال میں پھنس جاتے ہیں۔ مگر یہاں مرزا صاحب کا مطلب یہ ہے کہ مجھے جو ذوقِ اسیری ہے اس کے لئے مژدہ ہے کہ میں بھی معشوق کے دام میں گرفتار ہو سکتا ہوں یعنی معشوقِ ازلی کا جال ہر وقت بچھا ہوا (یعنی صفاتِ الٰہی) اور اس کے جلوۂ حسن کی نمائش ہر طرف موجود ہے۔ ہر ایک کے لئے صلائے عام ہے۔

نمودِ حسن عالم میں برائے عاشقاں رکھدی ؛ بفیضِ حُسن ہر سو جلوہ گاہِ دلستاں رکھ دی (شارح)

جگرِ تشنۂ آزار، تسلّی نہ ہوا جوئے خوں ہم نے بہائی بُنِ ہر خار کے پاس

فرماتے ہیں ۔ ہمارا جگر جو تشنۂ آزار ہے اس کی تسلی نہ ہوئی حالانکہ ہم نے اپنے خون کی نہریں ہر ایک کانٹے کے پاس بہائیں تاکہ ہم لطفِ خلش حاصل کریں۔

مطلب یہ ہے کہ کارزارِ عشق میں چاہے کتنے ہی زخم لگیں پھر بھی جی نہیں بھرتا اور مزید زخم کھانے کے لئے عاشق ہر وقت آرزو کرتا رہتا ہے۔

مند گئیں کھولتے ہی کھولتے آنکھیں ہے ہے! خوب وقت آئے تم اِس عاشقِ بیمار کے پاس

فرماتے ہیں ۔ انتظار کرتے کرتے وہ وقت آگیا کہ آنکھیں کُھلی رکھنا دشوار ہوگیا۔ اور تم ایسے وقت میں آئے کہ نزع کا عالم طاری ہے۔ میں تمھارا دیدار کرنے کو آنکھیں کھولتا ہی رہ گیا اور حسرتِ دید لئے دُنیا سے رخصت ہوگیا۔

مَیں بھی رُک رُک کے نہ مرتا جو زباں کے بدلے دشنہ اک تیز سا ہوتا مرے غم خوار کے پاس

فرماتے ہیں ۔ غم خوار کے طعن و ملامت، اور نصیحت کے کچوکے کھا کر میں موت سے بدتر زندگی بسر کر رہا ہوں۔ کاش اُس کی اِس زبان کے بدلے اُس کے پاس ایک بہت تیز سا خنجر ہوتا اور وہ ایک ہی مرتبہ میرا کام تمام کر دیتا اور مجھے روز روز کی اذیّت سے چھٹکارا مل جاتا۔

دہنِ شیر میں جا بیٹھیے لیکن اے دل نہ کھڑے ہو جیئے خوبانِ دل آزار کے پاس

فرماتے ہیں ۔ کہ ایسے حسینوں کے پاس، جو دل آزاری میں اپنا ثانی نہیں رکھتے، کھڑا ہونے سے بہتر ہے کہ کسی شیر کے منہ میں جا کر اس کا لقمہ بن جائیں۔

دیکھ کر تجھ کو چمن بسکہ نمو کرتا ہے　　خود بخود پہنچے ہے گُل گوشۂ دستار کے پاس

فرماتے ہیں ۔ تجھ کو دیکھ کر چمن کی قوتِ نمو اس قدر بڑھ جاتی ہے کہ گل خود بخود بڑھ کر تیری دستار تک پہنچ جاتے ہیں ۔ مطلب یہ ہے کہ معشوق جب جلوہ گر ہوتا ہے تو اس کے دیدار سے سب کے دلوں اور دماغوں میں سودائے عشق سما جاتا ہے ۔ یا یوں سمجھ لیں کہ جب دُنیا میں اللہ تعالیٰ کے فرستادے نزول فرماتے ہیں تو فرشتے لوگوں کے دلوں کو اُن کی طرف مائل کر دیتے ہیں اور سعید روحوں میں حق و صداقت کے لئے ایک ولولہ ایک جوش پیدا ہو جاتا ہے ۔

مر گیا پھوڑ کے سر غالبِ وحشی ہے ہے　　بیٹھنا اس کا وہ آکر تری دیوار کے پاس

معنی ۔ ہے ہے ۔ ہائے افسوس

فرماتے ہیں ۔ افسوس صد افسوس کہ غالب وحشی اپنا سر تیری دیوار سے ٹکرا ٹکرا کے پھوڑتا رہا اور بالآخر مر گیا ۔ مگر ہمیں اس کا شوقِ دیدار میں تیری دیوار کے پاس آکر بیٹھنا کبھی نہ بھولے گا ۔
چارۂ غم نہ رہا جب مرے غم خوار کے پاس　　وہ بھی سر پھوڑنے پہنچا کسی دیوار کے پاس (شارح)

غزل ۲۷

نہ لیوے گر خسِ جوہر طراوت سبزۂ خط سے
لگا دے خانۂ آئینہ میں رُوئے نگار آتش

فرماتے ہیں ۔ تیرے سبزۂ خط سے جوہرِ آئینہ تر و تازگی حاصل کرتا ہے اگر ایسا نہ کرے تو روئے نگار کا شعلہ خانۂ آئینہ میں یقیناً آگ لگا دے ۔ مطلب یہ ہے کہ یہ عالم (خانۂ آئینہ) تجھ سے فیض حاصل کرتا رہتا ہے اور تیرے عاشق تیرے حسن و احسان کو جذب کرتے رہتے ہیں اگر ایسا نہ ہو تو تمام عالم یک دم فنا ہو جائے گا ۔ خسِ جوہر سے مراد جوہرِ آئینہ ہے ۔

فروغِ حُسن سے ہوتی ہے حل ہر مشکلِ عاشق

نہ نکلے شمع کے پاسے نکالے گر نہ خارِ آتش

معنی خارِ شمع ۔ شمع کی بتی، ڈوری

فرماتے ہیں۔ فروغِ حسن سے جو انتشارِ فیض ہوتا ہے اس سے عاشق کی مشکل حل ہو جاتی ہے جس طرح شمع کے جلنے کی گرمی سے خارِ شمع نکل جاتا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ تیرے فروغِ حسن سے فروغِ عشق ہوتا ہے اور عاشق آتشِ عشق سے جل کر تجھ میں فنا ہو جاتا ہے۔ یہی اس کا وصال ہے۔

جادۂ رہ خور کو وقتِ شام سے تارِ شعاع

چرخ وا کرتا ہے ماہِ نو سے آغوشِ وداع

۔جادۂ رہ خور ۔ مسافر ۔ تارِ شعاع ۔ طلوعِ شمس سے پہلے اور غروبِ آفتاب کے بعد ایک سفید ڈوری جو افق کہلاتی ہے۔

لفظی معنی تو یہ ہیں کہ بوقتِ شام سورج سفر کرنے پر آمادہ ہے اور آسمان نے اس کا راستہ کھول دیا ہے اور وہ ماہِ نو سے رخصتی معانقہ کر رہا ہے۔

غزل ۷۳

رُخِ نگار سے ہے سوزِ جاودانیٔ شمع ہوئی ہے آتشِ گل آبِ زندگانیٔ شمع

فرماتے ہیں ۔ محبوب کے رخِ انور سے شمع کو رشک پیدا ہو گیا جس کی وجہ سے وہ آتشِ رشک میں جل رہی ہے اور آتشِ گل جو محبوب کے رخساروں کی سرخی ہے وہ شمع کے لئے آبِ حیات بن گئی ہے ۔

مطلب یہ ہے کہ محبوب حقیقی کا چہرۂ انور جب تک کائنات کی طرف ہے ۔ اُس کی زندگی ہے ۔ جس دن اُس نے اپنا منہ پھیر لیا ۔ اُس دن کائنات نہیں رہے گی ۔ سب کچھ فنا ہو جائے گا ۔

زبانِ اہلِ زباں میں ہے مرگِ خاموشی یہ بات بزم میں روشن ہوئی زبانیٔ شمع

معنی ۔ زبانیٔ شمع = شعلۂ شمع یعنی اس کا جلنا اُس کی زندگی ہے ۔ بجھی ہوئی شمع کو شمع کُشتہ کہتے ہیں ۔

فرماتے ہیں ۔ اہلِ زبان اپنی زبان میں خاموشی کو موت کہتے ہیں ۔ ہم پر یہ بات بزم میں شمع کی زباں سے روشن ہوئی ۔ مطلب یہ ہے کہ اہلِ زبان کا خاموش رہنا اہلِ زبان کی موت ہے جس طرح شمع اپنا کام چھوڑ دے یعنی جلنا بند کر دے تو وہ بھی مر جائے گی اسی طرح قوموں کی زندگی بھی محنت و مشقت کرنے ہی میں ہے جب وہ کام کرنا چھوڑ دیں تو وہی اُن کی موت ہے ۔

کرے ہے صِرف بہ ایمائے شعلہ قصّہ تمام بہ طرزِ اہلِ فنا ہے فسانہ خوانیٔ شمع

فرماتے ہیں ۔ شمع شعلہ کے اشارے پر اپنی زندگی کا خاتمہ کر لیتی ہے یعنی شعلۂ نُور کی محبت میں

اپنے آپ کو فنا کر لیتی ہے۔ اسی طرح عاشقانِ الٰہی اُس کی محبت میں اپنے آپ کو فنا کر لیتے ہیں اور اس ہستی موہوم سے گزر کر حیاتِ جاوداں پاتے ہیں۔

غم اس کو حسرتِ پروانہ کا ہے اے شعلہ　　　ترے لرزنے سے ظاہر ہے ناتوانیِ شمع

فرماتے ہیں۔ شمع کو حسرتِ پروانہ کا غم لگ گیا (یعنی پروانہ کو ناکامی اور محرومی جو ہوئی ہے) اسی وجہ سے شعلہ لرز کر شمع کا ناتواں ہونا ظاہر کر رہا ہے۔

ترے خیال سے روح اہتزاز کرتی ہے　　　بہ جلوہ ریزیِ باد و بہ پرفشانیِ شمع

فرماتے ہیں۔ اے مرے محبوب تیرے خیال سے میری روح وجد کرنے لگتی ہے اور اس جنبش سے مجھے سرور حاصل ہوتا ہے۔ جس طرح ہوا کے چلنے سے شعلۂ شمع جھومتا ہے۔

نشاطِ داغِ غمِ عشق کی بہار نہ پوچھ　　　شگفتگی ہے شہیدِ گلِ خزانیِ شمع

فرماتے ہیں۔ داغِ غمِ عشق سے جو سرور حاصل ہوتا ہے اس کا حال مجھ سے نہ پوچھ وہ تو ایک فصلِ بہار ہے جس طرح گل پیدا ہونے سے (یعنی جل کر جو گل پیدا ہوتا ہے) شمع بجھ جاتی ہے اسی طرح داغِ عشق سے عاشق کی شہادت وقوع میں آتی ہے۔ مدعا یہ ہے کہ داغِ غمِ عشق میں ایسی بہار ہے کہ شگفتگی اس پر ہزار جان سے نثار ہے

جلے ہے دیکھ کے بالینِ یار پر مجھ کو　　　نہ کیوں ہو دل پہ مرے داغِ بدگمانیِ شمع

فرماتے ہیں۔ شمع بھی یار پہ عاشق ہے اور مجھے اپنا رقیب سمجھتی ہے۔ اسی یار کے پاس مجھ کو کھڑا دیکھ کر آتشِ رشک میں جل رہی ہے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ مجھے شمع کے متعلق بدگمانی نہ ہو۔

غزل ۷۴

ہیم رقیب سے نہیں کرتے وداعِ ہوش مجبوریاں تلک ہوئے اے اختیار حیف

فرماتے ہیں۔ ہم رقیب کے خوف سے بے ہوش بھی نہیں ہوسکتے کیونکہ اندیشہ ہے کہ وہ رازِ عشق سے باخبر ہوجائے گا۔ افسوس کہ ہم جو کچھ کرنا چاہتے ہیں۔ اس پر ہمیں ذرا بھی اختیار نہیں۔

جلتا ہے دل، کہ کیوں نہ ہم اک بار جل گئے اے ناتمامیِ نفسِ شعلہ بار حیف

فرماتے ہیں۔ ہمیں بار بار خیال آتا ہے اور یہ بہت تکلیف دہ امر ہے کہ ایک ہی دفعہ میں کیوں نہ خاکستر ہوگئے جبکہ ہمارے سینہ میں آتشِ شعلہ بار موجود ہے لیکن حیف صد حیف ہماری ناکامی اور نامرادی پر کہ وہ ہمیں یک لخت مرنے سے بھی روکتی ہے

غزل ۷۵

زخم پر چھڑکیں کہاں طفلانِ بے پروا نمک
کیا مزہ ہوتا، اگر پتھر میں بھی ہوتا نمک

فرماتے ہیں۔ لڑکے مجھے دیوانہ سمجھ کر پتھر مارتے ہیں جس کی وجہ سے میرا جسم زخمی ہوگیا ہے لیکن لڑکے بے پرواہیں وہ زخموں پر نمک نہیں چھڑکتے۔

یا اگر پتھر نمک کے پتھر ہوتے تو دونوں کام ساتھ ہی ہوجاتے۔ یعنی ہم لذتِ زخم سے

پوری طرح آشنا ہوتے۔

دوسرا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ بچے مجھے بس دیوانہ سمجھ کر پتھر مار رہے ہیں اگر یہ اطفال بے پروا نہ ہوتے اور یہ بھی جاننے کی کوشش کرتے کہ میری دیوانگی کا سبب کیا ہے۔ میں کس کے لئے اور کس کے عشق میں پاگل ہوگیا ہوں۔ اور یہ اطفال پتھر مارتے وقت کہتے کہ فلاں سے عشق کرنے والے فلاں کے لئے پاگل ہونے والے کو کیا مزہ آتا ہے۔

گردِ راہِ یار ہے سامانِ نازِ زخمِ دل

ورنہ ہوتا ہے جہاں میں کس قدر پیدا نمک

فرماتے ہیں۔ زخمِ دل کے لئے باعثِ فخر گردِ راہِ یار ہے۔ ورنہ دنیا میں نمک کی کمی نہیں۔ زخمِ دل پر نمک کے لگنے سے وہ لطف نہیں آتا۔ جیسا کہ معشوق کے راستہ کی گرد سے، جب یہ گرد زخموں میں بھرتی ہے تو خوب مزہ دیتی ہے۔

مطلب یہ ہے کہ معشوقِ حقیقی کی راہ میں تکالیف اور مصائب اٹھانے میں جو مزہ اور سکون حاصل ہوتا ہے وہ دنیاوی مشقتوں کی تکلیف میں نہیں ہوتا لیکن راہِ مولا کی تکالیف میں بھی راحت ہے۔

مجھ کو ارزانی رہے تجھ کو مبارک ہوجیو

نالۂ بلبل کا درد اور خندۂ گل کا نمک

فرماتے ہیں۔ مجھ کو دکھ درد کی بہتات رہے اور بلبل کے نالہ کا درد میرے لئے سوز و گداز مہیا کرتا رہے اور تجھ کو خندۂ گل کا نمک مبارک ہو۔ اسی طرح تو زندہ و سلامت رہے۔
اس شعر میں لف و نشر کی ترکیب ہے۔

شورِ جولاں تھا کنارِ بحر پر کس کا کہ آج　　　گردِ ساحل ہے بہ زخمِ موجۂ دریا نمک

فرماتے ہیں ۔ وہ کون سا محبوب تھا جس نے دریا کے کنارے ریت پر گھوڑا دوڑایا ہے جس کی وجہ سے گردِ ساحل اڑ اڑ کر موجۂ دریا میں پڑی جس نے زخم پر نمک چھڑکنے کا کام کیا ۔ مطلب یہ ہے کہ میرے محبوب کا گھوڑا موجِ دریا سے بھی تیز رفتار ہے جس سے موجۂ دریا کو رشک پیدا ہوا ۔

داد دیتا ہے مرے زخمِ جگر کی واہ وا　　　یاد کرتا ہے مجھے دیکھے ہے وہ جس جا نمک

فرماتے ہیں ۔ میرا محبوب جب کہیں نمک دیکھ پاتا ہے تو اس کو میرا زخمِ جگر یاد آ جاتا ہے اور وہ اس کی تعریف پر مجبور ہو جاتا ہے ۔

چھوڑ کر جانا تنِ مجروحِ عاشق حیف ہے　　　دل طلب کرتا ہے زخم اور مانگے ہیں اعضا نمک

فرماتے ہیں ۔ تنِ مجروحِ عاشق کو ایسے وقت میں چھوڑ کر جانا جبکہ دل زخم چاہتا ہے اور اعضائے بدن اپنے زخموں کے لئے نمک کے طالب ہیں قابلِ افسوس امر ہے ۔ یعنی چاہیئے یہ تھا کہ محبوب میرے زخموں میں نمک بھرتا اور دل میں کوئی نیا زخم لگاتا ۔

غیر کی منت نہ کھینچوں گا پئے توقیرِ درد　　　زخم مثلِ خندۂ قاتل ہے سرتاپا نمک

فرماتے ہیں ۔ میں درد کو بڑھانے کے لئے کسی غیر کی خوشامد نہ کروں گا کیونکہ خندۂ قاتل کی تیزی نے خود میرے زخموں کو نمک سے بھر دیا ہے ۔ یعنی قاتل کی خندہ زنی خود نمک کا کام دے رہی ہے ۔

یاد ہیں غالبؔ تجھے وہ دن کہ وجدِ ذوق میں　　زخم سے گرتا تو میں پلکوں سے چنتا تھا نمک

فرماتے ہیں ۔ غالب تو تو میرا ہمیشہ کا ساتھی ہے تجھے تو وہ دن ضرور یاد ہوں گے جب میں کتنا اذیت کوش تھا یہاں تک کہ جب میرے زخم سے نمک کے ذرے گر جاتے تھے تو میں، انہیں پلکوں سے چن کر پھر زخم پر رکھ لیتا تھا ۔
بات کا زخم ہے تلوار کے زخموں سے سوا ؛ کیجئے قتل مگر منہ سے کچھ ارشاد نہ ہو (شارح)

غزل ۷۶

آہ کو چاہیئے اک عمر اثر ہونے تک　　کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک

فرماتے ہیں ۔ آہ کو اک عمر چاہیئے کہ وہ اثر کرے ۔ اور تیری زلف ہمارے حال سے باخبر ہو ۔ اور تو نگاہِ لطف وعنایت ہماری طرف کرے لیکن ہم اُس وقت تک زندہ نہ ہوں گے ۔ مایوسی نامرادی وناکامی کا اظہار کیا ہے دوسرا مطلب یہ بھی ہے کہ تو نظرِ کرم جلد کر ہم اس قدر انتظار نہیں کر سکتے ۔

دام ہر موج میں ہے حلقۂ صد کامِ نہنگ　　دیکھیں کیا گزرے ہے قطرے پہ گہر ہونے تک

فرماتے ہیں ۔ ہر شعبۂ حیات میں مشکلات اور مصائب ہیں ۔ اُن سے نپٹنے اور درجۂ کمال حاصل کرنے میں کن کن مشکلات کو حل کرنا ہوگا ۔ بہت سی دشوار گذار گھاٹیوں کو طے کرنا ہوگا ۔ تب کہیں، جا کر کمال حاصل ہوگا ۔ (حلقۂ صد کامِ نہنگ ۔ صدہا مگرمچھوں کے منہ کا حلقہ

عاشقی صبر طلب اور تمنا بے تاب　　دل کا کیا رنگ کروں خونِ جگر ہونے تک

فرماتے ہیں ۔ عاشقی صبر چاہتی ہے اور تمنا جلدباز ہے کہ مقصد جلد حاصل ہو جائے۔ اب میں کیسے صبر کروں۔ کونسا حیلہ اختیار کروں۔ کہ دل خونِ جگر ہونے تک رہِ عشق میں مسلسل انتظار کرے۔ تاکہ آہ میں اثر پیدا ہو سکے اور مراد حاصل ہو جائے ۔

ہم نے مانا کہ تغافل نہ کرو گے لیکن ! خاک ہو جائیں گے ہم تم کو خبر ہونے تک

فرماتے ہیں ۔ ہم تسلیم کرتے ہیں کہ تم نہ غفلت کرو گے اور نہ تغافل کو کام میں لاؤ گے۔ جلد سے جلد ہماری خبر گیری کے لئے آجاؤ گے مگر اس کا کیا علاج کہ تم کو خبر ہوتے ہوتے ہم تو خاک کا ڈھیر بن جائیں گے ۔ کسی نے سچ کہا ہے کہ

تا تریاق آوردہ بود ÷ مارگزیدہ مردہ بود

دل کو تھاما تو ہے وعدے پہ تر ے ہم نے مگر ÷ دیکھیں کیا گزرے گی آمد کی خبر ہونے تک (شارح)

پرتوِ خور سے ہے شبنم کو فنا کی تعلیم میں بھی ہوں ایک عنایت کی نظر ہونے تک ۔

معنی ۔ پرتوِ خور ۔ آفتاب کی گرمی ، دھوپ

فرماتے ہیں ۔ آفتاب کی گرمی سے شبنم فنا ہو کر بخارات میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ میں بھی ایسے ہی تیری نظرِ عنایت سے فنا ہو جاؤں گا۔ مطلب یہ ہے کہ میری ہستی بھی شبنم سے کچھ زیادہ پائیدار نہیں ہے۔ بہت بے ثبات ہے لہٰذا مجھ پر نظرِ عنایت کرتا کہ میں فنا ہو کر ثبات حاصل کر لوں ۔ ؎ شکر اُس کا ہی کروں اپنی حقیقت کیا ہے ÷ خاک تھا میں تو یہاں اُس کی نظر ہونے تک (شارح)

یک نظر بیش نہیں فرصتِ ہستی غافل گرمیٔ بزم ہے اِک رقصِ شرر ہونے تک

فرماتے ہیں ۔ اے غافل انسان زندگی کا وقفہ بہت تھوڑا ہے۔ ایک نظر سے زیادہ نہیں اور مثال پیش کرتے ہیں کہ بزمِ ہستی (گرمیٔ بزم) کی گرما گرمی اک رقصِ شرر ہونے تک ہے یعنی جیسے شرر اپنی چمک دکھلا کر جلد مٹ جاتا ہے یہی حال تیری زندگی کے وقفہ کا ہے ۔

غمِ ہستی کا اسدؔ کس سے ہو جز مرگ علاج ۔ شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

فرماتے ہیں غمِ ہستی کا اسدؔ سوائے مرگ کے کوئی علاج نہیں جیسا کہ شمع کو ہر محفل میں سحر ہونے تک جلنا ضرور ہے۔ چاہے محفلِ شادی ہو یا محفلِ غم۔ شمع کو ہر حال میں جلنا ہے۔ زندگی رو کر گزرے یا ہنس کر ہر حالت میں گزارنی ہے۔ ایک دوسری جگہ فرماتے ہیں ۔ ؎

قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں ۔ موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

فرق کیا تھوڑے اُجالے میں کرے گا کوئی ؛ ظُلمت و نُور کی ہے جنگ سحر ہونے تک (شارح)

غزل ۲۲

گر تجھ کو ہے یقینِ اجابت دعا نہ مانگ ۔ یعنی بغیرِ یک دلِ بے مُدعا نہ مانگ

فرماتے ہیں ۔ اگر تجھے یقین ہے کہ تیری دُعا قبول ہو جائے گی تو پھر سوائے دلِ بے مُدعا کے اور کوئی دُعا نہ مانگ۔ جب دلِ بے مُدعا حاصل ہو جائے گا تو تیری کوئی خواہش باقی نہیں رہے گی اور جب کوئی خواہش ہی نہ ہو گی تو تجھے کسی چیز کی ضرورت بھی باقی نہ رہے گی اور اس سے بڑھ کر اور کیا دُعا ہو سکتی ہے

آتا ہے داغِ حسرتِ دل کا شمار یاد ۔ مُجھ سے مرے گنہ کا حساب اے خدا نہ مانگ

فرماتے ہیں ۔ ناکردہ گناہوں کی وجہ سے داغِ حسرتِ دل میں بے شمار ہیں لہٰذا اے میرے خدا مجھ سے میرے گناہوں کا حساب نہ مانگ ۔ ورنہ میں ناکردہ گناہوں کو بھی اُن گناہوں میں شامل کروں گا جو میں نے نہیں کئے ہیں ۔ تیرا فرمان ہے کہ تو اُن گناہوں کو شمار کرتا ہے جو وقوع میں آ گئے یعنی سرزد ہو گئے ۔

غزل ۸۷

ہے کس قدر ہلاکِ فریبِ وفائے گُل ۔۔۔ بُلبُل کے کاروبار پہ ہیں خندہ ہائے گُل

فرماتے ہیں ۔گُل کی وفا کا فریب کتنا مہلک ہے کہ بُلبل سمجھتی ہے کہ اُس کی وفاداری کو قیام وثبات ہے ۔حالانکہ یہ گُل کا فریب ہے ۔اور اپنے فریب کی کامیابی پر گُل خوش ہیں اور ہنس رہے ہیں اور قہقہے لگا رہے ہیں (خندہ ہائے گُل) ہر عاشق کی نگاہ میں اُس کے محبوب کا حُسن وجمال کبھی مٹنے والا نہیں مگر یہ سراسر اس کی بھول ہے ۔ماسوا اللہ تعالےٰ کے ہر شے فانی ہے اور کسی شے کو قیام وثبات نہیں ہے ۔اور گُل کی بے ثباتی تو اظہر من الشمس ہے ۔

آزادیٔ نسیم مبارک کہ ہر طرف ۔۔۔ ٹوٹے پڑے ہیں حلقۂ دامِ ہوائے گُل

معنی :۔ آزادیٔ نسیم ۔ بوئے گُل ۔ ہوائے گُل ۔ شوقِ گُل

فرماتے ہیں ۔بوئے گُل کو مبارک ہو کہ چمن میں ہر طرف پھول کِھل گئے اور خوشبو سے سارا چمن مہک رہا ہے ۔یعنی بوئے گُل آزاد ہے ۔

یہ بھی مطلب ہو سکتا ہے کہ آسمان سے نُور نازل ہو چکا ہے اور اللہ تعالیٰ جو گُلِ حقیقی ہے اس سے وصال کے ذرائع معلوم ہو گئے ہیں جو مدتوں سے راز ہائے سربستہ تھے ۔اہلِ دُنیا کو ان علوم کا کھل جانا مبارک ہو ۔

جو تھا سو موجِ رنگ کے دھوکے میں مر گیا ۔۔۔ اے وائے نالۂ لبِ خونیں نوائے گُل

معنی رنگِ گل ۔ موجِ رنگِ گل ۔

فرماتے ہیں ۔ جس شخص نے نظر ڈالی وہ اُس پر فریفتہ ہوگیا اور اپنے آپ کو تباہ کر بیٹھا۔ صد افسوس
کہ گُل کی پکار جان لینے والی اور مہلک ثابت ہوئی ۔
مطلب یہ ہے کہ جس نے بھی دُنیا کو گُلِ مراد بنایا اور اُس کی زنگارنگی پر فریفتہ ہوگیا اُس
نے خود کو تباہ کر لیا۔ یعنی دُنیا کی پکار پر لبیک کہنا بربادی کو دعوت دینا ہے ۔

خوش حالُ اس حریفِ سیہ مست کا کہ جو ۔ رکھتا ہو مثلِ سایۂ گل سر بہ پائے گُل

فرماتے ہیں ۔ وہ عاشق خوش نصیب ہے جو سایۂ گُل کی طرح اپنا سر گُل کے قدموں میں رکھتا ہے
حریفِ سیہ مست بمعنی ہم پیشہ، عاشق ہے اور گُل سے مراد محبوب ۔
مطلب یہ ہے کہ وہ لوگ خوش نصیب ہیں جو اپنے وقت کے فنا فی اللہ ولیوں کو پہچان لیتے
اور سایہ کی طرح اُن کے قدموں میں رہتے ہیں یعنی فرمانبرداری کرتے ہیں ۔ اور گُل سے
مراد معشوقِ ازلی ہے۔ میں اُس قسم کے معنی اس لئے کرتا ہوں کہ غالب اپنے کلام کے متعلق
خود کہہ چکے ہیں کہ میرا کلام تصوّف کی جان ہے ۔ ۔

ایجاد کرتی ہے اسے تیرے لئے بہار ۔ میرا رقیب ہے نفسِ عطر سائے گُل

فرماتے ہیں ۔ بہار پھولوں کو اس لئے پیدا کرتی ہے کہ میرے رقیب بنیں ۔ میرا محبوب پھولوں کا ہار
پہنے گا یا پھولوں سے بنا ہوا عطر لگائے گا۔ جو کہ ہر وقت اُس کے ساتھ ہوگا۔ اور میں سب
کچھ دیکھ کر آتشِ رشک میں جلوں گا کہ مجھے محبوب کا یہ قرب نصیب نہ ہوا ۔

شرمندہ رکھتے ہیں مجھے بادِ بہار سے ۔ مینائے بے شراب و دلِ بے ہوائے گُل

فرماتے ہیں ۔ بظاہر تو معنی یہی ہیں کہ جب میرے شیشہ میں شراب نہیں ہوتی اور دل وصلِ محبوب کے
جنون سے خالی ہوتا ہے ۔ تو میں بادِ بہاری سے شرمندہ رہتا ہوں کیونکہ میں نے اس کے اثرات

کو قبول کرنے میں کوتاہی کی۔

سطوت سے تیرے جلوۂ حُسنِ غیور کی　　خوں ہے مری نگاہ میں رنگِ ادائے گُل

فرماتے ہیں۔ تیرے جلوۂ حسنِ غیور کے رُعب سے گُل کی تمام رنگینیاں اور رعنائیاں میری نظر میں ہیچ ہو گئی ہیں اور اُس کی قدر و قیمت میری نگاہ میں کچھ نہیں۔ تیرے جلوۂ حُسن کی غیرت نہیں چاہتی کہ میں کسی اور سے دل لگاؤں۔ اگر حقیقت کی طرف لے جائیں تو مطلب یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ غیور ہے اور اسے اپنی یکتائی میں کسی اور کی شرکت گوارا نہیں۔ لہٰذا میری نگاہ میں بھی رنگینیٔ جہاں کا کوئی اثر باقی نہیں رہا۔ ؎

اُس بہارِ حسن کا دل میں ہمارے جوش ہے
مت کرو کچھ ذکر ہم سے ترک یا تاتار کا

تیرے ہی جلوہ کا ہے یہ دھوکا کہ آج تک　　بے اختیار دوڑے ہے گُل در قفائے گُل

فرماتے ہیں۔ چمن میں بہار کے آنے کو گل تیرا آنا اور تیرا جلوہ سمجھتے ہیں تبھی تو ازل سے آج تک ان کو دھوکا لگا ہوا ہے اور وہ یکے بعد دوسرے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر تجھے دیکھنا چاہتے ہیں اور کھلتے چلے جاتے ہیں۔

غالبؔ مجھے ہے اُس سے ہم آغوشی آرزو　　جس کا خیال ہے گُلِ جیبِ قبائے گُل

فرماتے ہیں۔ اے غالبؔ میرے دل میں اُس سے ہم آغوشی کی آرزو ہے جس کے خیال کو گل نے اپنے دل میں بسا رکھا ہے اور اسی وجہ سے گُل کا گریبان لائقِ دید بن گیا ہے۔ یعنی محبوبِ حقیقی سے وصال کی آرزو ہے۔

غزل ۷۹

غم نہیں ہوتا ہے آزادوں کو بیش از یک نفس

برق سے کرتے ہیں روشن شمعِ ماتم خانہ ہم

فرماتے ہیں ۔ غم دُنیا ہم آزاد لوگوں کو تھوڑی دیر کے لئے ہوتا ہے گویا ہمارے ماتم کدہ میں آن واحد کے لئے برق شمع کو روشن کر کے چلی جاتی ہے اور غم کا خیال حرفِ غلط کی طرح ہمارے دل سے مٹ جاتا ہے ۔

مطلب یہ کہ ہم دُنیا کے قید و بند سے آزاد ہو چکے ہیں ۔ غم دنیا یعنی دُنیا کا مال و متاع تلف ہونے پر دَم بھر ملال ہوتا ہے ۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیۡہِ رَاجِعُوۡن پڑھتے ہیں صبر کر لیتے ہیں ۔ یعنی اس غم کو آزمائش سمجھ کر ہم میدانِ معرفت میں کچھ اور ترقی کر لیتے ہیں اور شمعِ دل کو کچھ اور روشن کر لیتے ہیں ۔

محفلیں برہم کرے ہے گنجفہ بازِ خیال ہیں ورق گردانیِ نیرنگِ یک بُت خانہ ہم

گنجفہ ایک کھیل ہے جو ۹۶ پتوں کے ساتھ کھیلا جاتا ہے ۔ گنجفہ باز ۔ گنجفہ کھیلنے والا نیرنگِ بُت خانہ ۔ نشاط کی محفلیں ۔ حسینوں کی تصاویر

فرماتے ہیں ۔ گنجفہ باز کو کھیلتے ہوئے دیکھتے ہیں تو وہ گذری ہوئی نشاط کی محافل ہمارے ذہن میں ایک ایک کر کے آنی شروع ہو جاتی ہیں جس طرح گنجفہ باز اپنے پتوں کو اپنی انگلیوں پر پھیلا کے ان کی ورق گردانی کرتا رہتا ہے اسی طرح ہم بھی ان حسینوں کی تصویریں اپنے خیال میں لاتے ہیں جن سے ہم نشاط کی محفلوں میں ملا کرتے تھے ۔

ہیں چراغانِ شبستانِ دلِ پروانہ ہم　　　باوجودِ یک جہاں، ہنگامہ پیدائی نہیں

فرماتے ہیں۔ باوجود اِس کے دِل پروانہ شمع کے شوق میں ہنگامہ آرائی میں مصروف ہے مگر خود اس کی ہستی معدوم ہے یعنی پیدائی نہیں۔ یہی حال انسانی زندگی اور اس کی ہستی کا ہے۔ یعنی کوئی حقیقت ہی نہیں۔ صرف ایک ہی ہستی ہے اور وہ ذاتِ خداوند ہے۔

ہیں وبالِ تکیہ گاہِ ہمتِ مردانہ ہم　　　ضعف سے ہے، نے قناعت سے یہ ترکِ جستجو

فرماتے ہیں۔ ہم نے جو ترکِ جستجو کیا ہے وہ قناعت کے سبب نہیں ہے بلکہ کمزوری کی وجہ سے ہے ہم میں طاقت و قوت نہیں ہمت ہار بیٹھے ہیں۔ ہم تو ہمتِ مردانہ کی تکیہ گاہ پر وبال بن گئے ہیں۔ اُس کے محافظ اور مجاور نہیں بنے مطلب یہ ہے کہ ہم جو قربِ الٰہی کی جستجو نہیں کر رہے اس کا سبب ہمارے ایمان کی کمزوری ہے نہ کہ ہمیں وہ مل گیا ہے اور ہم قانع ہو گئے۔ اس کا قناعت سے کوئی تعلق نہیں۔ کیونکہ راہِ مولا میں قناعت کی نہیں بلکہ جہدِ مسلسل کی ضرورت ہے۔

جانتے ہیں سینۂ پُرخوں کو زنداں خانہ ہم　　　دائم الحبس اس میں ہیں لاکھوں تمنائیں اسدؔ

فرماتے ہیں۔ ہمارا سینۂ پُرخوں جیل خانہ ہے جس میں ہماری تمناؤں کو عمر قید ہو گئی ہے یعنی وہ کبھی پوری نہیں ہوں گی اور اس جیل خانہ سے کبھی نہ نکل پائیں گے۔ مگر خدا کے فضل و کرم سے پوری ہو سکتی ہیں۔

بھروسہ ہے کسی پر ہم کہاں مشکل سمجھتے ہیں ؛ اگرچہ دُور ہے، نزدیک ہم منزل سمجھتے ہیں

(شارح)

غزل ۸۰

بہ نالہ حاصلِ دل بستگی فراہم کر ‏ ‏ ‏ متاعِ خانۂ زنجیر جُز صدا معلوم

فرماتے ہیں ۔ نالہ و بکا۔ آہ و فغاں۔ عجز و نیاز کے ذریعہ دل کی مراد حاصل کر۔ کیونکہ خانۂ زنجیر کا سرمایہ سوائے جھنکار کے اور کچھ نہیں۔ تعلق خاطر کو زنجیر سے تشبیہ دی ہے

غزل ۸۱

مجھ کو دیارِ غیر میں مارا وطن سے دُور ‏ ‏ ‏ رکھ لی مرے خدا نے مری بیکسی کی شرم

فرماتے ہیں ۔ اچھا ہوا مجھ کو موت پردیس میں آئی ۔ میرے خدا نے میری بیکسی کی لاج رکھ لی ۔ پردیس میں بے گور و کفن ہوں تو کون جانتا ہے کہ یہ کون ہے۔ وطن میں ایسی حالت میں مرتا تو بے حد ذلت و رسوائی کا موجب ہوتا۔

وہ حلقہ ہائے زلف کمیں میں ہے اے خدا ‏ ‏ ‏ رکھ لیجو میرے دعویٰ وارستگی کی شرم

معنی۔ وارستگی = آزادگی، پرہیزگاری ۔

فرماتے ہیں۔ یہ پیچ در پیچ زلفوں والی حسینہ (دُنیا) میری ہر وقت گھات میں ہے ۔ اے میرے خدا! میرے دعویٔ آزادگی و پرہیزگاری کی لاج رکھ لے ۔ میں کہیں اس کی زلفوں کا اسیر نہ ہو جاؤں۔

توفیق دے خدا جسے پاتا ہے وہ نجات ÷ دُنیا ہے ورنہ گھات میں ہر دم لگی ہوئی

(شارح)

غزل ۸۲

غالبؔ یہ خوف ہے، کہ کہاں سے ادا کروں　　　　لوں وام بختِ خفتہ سے یک خوابِ خوش ولے

فرماتے ہیں۔ بختِ خفتہ سے ایک رات کی میٹھی نیند قرض تو لے سکتا ہوں مگر خوف یہ لاحق ہے کہ اس کی ادائیگی کیسے ہوگی کیونکہ اپنے مقدر میں تو کوئی نیند نہیں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ میری قسمت میں سکون نہیں ہے۔ اگر میں اپنی قسمت سے اُدھار بھی لے لوں تو کہاں سے ادا کروں۔ میرے پاس تو پریشانیوں کے سوا کچھ بھی نہیں۔ وام سے مراد قرض اُدھار۔

غزل ۸۳

وہ شب و روز و ماہ و سال کہاں　　　　وہ فراق اور وہ وصال کہاں

فرماتے ہیں۔ عہدِ جوانی گزر گیا وقتِ پیری آ گیا اب اپنی پڑی ہے۔ نہ فراق ہے نہ وصال ہے۔ عہدِ جوانی میں، فراق کی راتیں کاٹنا گو پہاڑ کے کاٹنے سے کم نہ تھا لیکن وہ بھی یادِ پارینہ بن گیا۔ اور وصلِ محبوب کے لطف بھی محو ہو گئے۔ بس ان کی یاد باقی ہے۔ وہ رات دن وہ ماہ و سال جس سے کبھی رنج تھا کبھی عیش تھا۔ گزر گئے۔ وہ ذوق و شوق بھی کافور ہو گیا۔

ذوقِ نظارۂ جمال کہاں　　　　فرصتِ کاروبارِ شوق کسے

فرماتے ہیں۔ وہ ذوق و شوق کی مصروفیات ختم ہو گئیں۔ اور نظارۂ جمال کی آرزو بھی نہیں رہی۔ اب تو

وقتِ رحلت قریب ہے۔ شاہدِ حقیقی سے دل لگانا ہے اور اُسی کے وصال کی تمنا ہے۔ ان حسینانِ جہاں کے فراق و وصال کے زمانے ختم ہو گئے۔

دِل تو دِل وہ دماغ بھی نہ رہا　　　شورِ سودائے خطّ و خال کہاں

فرماتے ہیں۔ وہ دل جس میں ذوق و شوق بھرا تھا مٹ گیا لیکن افسوس تو یہ ہے کہ وہ دماغ بھی باقی نہ رہا جس میں سودائے خط و خال ہوا کرتا تھا۔
مطلب یہ ہے کہ نہ صرف آرزوئیں اور تمنائیں مٹیں بلکہ ان کی یاد بھی کھو بیٹھے۔

تھی وہ اک شخص کے تصوّر سے　　　اب وہ رعنائی خیال کہاں

فرماتے ہیں۔ میرے کلام میں حُسن و رعنائی کسی حسین و جمیل پیکر کے تصور کا نتیجہ تھی جب سے وہ تصور ختم ہوا کلام کا سارا حُسن جاتا رہا۔

ایسا آساں نہیں لہو رونا　　　دل میں طاقت جگر میں حال کہاں

فرماتے ہیں۔ فراقِ یار میں خون کے آنسو بہانا آسان کام نہیں۔ یہ بڑے جگر گردے کا کام ہے۔ اس راہ میں خونِ دل خونِ جگر سب خرچ ہو گئے۔ نہ دل میں طاقت ہے نہ جگر میں حال۔

ہم سے چھوٹا قمار خانۂ عشق　　　واں جو جاویں گرہ میں مال کہاں

فرماتے ہیں۔ ہم سے قمار خانۂ عشق ہمیشہ کے لئے چھوٹ گیا۔ اب وہاں جا کر ہم کریں گے کیا۔ نہ ہماری جیب میں کوئی پیسہ ہے۔ حالانکہ قمار خانے میں رقم کی ضرورت ہوتی ہے۔

فکرِ دُنیا میں سر کھپاتا ہوں　　　میں کہاں اور یہ وبال کہاں

فرماتے ہیں۔ میرا مزاج عاشقانہ تھا۔ غمِ عشق میری دولت تھی۔ ہجر و وصال کے رنج و عیش سے میرا واسطہ تھا۔ فرقت کے غم اٹھاتا تھا اور وصل کی لذتیں حاصل تھیں۔ مجھے غمِ دُنیا سے کوئی تعلق نہ تھا میں تو غمِ دُنیا کو اک وبال ایک مصیبت سمجھتا تھا لیکن وائے قسمت کہ اُس نے مجھ جیسے آزاد کو دنیا کے بکھیڑوں میں پھنسا دیا۔

مضمحل ہو گئے قویٰ غالبؔ وہ عناصر میں اعتدال کہاں

فرماتے ہیں۔ عہدِ جوانی گذر گیا اور شباب کی توانائیاں ختم ہو گئیں۔ میرے قویٰ میں کبر سنی نے بے اعتدالیاں پیدا کر دیں۔

غزل ۸۴

کی وفا ہم سے تو غیر اُس کو جفا کہتے ہیں ہوتی آئی ہے کہ اچھوں کو بُرا کہتے ہیں

فرماتے ہیں۔ ہمارے محبوب نے جب سے سلوکِ محبت و وفاداری کیا تو ہمارے رقیبوں نے اس کو جفا سے تعبیر کیا۔ یہ تو اس دُنیا کا دستور ہے کہ رشک و حسد میں اچھوں کو بُرا کہتے ہیں۔

آج ہم اپنی پریشانیِ خاطر اُن سے کہنے جاتے تو ہیں پر دیکھئے کیا کہتے ہیں

فرماتے ہیں۔ آج ہم اُن سے اپنی پریشانی کا حال کہنے چل تو دیئے مگر بار بار یہ خیال آتا ہے اور دل میں یہ خوف بھی ہے کہ اُن کے رُعبِ حُسن سے ہم کچھ کہہ بھی سکیں گے یا نہیں۔
اگر کیا کہتے ہیں کا فاعل محبوب کو سمجھا جائے تو معنی یہ ہوں گے کہ نہیں معلوم ہمارے سوال کا جواب محبوب کیا دیتا ہے۔ لیکن ہمارا لطف تو پہلے معنی میں ہی ہے۔
کہنے جاتے تو ہیں پر دیکھئے کیا کہتے ہیں۔

اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ انہیں کچھ نہ کہو جو مے و نغمہ کو اندوہ رُبا کہتے ہیں

فرماتے ہیں ۔ جو لوگ شراب اور گانے کو غم غلط کرنے کا سامان اور عیاشی سمجھتے ہیں ۔ وہ دقیانوسی خیالات والے پرانے ، بھولے بھالے اور سادہ طبیعت کے مالک لوگ ہیں ۔ اُن سے اُلجھنے کی ضرورت ہے نہ کچھ کہنے کی ضرورت ۔ حقیقت یہ ہے کہ مئے اور نغمہ غم کو مٹاتے نہیں بلکہ بڑھاتے ہیں ۔ چونکہ سامانِ نشاط سے دل پر چوٹ لگتی اور محبوب کی یاد زیادہ ہو جاتی ہے ۔

معنی اندوہ رُبا ۔ غم کو دُور کرنے والا ۔ ربایدن مصدر ، اُچک لینا

دل میں آجائے ہے ہوتی ہے جو فرصت غش سے اور پھر کون سے نالے کو رسا کہتے ہیں

فرماتے ہیں ۔ جب مجھے بیہوشی سے فرصت ملتی ہے تو میرا محبوب ، فوراً میرے دل میں آجاتا ہے ۔ اب بتایئے کہ اس حالت میں نالہ کی رسائی سے کیسے انکار کیا جا سکتا ہے مطلب یہ ہے کہ میں دُنیا کے دھندوں میں مدہوش و بیہوش ہوں اور اپنے حواس کھو بیٹھا ہوں ۔ لیکن جونہی ذرا سا بھی ہوش آتا ہے تو میرا محبوب فوراً میرے دل کی زنجیر ہلا کر مجھے ہوشیار کر دیتا ہے اور میرے دل میں دُنیا کی محبت سرد ہو جاتی ہے اور میرے دل میں محبتِ الٰہی جوش مارنے لگتی ہے ۔ یہ میرے اُس نالہ کی رسائی نہیں تو اور کیا ہے ، جو میں دنیاوی علائق میں گھرے ہونے کے باوجود اپنے اصلی مقصد سے دُور ہونے کی وجہ سے کھینچتا رہتا ہوں ۔ حضرت جگر مراد آبادی ۔ نے کیا خوب کہا ہے ۔ ؎

تجھ سے غافل ترے وحشی نہیں ہونے پاتے
روز آکر کوئی زنجیر ہلا دیتا ہے

ہے پرے سرحدِ ادراک سے اپنا مسجود قبلہ کو اہلِ نظر قبلہ نما کہتے ہیں

فرماتے ہیں ۔ جس کو ہم سجدہ کرتے ہیں جس کی ہم عبادت کرتے ہیں وہ کعبہ نہیں ہے بلکہ اہلِ دانش جانتے ہیں کہ وہ قبلہ نما یعنی قبلہ کو دکھانے والا ہے ۔ خود نہیں ہے بلکہ اللہ تعالےٰ کے نشانوں میں سے ایک نشان ہے ۔

پائے افگار پہ جب سے تجھے رحم آیا ہے　　　خارِ رہ کو ترے ہم مہر گیاہ کہتے ہیں

فرماتے ہیں ۔ ہمارے زخمی پیروں کو دیکھ کر تجھے ہم پر رحم آیا ہے۔ ہم تیرے راستے کے کانٹوں کو مہر گیاہ کہتے ہیں (مہر گیاہ ایک بوٹی کو کہتے جس کی جڑ انسان کی شکل سے مشابہت رکھتی ہے بشناہے، یہ بوٹی جس کے پاس ہوتی ہے اُس پر لوگ مہربان ہوتے ہیں یعنی وہ اپنے اندر رُعب کا اثر رکھتی ہے ۔

اِک شرر دل میں ہے اُس سے کوئی گھبرائے گا کیا　　　آگ مطلوب ہے ہم کو جو ہوا کہتے ہیں

فرماتے ہیں ۔ دل میں گرمی خون کی وجہ ایک چنگاری ہے جس سے ہر وقت آگ کو جلاتے رہنا مقصود ہے اور آگ جلانے کے لئے OXYGEN کی ضرورت ہوتی ہے جو ہوا میں ہے وہ خون میں تحلیل ہو کر تمام اعضا کو ایک خاص درجۂ حرارت پر رکھ کر قوت بخشتی ہے ۔

دیکھئے لاتی ہے اُس شوخ کی نخوت کیا رنگ　　　اُسکی ہر بات پہ ہم "نامِ خدا" کہتے ہیں

فرماتے ہیں ۔ ہم اُس کی ہر بات پر ماشاءاللہ بسم اللہ کہتے رہتے ہیں۔ اسی وجہ سے اس کی نخوت بڑھتی جارہی ہے ۔ خدا ہی جانے کہ انجام کار یہ نخوت کیا رنگ لائے گی ۔

وحشتؔ و شیفتہؔ اب مرثیہ کہویں شاید　　　مر گیا غالبؔ آشفتہ نوا کہتے ہیں

مطلب صاف ہے ۔ غلام علی وحشتؔ غالبؔ کے شاگرد نہ تھے لیکن معتقد ضرور تھے ۔ نواب مصطفٰے خان بہادر شیفتہؔ رئیس جہانگیر آباد اصلاح لیتے تھے ۔

دُنیا نے کس کا راہِ فنا میں دیا ہے ساتھ ؛ تم بھی چلے چلو یونہی جب تک چلی چلے

(حضرت ذوقؔ)

غزل ۸۵

آبرو کیا خاک اُس گل کی کہ گلشن میں نہیں

ہے گریباں ننگِ پیراہن جو دامن میں نہیں

فرماتے ہیں ۔ اس پھول کی عزت کچھ نہیں جو گُلشن سے نکل گیا اور بازار میں جا کر کوڑیوں کے مول بِک گیا۔ اسی طرح اگر گریبان دامن سے جدا ہو جائے تو وہ پیرہن کی زینت نہیں بنتا بلکہ اُس کی بے عزّتی کا سبب بن جاتا ہے ۔ میرے نزدیک یہاں یہ مضمون بھی ہے کہ وہ جوہرِ قابل ہستیاں جو دوسری قوموں کو اپنی قابلیت بیچ دیتی ہیں اور اُن کی قابلیت سے ملک و ملت کو کوئی فائدہ نہیں پہنچتا۔ بلکہ اس کا برعکس بھی قابلِ مذمت ہے کہ قوم خود ہی اپنے قابل لوگوں کی قدر نہ کرے اور اور وہ مجبور ہو جائیں وطن چھوڑنے پہ۔

چن لئے ہم نے بقدرِ ظرف اس گلشن میں پھول ؛ کیا ہوا اگر سارا گلشن اپنے دامن میں نہیں (شارح)

ضعف سے اے گریہ کچھ باقی مرے تن میں نہیں

رنگ ہو کر اُڑ گیا، جو خوں کہ دامن میں نہیں

فرماتے ہیں ۔ اے گریہ تو نے میرے جسم میں کچھ بھی باقی نہیں رہنے دیا۔ سب لہو آنسوؤں کے راستے بہا دیا۔ جو دو چار قطرے خون کے بچ رہے تھے ۔ اور ہمارے دامن میں گرے تھے وہ بھی رنگ بن کر اُڑ گئے ۔

ہو گئے ہیں جمع اَجزائے نگاہِ آفتاب

ذرّے اُس کے گھر کی دیواروں کے روزن میں نہیں

فرماتے ہیں ۔ روزنِ دیوارِ یار میں جو خاک کے ذرّے نظر آتے ہیں وہ دراصل اجزائے نگاہِ آفتاب ہیں اور وہ شوقِ دیدار میں اکٹھے ہو رہے ہیں تاکہ محبوب کا دیدار کر سکیں ۔

کیا کہوں تاریکیِ زندانِ غم اندھیر ہے   پنبہ نورِ صبح سے کم جسکے روزن میں نہیں

فرماتے ہیں زندانِ غم کے اندھیرے کا کیا کہوں چاروں اطراف میں اندھیرا ہی اندھیرا ہے کچھ نظر نہیں آتا۔ یہ سمجھ لو کہ روزنِ دیوار میں جو روئی کی گولی بنا کر رکھ دی تھی وہ نورِ صبح یعنی صبح کی سفیدی کی طرح چمک رہی ہے ۔

رونقِ ہستی ہے عشقِ خانہ ویراں ساز سے   انجمن بے شمع ہے گر برق خرمن میں نہیں

فرماتے ہیں ۔ دنیا میں ساری رونق اور چہل پہل عشق و محبت کی وجہ سے ہے کسی کو اپنی محبوبہ سے کسی کو اپنی اولاد سے کسی کو اپنے مال سے کسی کو حکومت سے بغرض کسی نہ کسی رنگ میں ہر جگہ محبت ہی کارفرما ہے۔ پس اگر خرمن میں برق نہیں یعنی دلوں میں محبت نہیں تو یہ سمجھ لو کہ انجمن میں شمع نہیں اور ساری انجمن بے نور ہے ۔

زخم سلوانے سے مجھ پر چارہ جوئی کا ہے طعن

غیر سمجھا ہے کہ لذتِ زخمِ سوزن میں نہیں

فرماتے ہیں ۔ زخم کو سلوانے پر مجھے غیر طعنہ دیتے ہیں کیا انہیں معلوم نہیں کہ ٹانکے دلوانے سے سوئی کے جو زخم ہوتے ہیں ان سے بھی ایسی ہی تکلیف ہوتی ہے جیسے تیر یا تلوار کا زخم لگتے وقت لذت کا لفظ تکلیف کے معنی میں کس خوبی سے استعمال کیا ہے ۔

بسکہ ہیں ہم اِک بہارِ ناز کے مارے ہوئے   جلوۂ گل کے سوا گرد اپنے مدفن میں نہیں

فرماتے ہیں ۔ ہم ایک بہارِ ناز کے کشتۂ حسن ہیں [illegible]ن میں بھی اسی بہارِ ناز کا تصور پیشِ نظر رہتا ہے ۔ (سوائے خدا تعالے کے [illegible]ورن بہارِ ناز ہو سکتا ہے ؟)

قطرہ قطرہ اک ہیولیٰ ہے نئے ناسور کا   خوں بھی ذوقِ درد سے فارغ مرے تن میں نہیں

فرماتے ہیں ۔ میرے تن میں جس قدر خون ہے اس کا ایک ایک قطرہ ذوقِ درد سے مملو ہے۔ اور اسی شوق میں مگن ہے چونکہ ہر قطرۂ خون کی ماہیت اور مادہ ناسور کی حیثیت رکھتا ہے۔ اگر وہ یہ اختیار کرلیں تو تکلیف اور درد کا باعث ہوگا یعنی ذوقِ فنا اختیار کریں تو خون کے قطرے جہاں جہاں ہیں وہاں ناسور ہوں گے۔

لے گئی ساقی کی نخوت قلزم آشامی مری   موجِ مے کی آج رگ مینا کی گردن میں نہیں

فرماتے ہیں ۔ میرے ساقی کو شراب پلانے پر بہت غرور تھا لیکن میری قلزم آشامی نے اس کی نخوت کو یکسر مٹا دیا کیونکہ شراب کا ایک قطرہ بھی میں نے مینا میں نہ چھوڑا ساری شراب پی گیا میں تو شراب کا سمندر پینے والا ہوں۔ مطلب یہ کہ میرا ظرفِ دل بہت بڑا ہے۔

ہو فشارِ ضعف میں کیا ناتوانی کی نمود؟   قد کے جھکنے کی بھی گنجائش مرے تن میں نہیں

فرماتے ہیں۔ ضعف نے مجھے اس قدر نچوڑ لیا ہے کہ اب اظہارِ ناتوانی بھی نہیں کر سکتا۔ میں جھک بھی نہیں سکتا کیونکہ اس کے لئے بھی کچھ طاقت کی ضرورت ہوتی ہے جو میرے تن میں باقی نہیں ۔ ؎ یوں تو ہیں لاکھوں حسیں دنیا میں ہر طرف ؛ دلربائی دلکشی اس کی کسی تن میں نہیں
(شارح)

تھی وطن میں شان کیا غالبؔ کہ ہو غربت میں قدر

بے تکلف ہوں وہ مشتِ خس کہ گلخن میں نہیں ۔

فرماتے ہیں ۔ اپنے آپ کو سوکھی گھاس اور وطن کو بھٹی (گلخن) سے تشبیہ دی ہے جو پھوس گلخن میں نہیں جلتا اور باہر ہوتا ہے اس کی بھی کچھ قدر نہیں ۔ مطلب یہ ہے کہ جب وطن میں تھے تو وہاں بھی کوئی خاص شان نہیں تھی۔ اور اب پردیس میں بھی مشتِ خس کی طرح ناقدری کا شکار ہیں ۔

غزل ۸۶

عہدے سے مدحِ ناز کے باہر نہ آسکا   گر اِک ادا ہو تو اُسے اپنی قضا کہوں

فرماتے ہیں میں اپنے محبوب کے ناز و ادا کی تعریف کما حقہٗ نہ کر سکا۔ اپنے فرض کو ادا نہ کر سکا۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کے ناز و انداز بے شمار ہیں اگر ایک ادا ہوتی تو شاید عہدہٗ مداحی سے عہدہ برآ ہو سکتا تھا۔

مطلب یہ ہے کہ محبوبِ حقیقی کی صفات لاتعداد ہیں اس لئے اس کی ثنا و صفت کا حق ادا نہیں ہو سکا۔ نہ ہو سکتا ہے جیسا کہ وہ خود اپنے کلام میں فرماتا ہے۔ ماقدر اللہ حق قدرہٖ۔

حلقے ہیں چشم ہائے کشادہ بسوئے دل   ہر تارِ زلف کو نگہِ سُرمہ سا کہوں

فرماتے ہیں تیری زلفوں کے گھونگر آنکھیں پھاڑے ہوئے میرے دل کی گھات میں ہر وقت لگے ہوئے ہیں تاکہ مجھے اپنا قیدی بنالیں۔ لہٰذا مناسب ہے کہ میں تیری زلفوں کے ہر بال کو نگہ سرمہ سا کہوں۔

مطلب یہ ہے کہ محبوبِ ازلی کا حسن ہر شے میں رچا ہوا ہے جو ہر وقت انسان کو دعوتِ نظارہ دے رہا ہے اور زبانِ حال سے کہہ رہا ہے کہ آؤ میری طرف آؤ مجھ سے تعلق قائم کرو۔ جن کو تم میرا شریک بتاتے ہو ان میں ایسی صفاتِ حسنہ و اعلیٰ کہاں ہیں۔

مَیں، اور صد ہزار نوائے جگر خراش   تُو، اور ایک وہ نہ شنیدن کہ کیا کہوں

فرماتے ہیں میرے رات دن لاکھوں، جگر خراش نالے ہیں۔ اور تو ہے کہ سنی ان سنی ایک کئے ہوئے ہے۔ میں کیا کروں۔ مطلب یہ ہے کہ میری حاجتیں لاکھوں ہیں جن کے لئے میں تیرے حضور ملتجی رہتا ہوں۔ مگر تیری شانِ بے نیازی ہے۔ جب مناسب سمجھے گا میری حاجت روائی کرے گا چونکہ تیری ذاتِ اقدس الصمد ہے۔

ظالم مرے گماں سے مجھے منفعل نہ چاہ ۔ ہَے ہَے خُدا نہ کردہ تجھے بے وفا کہوں

فرماتے ہیں۔ ظالم میرے گمان سے مجھے شرمندہ نہ کر۔ خدا نہ کرے کہ میں تجھے بے وفا کہوں۔
مطلب یہ ہے کہ اے میرے محبوبِ ازلی میں تو تجھے ہر اعلیٰ صفات سے متصف سمجھتا ہوں تو مجیب ہے، غفور رحیم ہے میری دُعا قبول کر۔ ایسا نہ ہو (نعوذ باللہ) میں تیرے متعلق کوئی غلط عقیدہ قائم کروں۔

غزل ۸۷

مہرباں ہو کے بلا لو مجھے چاہو جس وقت ۔ میں گیا وقت نہیں ہوں کہ پھر آبھی نہ سکوں

فرماتے ہیں۔ اے میرے محبوب تم مہربان ہو کر مجھے جب بھی چاہو جس وقت چاہو بلا لو۔ میں گزرا ہوا وقت تو نہیں ہوں کہ پھر دوبارہ نہ آسکوں۔ مطلب یہ ہے کہ اے مولائے کریم تو میرے گناہوں کو غلطیوں کو معاف کر دے۔ چونکہ تو رحیم و کریم ہے لیکن عرض صرف اتنی ہے کہ مہربان ہو کے مجھے بلالے مجھے تیرے پاس آنے میں کوئی عذر نہیں ہے جس وقت اے رحیم و کریم تو مجھ پر مہربان ہو مجھے بلالے۔ اس سے پہلے نہیں۔

ضعف میں طعنۂ اغیار کا شکوہ کیا ہے	بات کچھ سر تو نہیں ہے کہ اٹھا بھی نہ سکوں

فرماتے ہیں ۔ دشمن ہر قسم کے طعن و تشنیع سے کام لیتا رہتا ہے میں ضعف کی حالت میں انہیں برداشت کر رہا ہوں کیونکہ ان کے طعن و تشنیع کوئی میرا سر تو نہیں ہو ئیں اٹھا نہ سکوں مطلب یہ ہے کہ دشمن تو مجھے طرح طرح کے طعنے دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ تیرا محبوب تیرے لئے کچھ نہیں کرتا میں حالتِ ضعف میں سب کچھ برداشت کر رہا ہوں ۔

زہر ملتا ہی نہیں مجھ کو ستمگر ورنہ	کیا قسم ہے ترے ملنے کی کہ کھا بھی نہ سکوں

فرماتے ہیں جب کہتے ہیں کہ مجھے فلاں کام کرنے کی قسم ہے تو مطلب اس کا یہ ہے کہ میں ہرگز نہیں کروں گا لہٰذا عاشق محبوب سے ملنے کی قسم نہیں کھا سکتا ۔ ادھر موت ہے کہ آتی ہی نہیں ۔ مطلب یہ ہے کہ اے مرے محبوب میں تیری ملاقات کا انکاری نہیں بلکہ منتظر ہوں ۔ مگر جب موت آئے گی تو چاہے گا تو ملاقات ہو جائے گی ۔ میرے اختیار میں کچھ نہیں ہے

غزل ۸۸

ہم سے کھل جاؤ بوقتِ مے پرستی ایک دن	ورنہ ہم چھیڑیں گے رکھ کر عذرِ مستی ایک دن

فرماتے ہیں ۔ محبوب سے جو شراب کا رسیا ہے ۔ کہتے ہیں کہ کسی روز شراب نوشی کے دوران ہم سے بے تکلف ہو جاؤ ۔ ورنہ ہم خود ہی شراب کے نشہ کی مستی کے بہانے دست درازی کر بیٹھیں گے ۔ مقطع میں بھی یہی مضمون ہے ۔

غرّۂ اوجِ بنائے عالمِ امکاں نہ پوچھ　　　　اس بلندی کے نصیبوں میں ہے پستی ایک دن

فرماتے ہیں اس دُنیا کی زیب و زینت اور ترقی پر نہ جاؤ کیونکہ ایک دن اس بلندی کو بھی پستی کی طرف مائل ہونا ہے۔ ہر کمالے را زوال۔ (معنی غرّۂ اوج بنائے عالم امکان = دُنیائے فانی کی بلندی و ترقی گھمنڈ و غرور۔ عالمِ امکاں۔ عالم فانی۔

قرض کی پیتے تھے مے لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں　　　　رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن

فرماتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ کسی قرض خواہ نے مرزا صاحب پر نالش کر دی مقدمہ مفتی صدرالدین خاں صدرالصدور کی عدالت میں پیش ہوا۔ مرزا صاحب نے یہ شعر فی البدیہہ پڑھ دیا مفتی صاحب نے مطلوبہ رقم اپنے پاس سے ادا کر دی اور مرزا صاحب کو باعزّت رخصت کر دیا۔

نغمہ ہائے غم کو بھی اے دل غنیمت جانیئے　　　　بے صدا ہو جائے گا یہ سازِ ہستی ایک دن

فرماتے ہیں۔ کہ اگر زندگی میں غموں کا سامنا کرنا پڑے اور آہ و زاری کی نوبت آجائے تو یہ بھی زندگی کا ایک رُخ ہے۔ ایک دن ایسا بھی آنے والا ہے کہ زندگی کا یہ ساز (آہ و زاری اور شکوہ و شکایت) سب پر موت وارد ہو جائے گی۔ نہ بانس ہوگا نہ بانسری۔ کسی نے فارسی میں کیا اچھا شعر کہا ہے۔

؎ زندگی در گردنم افتاد باید زیستن ؞ شاد باید زیستن نا شاد باید زیستن

دھول دھپّا اُس سراپا ناز کا شیوہ نہیں

ہم ہی کر بیٹھے تھے غالبؔ پیش دستی ایک دن

فرماتے ہیں۔ اس سراپا ناز کا یہ شیوہ نہیں کہ بے تکلف ہو کر ہاتھا پائی پر اُتر آئے۔ اس حرکت میں بھی پہل ہم نے ہی کی ہے۔

غزل ۸۹

ہم پر جفا سے ترکِ وفا کا گماں نہیں　　اِک چھیڑ ہے وگرنہ مراد امتحاں نہیں

فرماتے ہیں وہ یعنی محبوب ہمارے متعلق یہ گمان نہیں کرتا کہ ہم جفا کے ڈر سے وفا کو ترک کر دیں گے وہ بدگمان نہیں ہے اور نہ ہی وفا کا امتحان لینا مراد ہے یہ تو نازِ محبوبانہ کا ایک رنگ ہے ۔

کس مُنہ سے شکر کیجئے اِس لُطفِ خاص کا　　پرسش ہے اور پائے سخن درمیاں نہیں

فرماتے ہیں ۔میں اُس کے اس خاص لطف و کرم کا شکر کس طرح ادا کروں ۔یعنی میرا محبوب تو نگاہِ لطف و کرم سے میری پرسش کرتا ہے مگر زبان سے اظہار نہیں کرتا ۔

ہم کو ستم عزیز ستم گر کو ہم عزیز　　نامہرباں نہیں ہے اگر مہرباں نہیں

فرماتے ہیں ۔اگر ہمارا محبوب ستم کرنے کے لئے ہم کو عزیز رکھتا ہے تو یہ بھی اس کی مہربانی ہے ۔کیونکہ ہم اُس کے ستم کو ستم ہی نہیں سمجھتے اُس کا ستم کرنا نامہربانی نہیں مہربانی ہوگی ۔

بوسہ نہیں نہ دیجئے دشنام ہی سہی　　آخر زباں تو رکھتے ہو تم ۔گر دہاں نہیں

فرماتے ہیں ۔اگر بوسہ نہیں دیتے اور کہتے ہو کہ میرا دہن معدوم ہے میں بوسہ کیسے دوں تم بُرا بھلا ہی کہو تاکہ ہم کچھ تو سُن لیں ۔آخر تم بول تو سکتے ہو ۔مطلب یہ ہے کہ اے میرے محبوب میں تجھے چھو نہیں سکتا تو تیری آواز تو سُن سکتا ہوں ۔

کہتے ہیں ایک بزرگ تھے جو رات دن اللہ اللہ کرتے تھے ۔ان کا ایک مریدان کے پاس آکر قیام

پذیر ہوا۔ رات کو تہجّد کے وقت مرید بھی اُن کے ساتھ نماز میں شامل ہوا۔ وہ بزرگ گریہ وزاری کرتے تھے اور اپنی کسی خواہش کا پورا ہونا ربّ العالمین سے چاہتے تھے کہ انہیں بہت زور سے الہام ہوا کہ ہم تیری یہ دُعا قبول نہیں کریں گے۔ دوسرے دن بھی یہی واقعہ رونما ہوا۔ مرید بھی دونوں دن سُنتا رہا۔ آخر جب یہی واقعہ تیسرے دن بھی گزرا تو مرید سے نہ رہا گیا اس نے اپنے مرشد سے کہا کہ حضرت کیوں مُصر ہیں اللہ تعالیٰ نے آپ کو بتا دیا ہے کہ میں یہ دُعا قبول نہیں کروں گا مگر آپ ہر روز یہی دُعا مانگتے ہیں۔ اُس بزرگ نے جواب دیا کہ میں تو یہ دُعا تین سال سے کر رہا ہوں اور اللہ تعالیٰ ہر روز مجھے یہی جواب دیتا ہے مگر میں نہیں گھبراتا لیکن تو تین دن میں گھبرا گیا۔ تو نے یہ نہ سوچا کہ میں اپنے محبوب کی آواز تو سُنتا ہوں وہ مجھ سے کلام تو کرتا ہے چاہے انکار ہی کیوں نہ ہو۔
یہ بھی روایت ہے کہ اُسی رات اُس بزرگ کی دُعا مقبول ہو گئی۔ ؎

یہ شرط ہے کہ نہ رحمت سے اس کی ہو مایوس
جواب پائے گا اک دِن پکارنے والا
(تسلیم شاہجہانپوری)

قطعہ

ہر چند جاں گدازیِ قہر و عتاب ہے — ہر چند پشتِ گرمیِ تاب و تواں نہیں

فرماتے ہیں۔ باوجودیکہ قہر و عتاب سے میری جان گھُلی جا رہی ہے اور باوجود اس کے مری طاقت نے جواب دے دیا۔ پھر بھی میں اپنے محبوب کا گلہ شکوہ نہیں کرتا۔

جاں مطربِ ترانۂ ھَلْ مِنْ مَزِید ہے — لب پردہ سنجِ زمزمۂ الاماں نہیں

فرماتے ہیں ۔ میری جان زرا اس قہر و عتاب کے باوجود دل مزید کا ترانہ گا رہی ہے اور اس حالت کے باوجود یہی کہہ رہی ہے کر گزرے جتنا تو چاہے ستم ۔ میں تیری رضا میں راضی ہوں ۔

ہے ننگِ سینہ دل اگر آتش کدہ نہ ہو ہے عارِ دل نفس اگر آذر فشاں نہیں

فرماتے ہیں) ۔ وہ سینہ کس کام کا جس سینہ میں دلِ سوزاں نہ ہو ۔ اور وہ دل کیا ہے جس میں سے ہر نفس آتشیں شعلہ نہ نکلے ۔ دل کے لئے ایسا ہونا قابلِ شرم و ملامت ہے ۔ مطلب یہ ہے کہ دل اللہ تعالیٰ نے اپنی محبت کے لئے بنایا ہے لہٰذا سینہ آتشِ عشق سے آتش کدہ بنا رہنا چاہیئے ۔

خنجر سے چیر سینہ، اگر دل نہ ہو دو نیم دل میں چھری چبھو، مژہ گر خونچکاں نہیں

فرماتے ہیں ۔ اگر دل دو ٹکڑے نہ ہو تو خنجر سے میرے سینہ کو چیر پھاڑ دو اور میرے دل کو عشق کی چھری سے زخمی کر دو تاکہ تیری مژگاں میرے خون سے رنگین ہو جائے ۔ عاشق کا یہی حال ہے ۔ مطلب یہ ہے کہ اپنے خنجرِ حسن سے میرے سینہ کو میرے دل کو چیر تارہ تاکہ تیرا عشق تیری محبت میرے سینہ میں میرے دل میں کوٹ کوٹ کر بھر جائے ۔

نقصاں نہیں جنوں میں بلا سے ہو گھر خراب سو گز زمیں کے بدلے بیاباں گراں نہیں

فرماتے ہیں ۔ جنونِ عشق نقصان دہ شے نہیں ہے کیونکہ جب کوئی مجنون اپنا گھر چھوڑ کر جنگل کی راہ لیتا ہے تو اس کا مکان جو سو گز زمین پر بنا ہوا تھا ویران ہو جاتا ہے لیکن اُس کے بدلے میں اُس کو صحرا نوردی کے لئے بے پایاں وسعتیں مل جاتی ہیں جو گھاٹے کا سودا نہیں ۔

کہتے ہو کیا لکھا ہے تری سرنوشت میں گویا جبیں پہ سجدۂ بُت کا نشاں نہیں

فرماتے ہیں ۔ یہ کیسا سوال ہے کہ تیرا نوشتۂ تقدیر کیا ہے ۔ کیا سوال کرنے والوں کو میری پیشانی پر

بُت پرستی کا نشان نظر نہیں آتا۔

پاتا ہوں اُس سے داد کچھ اپنے سخن کی مَیں   رُوح القُدس اگرچہ مرا ہم زباں نہیں

فرماتے ہیں ۔ میرا کلام جو کہ تصوف، عشقِ الٰہی اور حقائق پر مشتمل ہے اُسے روح القدس کی پسندیدگی
حاصل ہے جو کسی نہ کسی رنگ میں مجھے داد دیتا رہتا ہے اور میری شاعری کو پسند کرتا ہے
اگرچہ روح القدس میرا ہم زبان نہیں لیکن اس کو وہ تمام حُسنِ کلام نظر آتا ہے جو میرے ہم زباں احباب کو نظر نہیں آتا۔

اں ہے بہائے بوسہ وہ لے کیوں کہے ابھی   غالبؔ کو جانتا ہے کہ وہ نیم جاں نہیں

فرماتے ہیں ۔ یہ بات تو مُسلّم ہے کہ بوسہ کی قیمت جان ہے لیکن ابھی وہ اظہار نہیں کرتے جب
میں نیم جاں ہو جاؤں گا تب کہیں گے کہ جان دے دو اور بوسہ لے لو۔ مگر اس وقت غالبؔ
تیرے پاس جان نہیں ہوگی بلکہ تو نیم جاں ہو چکا ہوگا۔ اور آدھی جان سے بوسہ کی پوری
قیمت ادا نہ ہو سکے گی ۔

غزل ۹۰

مانعِ دشتِ نوردی کوئی تدبیر نہیں   ایک چکّر ہے مرے پاؤں میں زنجیر نہیں

فرماتے ہیں کہ مجھے دشتِ نوردی کے عمل سے کوئی روک نہیں سکتا۔ اگر میرے پاؤں میں زنجیر بھی
ڈال دی جائے پھر بھی میں اپنے زنداں میں چکر لگاتا رہوں گا۔

شوق اُس دشت میں دوڑائے ہے مجھ کو کہ جہاں   جادہ غیر از نگہِ دیدۂ تصویر نہیں

فرماتے ہیں میرا شوق و ذوق ایسے ویرانے میں دوڑا رہا ہے۔ جہاں جادہ نگاہ دیدۂ تصویر کی طرح
معدوم ہے۔ گویا وہاں کوئی راستہ نہیں ہے کوئی راستہ بتانے والا بھی نہیں ۔ ہے جو بھی

اس راستہ پر اپنا قدم رکھتا ہے حیران و پریشان ہو جاتا ہے۔ مطلب یہ ہے عرفانِ الٰہی
کی منزلوں پر پہنچنا بہت دشوار اور کٹھن ہے۔ مگر انسان کو ہمت کرنی چاہیئے۔ دوسرے معنی
یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ میرا شوق اتنا زبردست ہے کہ نہ صرف مجھے اس میدانِ عرفان میں
چلنا سکھاتا ہے، بلکہ میں تو وہاں دوڑ لگاتا ہوں۔

حسرتِ لذتِ آزار رہی جاتی ہے　　　جادۂ راہِ وفا جز دمِ شمشیر نہیں

معنی۔ جادہ، کچا اور ناہموار راستہ۔ تشبیہ دمِ شمشیر سے دی ہے۔
فرماتے ہیں۔ راہِ عشق کے آزار و مصائب کی لذتیں ایسی ہیں کہ اُن سے جی کبھی سیر نہیں ہوتا بلکہ
ہر دم زیادہ سے زیادہ حاصل کرنے کی حسرت رہتی ہے مگر چونکہ راہِ وفا کی راہیں تلوار کی
دھاریں ہیں اس لئے ہر قدم پر ایک موت سامنے کھڑی ہوئی نظر آتی ہے۔

رنجِ نومیدیٔ جاوید گوارا رہیو　　　خوش ہوں گر نالہ زبونی کشِ تاثیر نہیں

فرماتے ہیں۔ خدا کرے کہ ہمیں ہمیشہ کی نا اُمیدی کا رنج کبھی ناگوار نہ ہو۔ کیونکہ اس طرح ہم اپنے
نالہ کی تاثیر کے مرہونِ منت نہ ہوں گے جو ہمیں کسی طرح منظور نہیں۔ (معنی زبونی کشِ تاثیر
تاثیر کی احسان مندی)

سر کھجاتا ہے جہاں زخمِ سر اچھا ہو جائے　　　لذتِ سنگ باندازۂ تقریر نہیں

فرماتے ہیں۔ جب زخمِ سر اچھا ہونے لگتا تو سر میں کھجلی شروع ہونے لگتی ہے۔ سر پر پتھر کھانے
کے مزے کو بیان کرنا مشکل ہے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ یہ حقیقت ہے کہ ہر زخم جب اچھا
یعنی مندمل ہونے لگتا ہے، تو ضرور کھجلی ہونے لگتی ہے اور اس کو ضرور اچھا سمجھا جاتا ہے
مطلب یہ ہے کہ جب لوگوں کے طعن تشنیع کے پتھروں کے زخم اچھے ہوتے ہیں تو میرا دل
چاہتا ہے کہ یہ طعنہ زنی کرنے والے لوگ کہاں گئے کیوں طعنہ زنی نہیں کرتے۔ کیونکہ طعن و تشنیع

کے زخم پتھروں کے زخموں سے بھی گہرے اور لذت آفریں ہوتے ہیں۔

جب کرم رخصتِ بیباکی و گستاخی دے   کوئی تقصیر بجز خجلتِ تقصیر نہیں

فرماتے ہیں ۔جب دوست اپنی عنایت سے گستاخی و بیباکی کی اجازت دے دے تو پھر اس وقت گناہ نہ کرنا بہت بڑا گناہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ سارا ثواب تو مرتب ہوتا ہے فرمانبرداری پر اور یوں بھی ہر رعایت سے فائدہ اٹھانا عقلمندی ہے ۔

غالبؔ اپنا یہ عقیدہ ہے بقولِ ناسخؔ   آپ بے بہرہ ہے جو معتقدِ میرؔ نہیں

۔مصرعۂ ثانی ناسخؔ کا ہے۔ اس پر مصرعہ لگانا ناسخؔ کے عقیدہ کی تصدیق کرنا ہے۔

ایک اور جگہ بھی میرؔ کی اولیت و برتری کو تسلیم کیا ہے ۔؎

ریختہ کے تمھیں استاد نہیں ہو غالبؔ
کہتے ہیں اگلے زمانہ میں کوئی میرؔ بھی تھا

غزل ۹۱

مت مردمکِ دیدہ میں سمجھو یہ نگاہیں   ہیں جمع سویدائے دلِ چشم میں آہیں

فرماتے ہیں ۔آنکھ کی پتلی کو نگاہیں نہ خیال کرو بلکہ آنکھ کے دل میں میری آہیں جمع ہوگئیں ہیں۔

مطلب یہ ہے کہ میری آنکھ کی پتلی میں جو کالا دائرہ ہے وہ نگاہیں نہیں ہیں بلکہ آنکھ کے بیچ میں میری آہیں اور آہوں کا دھواں اکٹھا ہوگیا ہے ۔

چشمِ خوں بستہ سے کل رات لہو پھر ٹپکا ؛ ہم نے سمجھا تھا کہ اے میرؔ یہ آزار گیا (حضرت میرؔ)

غزل ۹۲

بَرشگالِ دیدۂ عاشق ہے دیکھا چاہیئے　　کھُل گئی مانندِ گُل سَو جا سے دیوارِ چمن

فرماتے ہیں۔ دیدۂ عاشق کی برسات کا منظر دیکھنے کے قابل ہے جس کی شدّت سے دیوارِ چمن مانندِ گُل سینکڑوں جگہ سے کھُل جاتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ دیدۂ عاشق اشکِ خونی بہا کر غنچہ و گُل کی بہار دکھا رہے ہیں۔

اُلفتِ گُل سے غلط ہے دعوئ وارستگی　　سَرو ہے باوصفِ آزادی گرفتارِ چمن

فرماتے ہیں ۔ یہ دعویٰ کرنا کہ ہم اُلفتِ گُل یعنی عشق و محبت کے پھندوں سے سراسر آزاد ہیں ۔ باطل ہے کیونکہ ہر انسان کسی نہ کسی شے سے محبت ضرور رکھتا ہے ۔ زن و فرزند یا مال و دولت یا ملک و ملت ۔ اور اسکی مثال سروِ آزاد سے دیتے ہیں جو قد میں بہت ہی لمبا ہوتا ہے اور آزاد کہلاتا ہے مگر وہ بھی چمن کا حصّہ اور اسیرِ چمن ہے ۔

غزل ۹۳

عشق تاثیر سے نومید نہیں　　جاں سپاری شجرِ بید نہیں

فرماتے ہیں ۔ عشق تاثیر سے نا امید نہیں ہوتا کیونکہ عشق میں سر دھڑ کی بازی اور جان قربان کرنا پڑتی ہے ۔ جانبازی بید کا درخت نہیں کہ جس پر کوئی پھول ہی نہیں آتا (بید بانس کا درخت)

سلطنت دست بدست آئی ہے	جامِ مے خاتمِ جمشید نہیں

فرماتے ہیں ۔ سلطنت ہمیشہ ایک خاندان سے دوسرے خاندان یا ایک قبیلہ سے دوسرے قبیلہ کو منتقل ہوتی رہتی ہے یعنی ڈھلتی چھاؤں ہے اور مثال یہ پیش کرتے ہیں کہ جامِ مے جمشید کی انگوٹھی نہیں ہے جو اس کی ملکیت تھی اور دوسروں تک منتقل نہیں ہوتی ۔

ہے تجلّی تری سامانِ وجود	ذرّہ بے پرتوِ خورشید نہیں

فرماتے ہیں ۔ اس شعر میں کھول کر بتاتے ہیں کہ اے اللہ تعالیٰ تیری تجلی یا نمودِ حسن سے تیری ہستی کا پتہ چلتا ہے جس طرح ذرّے کی چمک سے خورشید کی شعاعوں کا پتہ چلتا ہے ۔ یعنی کائنات کا ذرہ ذرہ تیرے وجود کا پتہ دے رہا ہے ۔

رازِ معشوق نہ رُسوا ہو جائے	ورنہ مَر جانے میں کچھ بھید نہیں

فرماتے ہیں ۔ ہمیں جان دینے میں کچھ عذر نہیں لیکن ہم نہیں چاہتے کہ ہمارے اور محبوب کے تعلقات کی کسی کو کان و کان بھی خبر ہو ۔ اور مرنا ایسی چیز ہے کہ سب جان لیں گے اور پوچھیں گے کیسے مرا کیا تکلیف تھی اور راز فاش ہو جائے گا ۔

گردشِ رنگِ طرب سے ڈر ہے	غمِ محرومیٔ جاوید نہیں

معنی ۔ رنگِ طرب ۔ آسائش کا رنگ

فرماتے ہیں ۔ حالتِ آسائش کے چلے جانے کا خوف لاحق ہے ۔ محض غمِ محرومیِ جاوید ہوتی تو کوئی غم اور خوف نہ ہوتا ۔ زمانۂ اقبال مندی کے بعد افلاس بہت تکلیف دہ ہوتا ہے شروع سے غریب اور مفلس ہونے میں کوئی غم نہیں ۔

کہتے ہیں جیتے ہیں اُمید پہ لوگ، ہم کو جینے کی بھی امید نہیں

فرماتے ہیں لوگ کہتے ہیں اُمید پہ دُنیا قائم ہے اور اُمید اساسِ زندگی ہے۔ اور اگر کوئی اُمید نہ رہے تو آدمی کی زندگی تلخ ہو جاتی ہے کتنی سہل زبان میں کیسا فلسفیانہ شعر کہا ہے یہ بس مرزا صاحب کا ہی کمال ہے۔

غزل ۹۴

جہاں تیرا نقشِ قدم دیکھتے ہیں خیاباں خیاباں اِرم دیکھتے ہیں

نعتیہ شعر ہے ایسا مضمون صرف اور صرف نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے شایانِ شان ہے

فرماتے ہیں۔ تیرے نقشِ قدم پر چل کر ہم جنت حاصل کر سکتے ہیں اور ہر طرف جنت کے نظاروں کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ سہ نقوشِ محبت جہاں دیکھتے ہیں ؛ پسِ پردہ اُن کو عیاں دیکھتے ہیں (شارح)

ترے سروِ قامت سے اِک قدِ آدم قیامت کے فتنے کو کم دیکھتے ہیں

یہ بھی پہلے شعر کی طرح نعتیہ شعر ہو سکتا ہے یا حمد باری میں ہو۔

فرماتے ہیں۔ کہ قیامت کا فتنہ اپنی جگہ پر لیکن اے محبوب تیرے سرو قد کے آگے وہ بھی کم ہے۔ کیونکہ وہ عاشق کے لئے یک قدِ آدم سے کم فتنہ ہے۔

تماشا کر اے محوِ آئینہ داری تجھے کس تمنا سے ہم دیکھتے ہیں

فرماتے ہیں۔ اے وہ جو کہ ہر دم آئنہ کے سامنے بیٹھا بناؤ سنگھار میں مصروف رہتا ہے۔ تو یہ بھی تو دیکھ کہ تیرے عاشق کس کس تمنا کے ساتھ تجھ کو دیکھتے ہیں اور یہ جان لے کہ میں بھی تیرے عشاق میں سے ایک ہوں۔ لہٰذا میرے دل پر تیری تجلی ہونی چاہیئے۔

دلِ آشفتگاں خالِ کنجِ دہن کے سویدا میں سیرِ عدم دیکھتے ہیں

فرماتے ہیں ۔ وہ لوگ جو دہنِ بے نشان پر عاشق ہوئے ہیں وہ اپنے سویدائے دل میں سیرِ عدم کر رہے ہیں ۔ (معنی خالِ کنجِ دہن ، دہن کے کنارے کا تل)

مطلب یہ ہے کہ وہ عشاق جو محبوب بے نشاں پر عاشق ہوئے ہیں وہ اپنے دل کے داغِ عشق کے سویدا میں زمین و آسمان کی سیر کرتے ہیں (سیرِ عدم)

سراغِ تفِ نالہ لے داغِ دل سے کہ شب رَو کا نقشِ قدم دیکھتے ہیں

فرماتے ہیں ۔ جس طرح رات کے آنے جانے والوں کا حال صبح کو اُن کے نقشِ قدم سے معلوم ہو جاتا ہے اسی طرح سے جو رات کو نالہ کشی کرتے ہیں اُن کا سراغ داغِ دل سے مِل جاتا ہے ۔ شب رو کو نالے سے اور داغِ دل کو نقشِ قدم سے تشبیہ دی ہے ۔

بنا کر فقیروں کا ہم بھیس غالبؔ تماشائے اہلِ کرم دیکھتے ہیں

فرماتے ہیں ۔ ہمیں بھیک مانگنے کی کوئی ضرورت نہیں ہم تو فقیروں کا بھیس بدل کر اہلِ کرم کی نوازشوں کا امتحان لیتے ہیں ۔ نہیں واسطہ عشق سے اُن کو تا صر
جو اس میں بھی سود و زیاں دیکھتے ہیں

غزل ۹۵

ملتی ہے خوئے یار سے نار التہاب میں کافر ہوں گر نہ ملتی ہو راحت عذاب میں

فرماتے ہیں ۔ خوئے یار سے آگ کی گرمی بہت ملتی جلتی اور مشابہت رکھتی ہے ۔ اسی وجہ سے عذابِ نار میں میرے لئے راحت ہے ۔ ایسا ایک شعر میرے ذہن میں تو میر مہٹی کا ہے ۔

رکھ کے مُنہ سو گیا اُن آتشیں رخساروں پر
چین تھا دل کو ، تو نیند آگئی انگاروں پر

کب سے ہوں کیا بتاؤں جہانِ خراب میں　　شب ہائے ہجر کو بھی رکھوں گر حساب میں

فرماتے ہیں ۔ یہ بتانا بہت مشکل امر ہے کہ میں اس جہانِ خراب میں کب سے ہوں ۔ میری عمر کتنی ہے چونکہ ہجر کی راتیں تو اس قدر لمبی اور کٹھن تھیں کہ ان کو ایک ایک ہزار سال سے تعبیر کیا جاسکتا ہے ۔ اگر ان سب کو شمار میں لاؤں تو بہت لمبا عرصہ گزر گیا ۔ مطلب یہ ہے کہ مصیبت کے وقت بڑی مشکل سے گزرتے اور آرام کے دنوں کے جانے میں دیر ہی نہیں لگتی ؎

ایام مصیبت کے تو کاٹے نہیں کٹتے
دن عیش کے گھڑیوں میں گذر جاتے ہیں

راحت کسے ملی ہے جہانِ خراب میں ؎ قدرت نے لا کے ڈال دیا کس عذاب میں (شارح)

تا پھر نہ انتظار میں نیند آئے عمر بھر　　آنے کا وعدہ کر گئے آئے جو خواب میں

فرماتے ہیں ۔ ہم حالتِ انتظار میں بے چین و مضطر انتظار کر رہے تھے کہ نیند کا جھونکا آیا اور ہم سو گئے ۔ وہ خواب میں آئے اور اپنے وعدہ پر آنے کو کہہ گئے ۔ کہ تم منتظر رہو ہم ضرور آئیں گے ۔ اور یہ وعدہ انہوں نے اس لئے کیا کہ ہم جاگتے ہی رہیں اور زندگی ان کے انتظار میں ہی تمام ہو جائے ۔

قاصد کے آتے آتے خط اک اور لکھ رکھوں　　میں جانتا ہوں جو وہ لکھیں گے جواب میں

فرماتے ہیں ۔ میں جانتا ہوں کہ وہ میرے خط کے جواب میں کچھ نہ لکھیں گے اور قاصد خالی ہاتھ واپس آ جائے گا اس لیے مناسب ہے کہ قاصد کے واپس آنے تک ایک خط اور لکھ رکھوں بقول خود ؎

وہ اپنی خو نہ بدلیں گے ہم اپنی وضع کیوں بدلیں
سُبک سر بن کے کیا پوچھیں کہ ہم سے سرگراں کیوں ہو

مجھ تک کب اُس کی بزم میں آتا تھا دورِ جام ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں

فرماتے ہیں۔ "مجھ تک کب آتا تھا۔" یعنی نہیں آتا تھا۔ آج جو خلافِ معمول میرے پاس جام پہنچ گیا ہے تو کیا بات ہے۔ ساقی نے کوئی چیز شراب میں تو نہیں ملا دی۔ پہلے تو محرومی نہ ملنے کی وجہ سے تھی اور اب بھی محرومی شک اور شبہات کی وجہ سے ہے۔ جو الفاظ حذف کئے گئے ہیں اس سے شعر کی لطافت حدِ بیان میں نہیں آسکتی۔

ہے نفع کم تو اس کے ہیں نقصان بے شمار ؏ لذّت کے ساتھ تلخی ہے شامل شراب میں (شارح)

جو منکرِ وفا ہو فریب اس پہ کیا چلے کیوں بدگماں ہوں دوست سے دشمن کے باب میں

فرماتے ہیں۔ میرا دوست منکرِ وفا ہے اس پر میرے دشمن کا فریب نہیں چلے گا لہٰذا مجھے اپنے دوست پر بدگمانی دشمن کے معاملہ میں نہیں کرنی چاہیے۔

میں مضطرب ہوں وصل میں خوفِ رقیب سے ڈالا ہے تم کو وہم نے کس پیچ و تاب میں

فرماتے ہیں۔ میں مضطرب وصل میں اس وجہ سے ہوں کہ کہیں تمہارا دوسرا ملنے والا نہ آجائے مگر تم کس وہم میں مبتلا ہو گئے۔ میرا کوئی دوسرا معشوق نہیں ہے نہ میں اُس سے چھپ کر یہاں آیا ہوں۔ کوئی نہیں آئے گا کیونکہ میرا اور کوئی معشوق ہے ہی نہیں۔

مجھکو کبھی تو ضبط و تحمّل کا بھی مزہ ؏ رہتے ہو بات بات پہ کیوں پیچ و تاب میں (شارح)

مَیں اور خطِ وصل خدا ساز بات ہے جاں نذر دینی بھول گیا اضطراب میں

معنی۔ خطِ وصل۔ جس میں وصل کا وعدہ تحریر ہو۔

فرماتے ہیں۔ میں کہاں اور وصل کا وعدہ کہاں۔ میری یہ قسمت کہ مجھے معشوق وصل کا خط لکھے۔ یہ بات تو خدا کے خاص فضل سے ہی ممکن ہے۔ مجھے چاہیئے تھا کہ خط پڑھتے ہی اپنی جان نذر کر دیتا مگر افسوس کہ جوشِ خوشی میں مجھے یاد ہی نہ آیا۔

ہے اک شکن پڑی ہوئی طرفِ نقاب میں ہے تیوری چڑھی ہوئی اندر نقاب کے

فرماتے ہیں۔ معشوق ایسا غصیلا ہے کہ نقاب کے اندر بھی تیوری چڑھی ہوئی ہے جس کو نقاب کے اوپر دیکھا جا سکتا ہے چونکہ اک شکن صاف نظر آرہی ہے۔

یہ سبزہ زار، لالہ و گل، یہ نجوم و ماہ ؛ چھپتے کہاں ہیں حُسن کے جلوے نقاب میں (شارح)

لاکھوں بناؤ ایک بگڑنا عتاب میں لاکھوں لگاؤ ایک چُرانا نگاہ کا

معنی لگاؤ = لگاوٹ

فرماتے ہیں۔ دوست کی صدہا لگاوٹیں ایک طرف اور ایک نگاہ کا چرانا ایک طرف اور اُس کے لاکھوں بناؤ سنگھار ایک طرف اور اس کا عتاب (غصہ) ایک طرف۔ یعنی بناؤ سنگار سے زیادہ خوبصورت محبوب کا عتاب ہے اور اس کی محبت اور لگاوٹ سے زیادہ بہت حسین نگاہ کا چرانا ہے۔ شعر کی ساخت، الفاظ کی سادگی اور ایک گہرے مضمون نے شعر کی قدر و منزلت کو ہزاروں گنا بالا کر دیا ہے۔

جس نالہ سے شگاف پڑے آفتاب میں وہ نالہ دل میں خس کی برابر جگہ نہ پائے

فرماتے ہیں۔ بڑے تعجب کا مقام ہے وہ نالہ معشوق کے دل میں ایک پھانس کے برابر بھی اثر نہیں کرتا جس نالہ سے آفتاب میں بھی شگاف پڑ جاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ میرا محبوب بڑا ہی سنگ دل ہے ورنہ میرے نالہ سے تو بابِ رحمت بھی کھل جاتا ہے۔

کھلتا ہے اُس پہ بابِ اجابت، خدا گواہ ؛ بندہ کرے دُعا جو کبھی اضطراب میں (شارح)

جس سحر سے سفینہ رواں ہو سراب میں وہ سحر مدعا طلبی میں نہ کام آئے

فرماتے ہیں۔ تعجب ہے کہ وہ جادو مدعا طلبی میں کام نہیں دیتا جس جادو سے سراب میں کشتی چل جاتی ہے۔

غالب چھٹی شراب پر اب بھی کبھی کبھی ۔۔۔ پیتا ہوں روزِ ابر و شبِ ماہتاب میں

گو کہ شراب چھوڑ دی ہے مگر کبھی کبھار ابر و باران کے دن، اور چاندنی راتوں میں پی لیتا ہوں۔ کہا جاتا ہے کہ ان وقتوں میں لطفِ بادہ نوشی زیادہ ہوتا ہے۔

ناصر کو بھی ملے مئے عرفان کا ایک جام ؛ حاضر رہا ہے کب سے وہ تیری جناب میں

غزل ۹۶

کل کے لئے کر آج نہ خست شراب میں ۔۔۔ یہ سوءِ ظن ہے ساقیِ کوثر کے باب میں

معنی۔ کل ۔ فردائے قیامت، خست ۔ کمی ، کنجوسی ، ساقیٔ کوثر ۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں ۔ قیامت کے روز کے بہانے آج شراب دینے میں کمی نہ کر کیونکہ یہ ساقیٔ کوثر کے بارے میں بدظنی کے مترادف ہے ۔ اے خدا بادۂ عرفاں خوب دے ۔

ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند ۔۔۔ گستاخیِ فرشتہ ہماری جناب میں

فرماتے ہیں ۔ کہ محبوبِ حقیقی کو ہماری خاطر ایسی عزیز تھی کہ ہمارے معاملات میں فرشتوں کی دخل اندازی بھی گستاخی خیال کی گئی ۔ اور یا اب یہ حالت ہے کہ ہم ہر جگہ اور ہر ملک میں کمزور ہیں ۔

دُنیا کے معاملات میں ہمارا کوئی دخل ہی نہیں جو ہماری ذلت پر دلیل ہے۔ اور اگر "کیوں" کا مخاطب اللہ تعالیٰ سے ہے تو پھر اُس سے یہی سوال ہے کہ کل تک تو تیری نظروں میں ہماری یہ قدر و قیمت تھی کہ فرشتوں کو تو نے جھاڑ دیا اور دخل اندازی سے روک دیا۔ اور اگر "کیوں" کا خطاب ہم سے ہے تو پھر ہمارے غور و فکر کی بات ہے۔ اس شعر میں غالب نے شکوہ اور جواب شکوہ کو ایک ہی شعر میں بیان کر دیا ہے۔

جاں کیوں نکلنے لگتی ہے تن سے دمِ سماع گر وہ صدا سمائی ہے چنگ و رباب میں

معنی۔ سماع۔ محفل موسیقی میں نعت، حمد یا مثنوی موسیقی کی وساطت سے سُننا

فرماتے ہیں۔ موسیقی کے ساتھ گانا سُنتے وقت جسم سے جان کیوں نکلنے لگتی ہے۔ صوفیا کا قول ہے کہ چنگ و رباب میں شاہدِ حق کی صدا بھری ہوئی ہے اگر ایسا ہوتا تو وہ صدا قوت بخش اور جاں بخشی کی صدا ہونی چاہیئے تھی نہ کہ جان نکالنے والی۔

رَو میں ہے رخشِ عمر کہاں دیکھئے تھمے نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

معنی۔ رخش۔ گھوڑا، رَو۔ سرپٹ دوڑنا

فرماتے ہیں۔ کیا بے اختیار سرپٹ دوڑنے والے گھوڑے پر خالقِ کائنات نے ہم کو سوار کیا ہے نہ تو اُس گھوڑے کی لگام ہمارے ہاتھوں میں ہے اور نہ ہی پیر رکاب میں ہیں۔ نہایت خوف و ہراس کی حالت میں رخشِ عمر پر سوار چلے جاتے ہیں اور یہ جہاں رُکا وہیں اُسی مقام پر ہماری موت ہے۔ عمر کو ایسے بے قابو گھوڑے سے تشبیہ دی ہے جو سرپٹ دوڑتا چلا جاتا ہے

اُتنا ہی مجھ کو اپنی حقیقت سے بُعد ہے جتنا کہ وہمِ غیر سے ہُوں پیچ و تاب میں

معنی۔ غیر۔ ماسوائے اللہ کے

فرماتے ہیں۔ جس قدر وہم غیر سے میں پیچ و تاب میں رہتا ہوں اتنا ہی مجھے اپنی حقیقت یعنی وجود واجب الوجود سے بُعد ہے۔

مطلب یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کے سوا ہر شے معدوم ہے اور وہی سب ہے جو کچھ بھی ہے اس کی حیثیت وہم سے زیادہ نہیں تو پھر میرا اپنا وجود بھی کوئی شے نہیں ہے۔ جو صوفیا وحدت الوجود کے قائل ہیں اُن کا یہ عقیدہ ہے لیکن میں اس شعر کا مطلب جو سمجھتا ہوں وہ یہ ہے کہ میں جس قدر توحید کو عزیز رکھتا ہوں اور اُن تمام شریکوں سے بیزار ہوں جو لوگوں نے خدا کے ساتھ ٹھہرا لئے ہیں، اور اتنا ہی میرا اپنا نفس ہے جبکہ میں اپنے وجود کو شاہد حقیقی کے مقابل مقدم کر لیتا ہوں اور شرکِ خفی میں مبتلا ہو جاتا ہوں۔

اصلِ شہود و شاہد و مشہود ایک ہے حیراں ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں

معنی۔ شہود = موجوداتِ عالم میں حق ہی حق نظر آنے کو شہود کہتے ہیں۔
شاہد = دیکھنے والا ۔ مشہود = جس کو دیکھا جائے۔

۔جیسا کہ میں نے پہلے شعر کی شرح میں لکھا ہے اس شعر سے میرے خیال میری شرح کی تائید ہوتی ہے کہ مرزا غالب وحدت الوجود کے اُن معنوں میں قائل نہیں جیسا کہ فرقۂ صوفیا کے لوگ عقیدہ رکھتے ہیں۔ اس شعر میں صاف تردید کرتے ہیں۔

فرماتے ہیں۔ کہ اگر مشہود، شاہد و مشہود ایک ہی وجود کے مختلف نام ہیں تو پھر مشاہدہ کو ہم کس کھاتے میں ڈالیں گے۔ یہاں صاف وحدت الوجود کے عقیدے کی تردید ہے۔ شہود کائنات ہے شاہد ہم دیکھنے والے ہیں اور مشہود ذاتِ خداوندی ہے۔ ہاں چونکہ سب کچھ اُسی سے ظہور میں آیا ہے۔ ان معنوں میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس کے سوا کچھ نہیں۔ وہی اوّل ہے وہی آخر ہے سب کچھ اُسی سے ظہور میں آیا اور سب کچھ ایک دن فنا ہو جائے گا۔

ہے مشتمل نمودِ صُوَر پر وجودِ بحر　　یاں کیا دھرا ہے قطرہ و موج و حباب میں

جس سمندر میں لہریں پیدا نہ ہوں اور حباب سر نہ اُٹھائیں وہ سمندر کہلانے کا مستحق نہیں رہتا۔ اسی طرح اگر انسان میں محبتِ الٰہی کی لہریں نہ اٹھیں اور عشقِ محبوب کے بلبلے پیدا نہ ہوں تو وہ انسان، انسان کہلانے کا مستحق نہیں رہتا۔

شرم اک ادائے ناز ہے اپنے ہی سے سہی　　ہیں کتنے بے حجاب کہ ہیں یوں حجاب میں

معنی شرم = ادائے معشوقانہ، کسی بے حجابی کے بعد وقوع میں آتی ہے۔ اگر حجاب ہے تو یہ ادائے معشوقانہ وقوع میں نہیں آئے گی۔ مگر اللہ تعالیٰ نے اپنے حُسن کا اظہار کروڑوں طریق سے کائنات میں کیا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ معشوقِ حقیقی نے جو حجاب کیا ہے اس میں سے تو بے حجابیاں نظر آ رہی ہیں یعنی جلوۂ حسن یار جس کا مطلب ہے وہ کس قدر بے حجاب ہیں جو یوں ہیں حجاب میں۔

فرماتے ہیں کہ اگر محبوب تنہائی میں اپنے متناسب اور خوبصورت جسم کو دیکھ پاتا ہے تو اس کو خود سے شرم آنے لگتی ہے اور اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ باوجود بے حجابی کے شرم کے پردے میں اور بھی بے حجاب ہو جاتا ہے۔

آرائشِ جمال سے فارغ نہیں ہنوز　　پیشِ نظر ہے آئینہ دائم نقاب میں

فرماتے ہیں کہ حسینانِ جہاں کو اپنے آرائشِ جمال کی فکر ہمیشہ دامن گیر رہتی ہے۔ اگر وہ سفر میں بھی ہوں تو آئینہ اپنے ساتھ رکھتے ہیں۔ بعینہٖ یہی حالت معشوقِ حقیقی کی ہے وہ بھی نئی نئی دُنیا بنا کر آرائشِ جمال میں مصروف ہے۔

ہے غیبِ غیب جس کو سمجھتے ہیں ہم شہود　　ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں

فرماتے ہیں ۔ جو کچھ انسان نے دیکھ لیا ہے جان لیا ہے اتنا ابھی تک چھپا ہوا ہے لٰہذا غیب،
غیب ہی ہے ۔ ہم غلطی سے شہود کہہ رہے ہیں ۔ جو یہ سمجھ گئے کہ ہم جاگ گئے ہیں ہم نے
بہت کچھ سیکھ لیا ہے وہ بھی ابھی تک خواب میں ہی ہیں اور کچھ نہیں جانتے ۔

غالبؔ ندیم دوست سے آتی ہے بوئے دوست مشغولِ حق ہوں، بندگیٔ بوتراب میں

فرماتے ہیں ۔ غالبؔ ندیم دوست سے دوست کی بُو آیا کرتی ہے اس لئے میں حضرت علی رضؓ کی
فرمانبرداری اور محبت کو اللہ تعالیٰ کی عبادت خیال کرتا ہوں۔
کھلتا ہے اس پہ بابِ اجابت، خدا گواہ ؛ بندہ کرے دُعا جو کبھی اضطراب میں (شارح)

غزل ۹۷

حیراں ہوں دل کو روؤں کہ پیٹوں جگر کو میں مقدور ہو تو ساتھ رکھوں نوحہ گر کو میں

فرماتے ہیں ۔ دل کے جانے اور جگر کے مر جانے کا ماتم (دونوں کا) میں اکیلا کس طرح کروں ۔ اگر
مقدور ہو تو میں ایک نوحہ گر ملازم رکھتا ۔ میں ہائے دل کہتا تو وہ ہائے جگر کہتا ۔ مرنے والے
دو ہیں اور ماتم کرنے والا صرف میں ہوں اس میں دو مرنے والوں کی توہین ہے کہ رونے
والا صرف ایک ہو۔

چھوڑا نہ رشک نے کہ ترے گھر کا نام لوں ہر اک سے پوچھتا ہوں کہ جاؤں کدھر کو میں

فرماتے ہیں ۔ مجھے رشک نے اس قابل نہ چھوڑا کہ میں تیرے گھر کا نام لوں ۔ پتہ معلوم نہ ہونے کی
وجہ سے سخت گھبراہٹ ہوتی ہے اور بغیر نام لئے تیرا گھر ملنا دشوار ہے ۔ اور یہ بھی ڈر ہے
کہ اگر میں نے تیرا نام لے کر کسی سے پوچھا جو تیرا چاہنے والا ہوا تو یہ میرے لئے باعثِ رشک

ہو گا۔ جو مجھے پسند نہیں

جانا پڑا رقیب کے در پہ ہزار بار　　　　اے کاش جانتا نہ تری رہ گزر کو میں

فرماتے ہیں ۔ تیرا رستہ رقیب کے گھر سے آگے ہو کر گزرتا ہے ۔ اس لئے رقیب کے در سے ہزار بار گزرنا پڑا ۔ اور یہ بات میری طبیعت پر بے حد گراں گزرتی ہے ۔ کاش میں تیرے گھر کے رستہ کو نہ جانتا تو رقیب روسیاہ کے دروازے سے ہو کر گزرنا نہ پڑتا ۔

ہے کیا ؟ جو کس کے باندھئے میری بلا ڈرے　　　　کیا جانتا نہیں ہوں تمہاری کمر کو میں

فرماتے ہیں ۔ تم نے جو میرے ارادہ قتل کے لئے اپنی کمر کس لی ہے ۔ میری بلا بھی اس سے نہیں ڈرتی ۔ کیونکہ اس میں تلوار یا خنجر کا بوجھ اُٹھانے کی طاقت ہی نہیں ہے ۔ تمہاری کمر تو معدوم ہے کس کو کس چیز سے باندھو گے ۔

لو وہ بھی کہتے ہیں کہ یہ بے ننگ و نام ہے　　　　یہ جانتا اگر تو لُٹاتا نہ گھر کو میں

فرماتے ہیں ۔ لو اور سنو جن کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے گھر بار لُٹا دیا اب وہی کہہ رہے ہیں کہ تُو تو بے ننگ و نام ہے ہمارا ملنا تجھ سے ہماری بے عزتی ہے ۔ کاش یہ بات مجھے پہلے سے معلوم ہوتی تو میں اپنے گھر بار کو نہ لُٹاتا اور تمہیں اس طعن کا موقعہ نہ ملتا ۔

چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک تیز رَو کے ساتھ　　　　پہچانتا نہیں ہُوں ابھی راہبر کو میں

فرماتے ہیں ۔ محبوب حقیقی کی طلب میں میں ہر ایک تیز رَو (صاحب جوش و خروش) کے پیچھے لگ جاتا ہوں کہ شاید یہ مجھے منزلِ مقصود تک پہنچا دے لیکن کچھ وقتِ عزیز ضائع ہونے کے بعد پتہ چلتا ہے کہ یہ تو کسی اور منزل کا راہی ہے تو اُسے چھوڑ دیتا ہوں پھر دوسرے اور پھر تیسرے کے

پاس جاتا ہوں اور اسی طرح دھکے کھا رہا ہوں اور کوئی حقیقی راہبر ہاتھ نہیں آتا. کیونکہ اس دور کے نام نہاد دعوی دارانِ رہبری سب ہی اس مردار دُنیا کے پیچھے بھاگ رہے ہیں ۔

خواہش کو احمقوں نے پرستش دیا قرار کیا پُوجتا ہوں اُس بُتِ بیداد گر کو ؟ میں

فرماتے ہیں ۔ میرے دل میں جو محبوب سے ملنے کی خواہش شدت پکڑ گئی ہے تو نادان لوگ یہ کہنے لگے ہیں کہ میں اپنے محبوب کی پرستش کرنے لگا ہوں. لیکن ایسا سمجھنا تو اُن کی حماقت کی دلیل ہے میرا محبوب تو ایک انسان ہے میں اُس کو خدائی کا درجہ کیسے دے سکتا ہوں ۔

پھر بے خودی میں بُھول گیا راہِ کوئے یار جاتا وگرنہ ایک دن اپنی خبر کو میں

فرماتے ہیں ۔ میں عشق کی بے خودی میں راہِ کوئے یار کو بھول گیا ۔ اگر نہ بھولتا تو یقیناً مجھے یہ معلوم ہو جاتا کہ میں اس کی نظر میں کیا رتبہ و مقام رکھتا ہوں ۔ اپنا مُدعا اور اپنا حال بھی اُس سے بیان کرسکتا ہوں یا نہیں ۔

اپنے پہ کر رہا ہوں قیاس اہلِ دہر کا سمجھا ہوں دل پذیر متاعِ ہُنر کو میں

فرماتے ہیں کہ میں اپنے شاعری کے ہنر کو اتنا دل پذیر سمجھ کر قیاس کرنے لگا ہوں کہ دُنیا والے بھی اس کو پسند کریں گے ۔

غالب خُدا کرے کہ سوارِ سمندِ ناز دیکھوں علی بہادرِ عالی گُہر کو میں

معنی ۔ سمندِ ناز ۔ وہ گھوڑا جو ناز و ادا کے ساتھ چلتا ہو ۔

فرماتے ہیں ۔ خدا کرے کہ میں علی بہادر عالی گہر کو سمند ناز پر سواری کرتے دیکھوں ۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ بہادر شاہ ظفر کے خاندان سے تعلق رکھنے والی کوئی شخصیت ہے ۔ واللہ اعلم ۔

غزل ۹۸

ذکر میرا بہ بدی بھی اُسے منظور نہیں ۔ غیر کی بات بگڑ جائے تو کچھ دُور نہیں

فرماتے ہیں ۔ میرے محبوب کو مجھ سے اتنی نفرت ہے کہ وہ یہ بھی پسند نہیں کرتا کہ اُس کے سامنے کوئی میرا نام بھی لے لیکن غیر یہ سمجھتا ہے کہ میری بُرائی کرے گا تو اُس کی نظروں میں بہتر مقام حاصل کر لے گا ایسا نہیں ہے بلکہ اس کے برعکس وہ اس سے بھی ناراض ہو جائے گا اور اس کے تعلقات بھی بگڑ جائیں گے ۔ اُٹھ کے آ جائیں گے محفل سے جہاں نور نہیں : ذکر اُن کا نہ ہو جس جا ہمیں منظور نہیں (شارح)

وعدۂ سیرِ گلستاں ہے ، خوشا طالعِ شوق ۔ مژدۂ قتل مقدر ہے جو مذکور نہیں

فرماتے ہیں ۔ محبوب نے چمن کی سیر کا میرے ساتھ وعدہ کیا ہے میرے شوق کے بھی نصیب قابلِ رشک ہیں ، مگر اب میں سمجھ گیا کہ اس نے میرے قتل کا ارادہ کیا ہے اور وہ یہ کہ وہ وہاں جا کر میرے سامنے لالہ و گل کی تعریف و توصیف کر کے اُن کا تماشا دیکھے گا لیکن میرے ساتھ بے اعتنائی برتے گا ۔ اور میں گل و لالہ چمن کو اپنا رقیب جان کر رشک کی وجہ سے مر جاؤں گا ۔

شاہدِ ہستیٔ مُطلق کی کمر ہے عالم ۔ لوگ کہتے ہیں کہ "ہے" پر ہمیں منظور نہیں

فرماتے ہیں ۔ ہمیں یہ بات کسی حالت میں بھی منظور نہیں کہ ہستیٔ مطلق کی کمر یہ عالم ہستی ہے یا اسی طرح کا تعلق ہے جیسا کمر کو معشوق کے ساتھ کہ ہے بھی اور نہیں بھی ۔ مطلب یہ ہے کہ عالم کی ہستی وہم نہیں بلکہ شاہدِ ازلی کی تخلیق ہے اور یہ محبوب کی کمر معدوم ہوتے ہوئے بھی عالم آشکار ہے ۔ بقول حضرت تسلیم شاہجہانپوری ؎

آئینہ دارِ جلوۂ فطرت ہے کائنات
کتنی حسین نقاب ہے رُخ پر پڑی ہوئی

قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا لیکن — ہم کو تقلیدِ تنک ظرفیٔ منصور نہیں

فرماتے ہیں۔ ہم بھی وہی قطرہ ہیں جو دریا میں مل کر دریا بن جاتا ہے یعنی فنا فی الذات ہو جائے گا. مرتبہ ہم کو بھی حاصل ہے لیکن ہمیں حضرت منصور کی کم حوصلگی کی تقلید منظور نہیں کہ انا الحق کا دعویٰ کر بیٹھیں اس شعر میں حضرت منصور کے دعوے کی تصدیق مگر ان کے عمل یعنی دعویٰ کرنے کو اوچھا پن چھچھورا پن قرار دیا ہے۔ یکتائی کو کم ظرفی قرار دیا ہے۔

حسرت اے ذوقِ خرابی کہ وہ طاقت نہ رہی — عشقِ پُر عربدہ کی گوں تنِ رنجور نہیں

معنی ۔ عربدہ ۔ لڑائی جھگڑا، فتنہ، ہنگامہ

فرماتے ہیں ۔اے ذوقِ خرابی تیرا ستیاناس ہو کہ تیری وجہ سے ہنگامۂ عشق و محبت کی ہم میں تاب و تواں باقی نہیں رہی۔

مَیں جو کہتا ہُوں کہ ہم لیں گے قیامت میں تمہیں — کس رعونت سے وہ کہتے ہیں کہ "ہم حُور نہیں"

فرماتے ہیں۔ مَیں نے جب اُس (محبوب) سے کہا کہ تم یہاں تو ہمارے ہاتھ آتے نہیں ہم قیامت کے دن خدا سے تم کو مانگ کر لے لیں گے۔ یہ سُن کر اس شوخ نے غرور کے ساتھ جواب دیا کہ کیسے ہمیں لے لو گے ہم حور نہیں ہیں کہ وہاں تمہاری ملکیت میں آجائیں گے۔ محبوب کی حاضر جوابی نے خوب لطف پیدا کیا ہے۔

ظُلم کر ظُلم! اگر لطفِ دریغ آتا ہے — تو تغافل میں کسی رنگ سے معذور نہیں

معنی۔ دریغ آنا۔ افسوس، رنج آنا۔

فرماتے ہیں ۔ اگر لطف و کرم کرنے سے تجھے رنج یا افسوس ہوتا ہے تو ہیں اس قابل نہیں سمجھتا تو پھر میں تاکیداً یہی کہتا ہوں، ظلم کر ظلم۔ تغافل تو اس وقت مناسب تھا کہ تو ظلم نہ کر سکتا۔ ہم تجھے کسی حالت میں ایسا معذور نہیں سمجھتے لہٰذا تغافل چھوڑ لطف کی جگہ ظلم ہی کر۔

صاف دُردی کشِ پیمانۂ جم ہیں ہم لوگ　　　وائے! وہ بادہ کہ افشردۂ انگور نہیں

فرماتے ہیں ۔ ہم وہ شراب پینے والے ہیں جو اعلیٰ قسم کی ہو۔ خالص انگور سے نچوڑی گئی ہو کیونکہ ہم پیمانۂ جم کی تلچھٹ پینے والے ہیں۔ ایسی دیسی شراب کو منہ سے نہیں لگاتے۔

ہوں ظہوری کے مقابل میں خفائی غالبؔ　　　میرے دعوے پہ یہ حجت ہے کہ مشہور نہیں

خفائی اور ظہوری فارسی زبان کے دو بڑے شاعر (شاید مرزا صاحب کی نظر میں خفائی بہتر ہے)

فرماتے ہیں ۔ میں ظہوری کے مقابل پہ خفائی ہوں اور اس کی دلیل یہ ہے کہ میں ظہوری کی طرح مشہور نہیں ہوں۔

غزل ۹۹

نالہ جز حسنِ طلب اے ستم ایجاد نہیں　　　ہے تقاضائے جفا شکوۂ بیداد نہیں

فرماتے ہیں۔ میرا نالہ حسنِ طلب کے سوا اور کچھ نہیں۔ ہے اور نہ میرے نالے کو شکوۂ بیداد سے کوئی تعلق ہے۔ میرے نالے تو تجھ سے تقاضے جفا کے کرنے کے لئے ہیں۔ چونکہ تم یوں تو کچھ کرتے نہیں ہم سے تغافل برتتے ہو۔ اس لئے ہمارے نالوں سے ناراض ہو کر ضرور ستم کرنے پر آمادہ ہو جاؤ گے۔

رنج و غم میں بھی تو دل مائلِ فریاد نہیں　　　فضل ہی فضل ہے اُس کا کوئی بیداد نہیں

شارح

عشق و مزدوریِ عشرت گہِ خسرو، کیا خوب! ہم کو تسلیم نکو نامیٔ فرہاد نہیں

فرماتے ہیں۔ اگر فرہاد نے خسرو کے محل کی زینت کے لئے پہاڑ کاٹ کر نہر نکالنے کو شیریں کے حصول کے لئے ضروری سمجھا تو وہ عشق کی نیکنامی پر داغ لگانے کا سبب بنا۔

کم نہیں وہ بھی خرابی میں، پہ وسعت معلوم دشت میں ہے مجھے وہ عیش کہ گھر یاد نہیں

فرماتے ہیں۔ ویران ہونے میں میرا گھر بھی صحرا سے کچھ کم نہ تھا۔ مگر اس میں، وہ وسعت کہاں تھی جو دشت میں حاصل ہے۔ لہٰذا اس عیش اور آرام میں اب مجھے اپنا گھر یاد نہیں آتا

بے قراری میں بُھلا بیٹھا ہوں مقصد اپنا ؛ دل میں ہے جوششِ دُعا، ذوقِ دُعا یاد نہیں
(شارح)

اہلِ بینش کو ہے طوفانِ حوادث مکتب لطمۂ موج کم از سیلیِ استاد نہیں

فرماتے ہیں۔ حوادث کے طوفان اہل نظر کے لئے مکتب کا درجہ رکھتے ہیں۔ کیونکہ حادثہ، ہر ابتلا اُن کو کچھ سکھا کر جاتا ہے۔ اور وہ کام کر جاتا ہے جو استاد کا تھپیڑ کرتا ہے۔

(معنی۔ لطمۂ موج۔ لہر کا تھپیڑ۔ حادثہ۔ طوفان

علم اور حلم میں ناصر جو نہ رکھتا تھا نظیر ؛ ایسا اُمّی تھا کہ جس کا کوئی استاد نہیں

وائے مظلومیٔ تسلیم! و بدا حالِ وفا! جانتا ہے کہ ہمیں طاقتِ فریاد نہیں

فرماتے ہیں تسلیم و وفا کی عادت کے سبب سے ہم نالہ و فریاد بھی نہیں کرتے اور ہمارا محبوب ہماری اس کمزوری کی وجہ ہماری خاموشی اور ہمارے ضبط کی داد بھی نہیں دیتا۔ ہمیں اپنی اس، تسلیم و وفا کی عادت پر سوائے افسوس کے اور کوئی چارہ نہیں۔

رنگِ تمکینِ گُل و لالہ پریشاں کیوں ہے گر چراغانِ سرِ رہ گزرِ باد نہیں

فرماتے ہیں ۔ اگر گل و لالہ، چراغانِ رہگزرِ باد نہیں ہیں تو رنگِ تمکینِ گل و لالہ اتنی جلد کیوں اُڑ جاتا ہے
مطلب یہ ہے کہ جیسے چراغ تیز ہوا سے بجھ جاتے اور ان کو کچھ دیر نہیں لگتی۔ اسی طرح گل و لالہ
ایک دو دن سے زیادہ اپنی رنگت نہیں دکھلاتے۔ ہر چیز بے ثبات ہے کسی کو قیام نہیں۔
خالقِ حقیقی کے سوا ہر شے میں تبدیلی ہوتی رہتی ہے۔

سبدِ گُل کے تلے بند کرے ہے گلچیں مژدہ اے مرغ! کہ گلزار میں صیاد نہیں

معنی ۔ سبدِ گل ۔ پھولوں کی ٹوکری
فرماتے ہیں ۔ گلچیں نے پھولوں کی ٹوکری کے نیچے بند کیا ہے۔ اے مرغِ گرفتار تجھ کو مبارک ہو کہ
اب گلزار میں صیاد نہیں ہے۔

نفی سے کرتی ہے اثبات طراوش گویا دی ہے جائے دہن اُس کو دمِ ایجاد نہیں

معنی ۔ طراوش ۔ ظاہر
فرماتے ہیں ۔ دہن کو شعرا معدوم لکھتے ہیں اور محبوب کو روزِ ازل میں دہن کے بدلے نہیں کا لفظ
ملا ہے۔ اس وجہ سے محبوب ہر بات کا جواب نہیں میں دیتا ہے۔ لہٰذا ظاہر ہوا کہ دہن موجود
ہے اور اس طرح نفی سے اثبات پیدا ہو گیا۔

کم نہیں جلوہ گری میں ترے کوچے سے بہشت یہی نقشہ ولے اس قدر آباد نہیں

فرماتے ہیں ۔ جلوہ گری میں تیرے کوچہ سے بہشت ہرگز کم نہیں ہے البتہ وہ ابھی اتنی آباد نہیں
جب ہم تم وہاں ہوں گے تو وہ بھی اسی قدر آباد نظر آئے گی۔

کرتے کس منہ سے ہو غربت کی شکایت غالبؔ تم کو بے مہریِ یارانِ وطن یاد نہیں

فرماتے ہیں. غالب کس مُنہ سے تم پردیس کی شکایت کرتے ہو. کیا یارانِ وطن کی بے مہری بھول گئے ہو
مطلب یہ ہے کہ اگر غربت میں تمہیں کوئی پوچھنے والا نہیں تو پھر بھی تمہیں یہ حق نہیں
پہنچتا کہ تم پردیس یا اہلِ پردیس سے گلہ شکوہ کرو کہ انہوں نے تمہارے ساتھ کوئی اچھا
سلوک نہیں کیا. ؎ فضل ہے اُس کا کہ دی شکر کی توفیق مجھے ؛ شاد ہر حال میں ہوں میں کبھی ناشاد نہیں
(شارح)

غزل ۱۰۰

دونوں جہان دے کے وہ سمجھے یہ خوش رہا ؛ یاں آ پڑی یہ شرم کہ تکرار کیا کریں

اس شعر میں اپنی فراخ دلی اور اُس کے ساتھ شرافتِ نفس کا اظہار کیا ہے. یعنی میں جو دونوں
جہان لے کر چُپ ہو گیا اس کا یہ سبب نہیں تھا کہ میں اس پر قانع ہو گیا تھا بلکہ مجھ کو مانگنے
اور تکرار کرنے کی عادت نہیں. یہی شرم آ پڑی جو خاموش ہو گیا ورنہ میں تو اس سے اُسی کو مانگتا
کچھ اور مانگنا مرے مشرب میں کفر ہے ؛ لا اپنا ہاتھ دے مرے دستِ سوال میں (حضرت امیر مینائی)

تھک تھک کے ہر مقام پہ دو چار رہ گئے ؛ تیرا پتا نہ پائیں تو ناچار کیا کریں

معنی مُقام بمعنی مکان و زمان اور مَقام زبر کے ساتھ ۔ رتبہ، مرتبہ ۔ یہاں مَقام منازلِ سلوک
و معرفت مراد ہے۔

فرماتے ہیں . تھک تھک کے ہر مقام پر کچھ لوگ بیٹھ گئے. کیونکہ ان کا حوصلۂ طلب اسی قدر تھا.
تیرا پتہ تو کہیں ملتا ہی نہیں اسی لئے تجھ کو بے نشاں اور لامکاں کہا جاتا ہے وہ جو ناچار رہ
گئے وہ کیا کرتے. ؎
پتہ اُس کا نہ تھا کوئی چلے تھے ڈھونڈنے جس کو ؛ خوشا قسمت ملا خود ہی وہ یارِ بے نشاں اپنا (شارح)

کیا شمع کے نہیں ہیں ہوا خواہ اہلِ بزم ؛ ہو غم ہی جاں گداز تو غم خوار کیا کریں ؛

فرماتے ہیں ۔ اہلِ بزم شمع کے ہمدرد ہیں اس کا بھلا چاہتے ہیں ۔ مگر جب شمع خود ہی جلنا اور فنا ہونا چاہے تو اہل بزم اس کی کیا مدد کر سکتے ہیں ۔ غمِ عشق ہی اگر جان کو گھُلا دینے والا ہو تو ہمارے غم خوار ہماری کیا مدد کر سکتے ہیں ۔ ٥

اُن کے دم سے ہے بزم جہاں روشن ؎ نہ ہو گر شمع پروانہ کہاں ہوگا

(شارح)

غزل ۱۰۱

ہو گئی ہے غیر کی شیریں زبانی کارگر عشق کا اُس کو گماں ہم بے زبانوں پر نہیں

فرماتے ہیں ۔ غیر کی شیریں زبانی کام آگئی اور وہ اپنا عشق جتانے میں کامیاب ہو گیا ۔ ایسی حالت میں وہ ہم بے زبانوں پر وہ کیونکر گمان کرے کہ ہم ہی اُس کے سچے عاشق ہیں ۔

اس کو موقعہ تو ملا عشق میں جل جانے کا ؎ ہم سے بہتر تو مقدر رہا پروانے کا

(شارح)

غزل ۱۰۲

قیامت ہے کہ سُن لیلیٰ کا دشتِ قیس میں آنا

تعجب سے وہ بولا "یوں بھی ہوتا ہے زمانے میں"

فرماتے ہیں ۔ جب میرے محبوب نے لیلیٰ کا اپنے محبوب کی پرسشِ حال کے لئے دشت میں آنا سُنا تو وہ تعجب سے بولا کہ کیا دنیا میں ایسا بھی ہوتا ہے کہ محبوب اپنی شرم و حیا اور لوگوں کی انگشت نمائی کو خاطر میں نہ لا کر عاشق کی مزاج پُرسی کے لئے صحرا میں نکل آئے ۔

دِل نازک پہ اُس کے رحم آتا ہے مجھے غالبؔ　　　نہ کر سرگرم اُس کافر کو اُلفت آزمانے میں

فرماتے ہیں ۔ میرا محبوب نازک دل رکھتا ہے ۔ اے غالبؔ تو مجھے امتحانِ اُلفت کے لئے تیار نہ کر ۔ مجھے خوف ہے کہ میرے جان قربان کر دینے سے اُسے بعد میں صدمۂ عظیم ہوگا اور وہ دُکھ اُٹھائے گا ۔ (مرزا صاحب نے کیسی عمدہ راہِ فرار نکالی ہے)

غزل ۱۰۳

دل لگا کر لگ گیا اُن کو بھی تنہا بیٹھنا　　　بارے اپنی بیکسی کی پائی ہم نے داد یاں

فرماتے ہیں ۔ وہ بھی کسی پر عاشق ہو کے تنہائی پسند ہو گئے ۔ ہم نے اپنی بے کسی اور بے بسی کی اور تنہائی کی داد دُنیا میں ہی پا لی ۔ ہمارا صبر اُن پر پڑ گیا ۔ جو حالت اُن کے ہجر میں ہماری تھی اب وہ بھی اُسی سے دوچار ہیں ۔

ہیں زوال آمادہ اجزا آفرینش کے تمام　　　مہرِ گردوں ہے چراغِ رہگزارِ باد یاں

فرماتے ہیں ۔ تمام اجزائے کائنات آمادۂ فنا اور زوال پذیر ہیں حتیٰ کہ آفتاب جن کی بہت سی قومیں پرستش کرتی رہیں اور کرتی ہیں یہ بھی اپنی منازل طے کر کے فنا ہو جائے گا ۔ رہگزار باد کہہ کر اس کی کمزوری اور بے ثباتی کا اظہار کیا ہے ۔

کیا اعتبار ہستیِ ناپائیدار کا　÷　یہ وسوسہ ہے دوشِ ہوا کے سوار کا

(شارح)

غزل ۱۰۴

یہ ہم جو ہجر میں دیوار و در کو دیکھتے ہیں — کبھی صبا کو کبھی نامہ بر کو دیکھتے ہیں

فرماتے ہیں ۔ ہجر میں بے قراری اور اضطرابی حالت ہونے کے سبب ہمیں قاصد کا بے چینی سے انتظار ہے کہ شاید محبوب کی طرف سے حسبِ خواہش کوئی پیغام لے آئے یا صبا ہی اُس کی بوئے پیرہن لے آئے ۔ دروازہ کو اِس لئے دیکھتے ہیں کہ قاصد دروازہ سے آئے گا اور صبا دیوار کے اُوپر سے آئے گی ۔

وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے — کبھی ہم اُن کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

فرماتے ہیں ۔ اُن کا ہمارے گھر میں آجانا تعجب اور حیرت کا مقام ہے کبھی حیرت سے اُن کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں ۔ حیرت کی انتہا نہیں ۔ کیونکہ عاشق کے لئے محبوب کا اس طرح آجانا قسمت کا جاگ جانا ہے ۔

نظر لگے نہ کہیں اُن کے دست و بازو کو — یہ لوگ کیوں مرے زخمِ جگر کو دیکھتے ہیں

۔ زخمِ جگر کی گہرائی اور کاری زخم کا لگنا اِس سے بہتر بیان نہیں کیا جا سکتا ۔ میر ایسے محبوب کے لئے حد درجہ کی خیر خواہی کا اظہار کیا ہے کہ یہ لوگ میرے زخمِ جگر کو تعریفی نگاہوں سے کیوں دیکھ رہے ہیں ۔ خطرہ ہے کہ کہیں محبوب کے دست و بازو کو نظر نہ لگ جائے ۔

ترے جواہرِ طرفِ کلاہ کو کیا دیکھیں — ہم اَوجِ طالعِ لعل و گوہر کو دیکھتے ہیں

فرماتے ہیں ۔ ہم اُن جواہرات کو کیا دیکھیں جو تیری کلاہ میں جڑے گئے ہیں ہم تو لعل و گہر کی نصیبے کی بلندی کو دیکھتے ہیں کہ پتھروں اور پانی کے قطروں کو یہ مرتبہ مل گیا کہ وہ تیری ٹوپی میں ٹانکے جائیں ۔ بقول اُستاد تسلیم شاہجہانپوری ؎

ہے تیری تابشِ رخ سے نقاب کی زینت
ترے جمال کو زینت نقاب کیا دے گا

غزل ۱۰۵

نہیں، کہ مجھ کو قیامت کا اعتقاد نہیں
شبِ فراق سے روزِ جزا زیاد نہیں

فرماتے ہیں ۔ ایسا نہیں ہے کہ مجھے قیامت کے آنے میں شک و شبہ ہو میں تو صرف یہ کہتا ہوں کہ شبِ فراق کی مصیبتوں سے روزِ جزا کی تکلیفیں زیادہ نہ ہوں گی ۔

ہو گئی شامتِ اعمال سے دُنیا برباد ؛ بھولے ہیں حق کو ہم ایسے کہ ذرا یاد نہیں (شارح)

کوئی کہے کہ شبِ مہ میں کیا بُرائی ہے
بلا سے آج اگر دن کو ابر و باد نہیں

فرماتے ہیں ۔ میکش کے لئے دو وقت میکشی کے لئے بہت موزوں ہیں ۔ وہ شراب اُن اوقات میں پینا چاہتا ہے جب ابر چھایا ہوا ہو اور سرد ہوائیں چل رہی ہوں یا پھر چاندنی راتیں ۔ کہتے ہیں اگر آج کا دن ابر آلود نہیں اور اِس میں ہوائیں نہیں چل رہی تو نہ سہی ہم چاندنی رات کا انتظار کریں گے کوئی ہمیں بتائے کہ اس میں کیا کمی ہے ۔

جو آؤں سامنے اُن کے تو مرحبا نہ کہیں
جو جاؤں واں سے کہیں کو تو خیر باد نہیں

مرزا غالب اس شعر میں یہ کہہ رہے ہیں کہ ہمارا محبوب بہت بے التفاتی سے کام لیتا ہے جب

اُن کے سامنے آتا ہوں تو خیر مقدم نہیں کرتے اور رخصت کے وقت خدا حافظ نہیں کہتے ۔

کبھی جو یاد بھی آتا ہوں میں تو کہتے ہیں — کہ "آج بزم میں کچھ فتنہ و فساد نہیں"

فرماتے ہیں ۔ اگر کبھی ان کو بزم میں میرا خیال آ بھی جاتا ہے تو اس کا اظہار اس رنگ میں کرتے ہیں کہ آج غالب بزم میں نہیں اس لئے بزم میں سکون کی کیفیت ہے اگر وہ ہوتے تو بات بات پر اُلجھتے جس کے نتیجہ میں بزم میں ہل چل مچ جاتی

علاوہ عید کے ملتی ہے اور دن بھی شراب — گدائے کوچۂ میخانہ نامراد نہیں

فرماتے ہیں ۔ عید کے دن بچے جوان بوڑھے سب ہی جا کر نمازِ عید پڑھتے ہیں اور پیرِ مغاں سے شرابِ محبت مانگتے ہیں ان کو معلوم ہونا چاہیئے کہ میخانہ میں عید کے دن کوئی قید نہیں ہے دوسرے دنوں میں اللہ تعالیٰ کی شرابِ محبت ملتی ہے ۔ اس سے کم یہ بھی مطلب ہو سکتا ہے ۔ غربا و مساکین کو دوسرے دنوں خیرات و زکوٰۃ سے متمتع کرنا چاہیئے ۔ یہی عید کے دن انھیں کچھ دے دیا بس

اُسے مشکل ہیں ہے کس نے پکارا
کہ پھر خالی گیا قسمت کا مارا

جہاں میں ہو غم و شادی بہم ہمیں کیا کام — دیا ہے ہم کو خدا نے وہ دل کہ شاد نہیں

فرماتے ہیں ۔ دُنیا میں غم اور شادی ساتھ ساتھ ہیں یہ ہی قاعدہ کلیہ نظر آتا ہے ۔ مگر ہم کیا کریں ہمیں تو شاد ہونے والا خدا نے دل ہی نہیں دیا ۔

تم اُن کے وعدے کا ذکر اُن سے کیوں کرو غالب — یہ کیا ؟ کہ تم کہو اور وہ کہیں کہ "یاد نہیں"

غزل ۱۰۶

تیرے توسن کو صبا باندھتے ہیں ہم بھی مضموں کی ہوا باندھتے ہیں

فرماتے ہیں۔ ہم تیرے تیز رفتار گھوڑے کو صبا سے تشبیہ دے کر اپنے مضمون کی ہوا باندھتے ہیں یعنی کلام کو مقبول بنانا چاہتے ہیں۔

آہ کا کس نے اثر دیکھا ہے ہم بھی اک اپنی ہوا باندھتے ہیں

فرماتے ہیں۔ ہمیں یہ معلوم ہے کہ ہماری آہ بے اثر ہے، اور ہمیں اس کا یقین ہے لیکن ہم تو آہ دل کا اس لئے کرتے ہیں کہ تم پر ہماری کیفیتِ دل عیاں ہو جائے اور شاید تم بھی اثر لینے پر مجبور ہو جاؤ۔

تیری سُرعت کے مقابل اے عمر برق کو پا بہ حنا باندھتے ہیں

فرماتے ہیں۔ عمر اتنی برق رفتاری سے گذر جاتی ہے کہ اس کے مقابلہ میں یہ کہنا صحیح ہو گا کہ بجلی کے پیروں میں مہندی لگی ہے اور وہ چلنے سے معذور ہے۔

قیدِ ہستی سے رہائی معلوم اشک کو بے سر و پا باندھتے ہیں

فرماتے ہیں۔ دُنیا کی ہر قید سے رہائی ممکن ہے اور مل جاتی ہے لیکن قیدِ ہستی بھگتنی ہی پڑتی ہے قطرۂ اشک کو باوجود بے سر و پا ہونے کے باندھتے ہیں اور وہ بندھ جاتا ہے۔ اور انسان بھی بے سر و پا بندھا رہتا ہے اور مرتبۂ فنا جو اصل آزادی ہے حاصل نہیں ہوتا۔

نشۂ رنگ سے ہے واشدِ گُل مست کب بندِ قبا باندھتے ہیں

فرماتے ہیں۔ نشۂ رنگ کے باعث پھول کھلتے ہیں۔ اِسی طرح مستوں پر جب نشۂ رنگ چڑھ جاتا ہے تو وہ بھی) اپنے بندِ قبا نہیں، باندھتے۔ بلکہ کھُلے رکھتے ہیں۔

غلطی ہائے مضامیں مت پوچھ لوگ نالے کو رسا باندھتے ہیں

(غلطی کی جمع اردو میں غلطیوں ہونی چاہیئے تھی یا پھر فارسی ترکیب تھی تو غلط ہائے ہوسکتا تھا۔ غلطی ہندی ترکیب ہے۔ یہ نکتہ میں نے اپنے بزرگ حضرت قبلہ حافظ صاحب سے سُنا تھا۔ میں، مرزا صاحب کی غلطی بھلا کہاں پکڑ سکتا ہوں میں نہ ایسی قابلیت رکھتا ہوں اور نہ اس کا اہل ہوں)

فرماتے ہیں۔ لوگ یعنی شعراء کرام نالہ کو رسا باندھتے ہیں یعنی اس کی رسائی کے قائل ہیں اور یہ مضامین کی غلطی ہے۔ نالے کو رسائی حاصل نہیں ہوتی اگر ہوتی تو اس کو باندھا کب جا سکتا تھا۔

اہلِ تدبیر کی واماندگیاں آبلوں پر بھی حنا باندھتے ہیں

فرماتے ہیں۔ کیا عقلمندی ہے کہ آبلہ پا ہوتے ہوئے مہندی لگاتے ہیں ایک تو آبلہ پا ہونے کے سبب پہلے ہی چلنے سے معذور ہیں اس پر حنا بغرضِ علاج لگاتے ہیں مگر اس کے مقابلہ میں اہلِ جنوں آبلہ پا ہوتے ہوئے دشتِ پُرخار طے کرتے رہتے ہیں اور تکالیف سے گھبرا کر رُک نہیں جاتے۔

سادہ پُرکار ہیں خوباں غالب ہم سے پیمانِ وفا باندھتے ہیں

فرماتے ہیں۔ حسین لوگ بظاہر بھولے بھالے نظر آتے ہیں لیکن حقیقت میں بہت ہشیار اور چالاک

ہیں یہ ہمیں دھوکہ دیتے ہیں۔ کیا ہم اُن کے فریب میں آجائیں گے اور اُن کے پیمانِ وفا پر یقین کریں گے۔ (ہم پر خوب زور دیا ہے)

غزل ۱۰۷

زمانہ سخت کم آزار ہے بجانِ اسدؔ وگرنہ ہم تو توقع زیادہ رکھتے ہیں

فرماتے ہیں ۔ ہم اپنی جان کی قسم کھا کر یہ اظہار کر رہے ہیں کہ ہمارے لئے زمانے کی سختیاں ہماری توقع سے بہت ہی کم ہیں۔ ہم تو اس سے بہت زیادہ کی توقع رکھتے تھے۔

غزل ۱۰۸

دائم پڑا ہوا ترے در پر نہیں ہوں میں خاک ایسی زندگی پہ کہ پتھر نہیں ہوں میں

فرماتے ہیں۔ کہ میں ہمیشہ تیرے سنگِ در کی طرح تیرے در پہ پڑا نہیں رہ سکتا۔ بھاڑ میں جائے ایسی زندگی کہ تیرے در کا سنگِ در ہی بنا رہوں۔

کیوں گردشِ مُدام سے گھبرا نہ جائے دل انسان ہوں پیالہ و ساغر نہیں ہوں میں

فرماتے ہیں ۔شب و روز کی مسلسل گردش سے میرا دل گھبرا رہا ہے اور یہ کیسے ممکن ہے کہ مسلسل تکالیف سے دل گھبرا نہ جائے۔ پیالہ و ساغر تو بے جان چیزیں اگر گردش میں رہتے ہیں تو انہیں کوئی فرق نہیں پڑتا مگر مجھے تو عقل، جذبات اور حساس طبیعت عطا ہوئی ہے۔

یارب زمانہ مجھ کو مٹاتا ہے کس لیے؟ لوحِ جہاں پہ حرفِ مکرر نہیں ہوں میں

فرماتے ہیں۔ اے میرے رب زمانہ مجھے کیوں مٹاتا ہے۔ میں جہان کی تختی پر وہ لفظ نہیں ہوں جو غلطی سے دو دفعہ لکھا گیا ہو جس کو مٹانا لازمی ہوتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ میرے رب تو ہی میری حفاظت و نصرت کرنے والا ہے پھر میرے ساتھ زمانہ کی یہ بدسلوکیاں کیوں ہیں۔

حد چاہیئے سزا میں عقوبت کے واسطے آخر گناہگار ہوں کافر نہیں ہوں میں

فرماتے ہیں۔ سزا کی ایک حد لازمی ہونی چاہیئے کہ اس عرصہ میں ہی تکلیف ملے مسلسل عذاب کا سلسلہ جاری نہیں رہنا چاہیئے ویسے بھی میرے گناہ غلطیاں ایک محدود وقت میں مجھ سے سرزد ہوئی ہوں گی وہ لامحدود وقت میں تو نہیں تھیں پھر محدود کی سزا لامحدود نہیں ہونی چاہیئے۔ یہ تیرے انصاف سے بعید ہے ہاں اگر میں سرے سے ہی کافر ہوتا تو اور بات تھی۔ کہ اس کے لیے عذابِ دوزخ ہمیشہ رہے میں تو تجھ پر ایمان لاتا ہوں۔

قطعہ نعتیہ

کس واسطے عزیز نہیں جانتے مجھے لعل و زمرّد و زر و گوہر نہیں ہوں میں

یہ شعر اشعارِ نعتیہ میں سے ہے مرزا غالب بارگاہِ نبوت صلی اللہ علیہ وسلم میں عرض کرتے ہیں کہ حضور کس واسطے مجھے عزیز نہیں رکھتے۔ میں لعل ہوں نہ زمرّد ہوں اور نہ گوہر ہوں یعنی مالِ دُنیا میں سے نہیں ہوں۔ جن کو آپ عزیز نہیں رکھتے تھے۔

یادِ آقا میں جو ناقر نے لکھی ہیں اُمتیں ؛ دوست سُن سُن کے انہیں صلِّ علیٰ کہتے ہیں
حکم ہے رب کا جو ہم صلِّ علیٰ کہتے ہیں ؛ ٹھیک کہتے ہیں اگر عکسِ خدا کہتے ہیں (شارح)

رکھتے ہو تم قدم مری آنکھوں سے کیوں دریغ رتبے میں مہر و ماہ سے کمتر نہیں ہوں میں

فرماتے ہیں ۔ آپ میری آنکھوں پہ قدم کیوں نہیں رکھتے ہیں۔ رتبہ میں میں آفتاب و مہتاب سے کم تو نہیں ہوں ۔ شبِ معراج میں آپ نے آفتاب و مہتاب کو قدم بوسی کا موقعہ عنایت فرمایا تھا۔ میں انسان پھر آپ پر ایمان لانے والا انسان ہوں جس کو اشرف المخلوقات کہا گیا ہے ۔

کرتے ہو مجھ کو منعِ قدم بوس کس لئے کیا آسمان کے بھی برابر نہیں ہوں میں

غالب کا یہ شعر بھی نعتیہ شعر ہے جس میں حضورؐ کے واقعۂ معراج کی طرف اشارا ہے۔ غالب عرض کرتے ہیں کہ شب معراج میں حضورؐ نے آفتاب و مہتاب کو قدم بوسی کا شرف عطا فرمایا تھا پھر میں جو اشرف المخلوقات کا درجہ رکھتا ہوں اور رتبہ میں آفتاب و مہتاب سے بالاتر ہوں۔ کیوں قدم بوسی کی سعادت سے محروم رکھا گیا ہوں ۔

غالبؔ وظیفہ خوار ہو دو شاہ کو دُعا وہ دن گئے کہ کہتے تھے نوکر نہیں ہوں میں

آخر میں یہ نیا پہلو نکالا اور نعت میں بادشاہ کو دُعا اور شکریہ ادا کیا ہے مصرعہ ثانی بہت لطف والا۔ اور خاص کر" وہ دن گئے ۔"

غزل ۱۰۹

سب کہاں ؟ کچھ لالہ و گُل میں نمایاں ہو گئیں

خاک میں کیا صورتیں ہوں گی جو پنہاں ہو گئیں

فرماتے ہیں بڑے بڑے حسین ، بڑے بڑے حکمراں ، بڑے بڑے علوم جاننے والے عالم ، بڑے بڑے

اللہ والے کتنے تھے جو خاک کا رزق بن گئے۔ اب اُنکے حسن و جمال میں سے کچھ خاک گل و لالہ کی شکل میں واپس دے رہی ہے مگر جو کچھ دے رہی وہ بہت ہی قلیل ہے۔

قدرتیں خالق کی ہر شے میں نمایاں ہوگئیں ¤ رنگِ صحرا بن کے چمکیں، ابرِ باراں ہوگئیں، (شارح)

یاد تھیں ہم کو بھی رنگارنگ بزم آرائیاں — لیکن اب نقش و نگارِ طاقِ نسیاں ہوگئیں

فرماتے ہیں۔ یاد تھیں مطلب ہے کہ ہم بھی تم لوگوں کی طرح سے رنگ برنگ مجلسیں لگاتے تھے عیش و عشرت میں اپنا وقت ضائع کرتے تھے۔ لیکن وہ شان و شوکت جاتی رہی، شباب کا زمانہ بھی گزر گیا اب صرف حسرت و افسوس باقی ہے۔ ہمارا حال اب عبرت ناک ہے۔ گزشتہ صحبتیں تعلقات نقش و نگارِ طاقِ نسیاں ہوگئیں۔ یعنی یاد بھی نہیں آتیں۔

تھیں بنات النعش گردوں دن کو پردے میں نہاں

شب کو اُن کے جی میں کیا آئی کہ عریاں ہوگئیں

فرماتے ہیں۔ آسمان کے سات ستارے جن کو اہل عرب بنات النعش کہا کرتے تھے ان میں چار ستارے جنازہ کے متماثل ہیں اور تین اس جنازے کو اٹھانے والے ہیں اور ہندوستان کے لوگ سات سہیلیوں کا جھمکا کہتے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ دن کو وہ چھپی رہتی تھیں۔ رات کو آسمان پر چمک اٹھتی ہیں۔ ان کے جی میں یہ بات کیوں آتی ہے؟ مطلب شعر کا یہ ہے کہ اقبال مندی کے زمانے میں تو یہ بُرے کام نہیں کرتیں جب ان پر دن کی جگہ رات آجاتی ہے یعنی ترقی اور اقبال مندی کا دور ختم ہو جاتا ہے۔ تو وہ اپنے آپ کو ذلیل و رسوا کر لیتی ہیں۔

قید میں یعقوب نے لی گو نہ یوسف کی خبر — لیکن آنکھیں روزنِ دیوارِ زنداں ہوگئیں

فرماتے ہیں۔ گو بظاہر حضرت یعقوب علیہ السلام اپنے بیٹے حضرت یوسف علیہ السلام کی خبر گیری ان کی اسیری کے زمانے میں نہ کر سکے مگر اُن کی آنکھیں حضرت یوسفؑ کو نورِ بصیرت سے دیکھتی رہیں اور

ان کی نگرانی کرتی رہیں۔

سب رقیبوں سے ہوں ناخوش پر زنانِ مصر سے
ہے زلیخا خوش کہ محوِ ماہِ کنعاں ہوگئیں

فرماتے ہیں۔ زمانے کا رواج اور لوگوں کا مزاج اس نہج پر واقع ہوا ہے کہ انسان رقابت پسند نہیں کرتا بلکہ رقیبوں کو اپنا دشمن سمجھتا ہے۔ مگر حالات مختلف ہونے پر اس کلیہ میں استثنائی صورت بھی نکل آتی ہے جیسا کہ زلیخا اپنے اُن رقیب نما سہیلیوں سے خوش ہوئی جو کنعان کے چاند یعنی حضرت یوسف علیہ السلام کو دیکھ کر محو نظارہ ہوگئیں اور اُن پر محویت کا یہ عالم طاری ہوا کہ چھریوں سے پھل کاٹنے کے بجائے اپنی انگلیاں زخمی کر بیٹھیں یہ قصہ قرآن کریم نے نہیج اور احسن طور پر بیان فرمایا ہے۔ عشق کی وادی میں ہم نے جب سے رکھا ہے قدم :: بستیاں عقل و خرد کی ساری ویراں ہوگئیں (شارح)

جو نے خوں آنکھوں سے بہنے دو کہ ہے شامِ فراق
میں یہ سمجھوں گا کہ شمعیں دو فروزاں ہوگئیں

فرماتے ہیں۔ میری آنکھوں سے خون کا دریا بہنے دو اور مجھے رونے سے منع نہ کرو کہ یہ شب تارِ فراق کی شب ہے کچھ رو لوں گا تو اس اندھیرے میں یہ میری دو آنکھیں روشن شمعوں کا کام دیں گی۔

اِن پری زادوں سے لیں گے خلد میں ہم انتقام
قدرتِ حق سے یہی حوریں اگر واں ہوگئیں

فرماتے ہیں۔ اور حسینوں کو خبردار کرتے ہیں کہ یہاں تو تم ہم کو ستاتی ہو، رلاتی ہو۔ ہماری دنیاوی زندگی کو روگ لگا رکھا ہے۔ ہم یہاں تو تم سے بدلہ نہیں لے سکتے لیکن یاد رکھو کہ جنت میں اگر تمہیں ہی ہمارے لئے حوریں بنا دیا گیا اور تم ہماری ملکیت میں آگئیں تو ہم بھی وہاں جی بھر کے

بدلے لیں گے اور ساری عمر کی کسر نکال دیں گے۔

نیند اُس کی ہے، دماغ اس کا ہے، راتیں اُس کی ہیں

تیری زلفیں جس کے بازو پر پریشاں ہو گئیں

فرماتے ہیں۔ کہ اے میرے محبوب جس کو تیرا وصل نصیب ہوا جس کے بازوؤں پر ہنگام وصل تیری زلفیں بکھر گئیں تو اُس عاشق کے نصیب کا کیا کہنا۔ کیونکہ اُس کی نیند اُس کا دماغ اور اُس کی راتیں قابلِ رشک ہیں جو ہر کس و ناکس کو حاصل نہیں عاشقِ صادق ہی کے نصیب ہیں ہیں۔

مَیں، چمن میں کیا گیا گویا دبستاں کھُل گیا

بلبلیں سُن کر مرے نالے غزل خواں ہو گئیں

فرماتے ہیں۔ میرے باغ میں جاتے ہی بلبلوں نے بھی غزل خوانی شروع کر دی جس طرح مکتب میں استاد کے آتے ہی بچے سبق یاد کرنے لگ جاتے ہیں۔ مشاہدہ کہتا ہے کہ جب کوئی خوش آواز و خوش گلو گا رہا ہو تو دوسروں کو بھی تحریک ہو جاتی ہے اور وہ بھی اُنہیں دُھنوں میں گنگنانے لگتے ہیں۔

وہ نگاہیں کیوں ہوئی جاتی ہیں یارب دل کے پار

جو مری کوتاہیِ قسمت سے مژگاں ہو گئیں

فرماتے ہیں۔ نگاہوں کا مژگاں ہونا یہ ہے کہ بوجہ شرم و حیا اُوپر نہیں اُٹھتیں۔ آنکھیں مژگاں بن کر رہ گئی ہیں۔ ہر وقت نیچے ہی جھکی رہتی ہیں۔ یہ میری کوتاہی قسمت ہی تو ہے کہ میں محبوب کی آنکھوں سے جامِ محبت نہیں پی سکتا۔ مگر دوسری طرف وہی آنکھیں مجھے نیم نگاہی سے اپنا والا و شیدا بنا رہی ہیں۔

انقلابِ دہر سے عقلیں بھی حیراں ہو گئیں ؛ بستیاں کچھ اس طرح اُجڑیں بیاباں ہو گئیں
(شارح)

بس کہ روکا میں نے اور سینے میں اُبھریں پے بہ پے

میری آہیں بخیۂ چاکِ گریباں ہوگئیں

فرماتے ہیں ۔ میں نے اپنی آہوں کو بہت روکا بہت ضبط سے کام لیا وہ میرے سینہ میں بار بار جوش مار کر نکلنا چاہتی تھیں ۔ اسی وجہ سے وہ آہیں چاکِ گریبان کا بخیہ بن گئیں اور باوجود گریبان چاک ہونے کے رازِ عشق فاش نہ ہوا اور یہ عشق کا پردہ تھا ۔

واں گیا بھی میں تو ان کی گالیوں کا کیا جواب ؟

یاد تھیں جتنی دُعائیں صرفِ درباں ہوگئیں

فرماتے ہیں ۔ درباں کی منّت سماجت میں جتنی دُعائیں یاد تھیں درباں کو دے دیں ۔ اب کوئی نئی دُعا یاد نہیں آتی ۔ اب اندر محبوب کے پاس جاؤں اور وہ بھی بُرا بھلا کہنے لگے اور گالیاں دے تو اُسے دعا کہاں سے دوں گا وہ سب تو درباں کو دے چکا اور محبوب کے لئے اُن ہی دعاؤں کا دہرانا محبوب کی کسرِ شان ہے ۔ قابلِ توجہ بات ہے کہ گالیوں کے جواب میں دُعائیں دینا معمول گردانا ہے ۔

جاں فزا ہے بادہ جس کے ہاتھ میں جام آگیا

سب لکیریں ہاتھ کی گویا رگِ جاں ہوگئیں

معنی ۔ جاں فزا = راحت بخش ، زندگی بخش ۔ بادہ = شرابِ محبّت ، رگِ جاں =

فرماتے ہیں ۔ شراب جانفزا ہے اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ جس کے ہاتھ میں جام آجاتا ہے اسکے ہاتھ کی سب لکیریں رگِ جان بن جاتی ہیں جس سے سارے جسم میں جان پڑ جاتی ہے ۔

مطلب اصل میں یہ ہے جو کہ ساری غزل کا سٹائل بتا رہا ہے کہ معشوقِ ازلی کی شرابِ محبت کا جام جس کو مل جاتا ہے اُس کی قسمت جاگ جاتی ہے اُس کے ہاتھ کی سب لکیریں اس کی

رگ جاں اور زندگی بخش ہو جاتی ہیں۔ شعر بھی اپنی ذات میں بہت ہی لطیف اور معنی آفریں ہے

ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم

ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں

فرماتے ہیں ۔ ہر کلمہ گو اصل توحید حاصل کر کے ہی موحد بنتا ہے۔ اگر ہم موحد بننا چاہتے ہیں تو ہمارا کام ہر قسم کی رسوم کو جو کہ ملتوں کا مذہب بن چکی ہیں مٹانا ہے اس کے بغیر توحیدِ خالص حاصل نہیں ہو سکتی۔ اور جب ہم ملتوں کو یعنی رسوم کو مٹانے میں کامیاب ہو جائیں گے تو ہمارے ایمان کی تکمیل ہوگی اور ہم دینِ واحد کے پرستار بن جائیں گے۔

بحرِ عصیاں میں تموج جب کبھی آیا شدید ؛ اچھی دُنیا دُ دبی کی نذرِ طوفاں ہو گئیں (شاسع)

رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج مشکلیں مجھ پر پڑیں اتنی کہ آساں ہو گئیں

فرماتے ہیں ۔ آدمی پر جب سخت مصائب و تکالیف مسلسل آتی ہیں تو وہ ان کا عادی ہو جاتا ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ رنج و غم کی تکلیف میں کمی آجاتی ہے اور ویسے بھی برداشت کی عادت ہو جاتی ہے۔

یُوں ہی گر روتا رہا غالبؔ تو اے اہلِ جہاں! دیکھنا اِن بستیوں کو تم کہ ویراں ہو گئیں

فرماتے ہیں ۔ اگر حالات نہ بدلے اور غالبؔ اسی طرح ہی ہدایتوں کا رونا روتا رہا تو تم جلد ہی ان بستیوں کو ویران ہوتے دیکھو گے۔ کیونکہ غالب کا سیلابِ اشک ان بستیوں کو بہالے جائے گا۔ بستیوں کی ویرانی کا سبب غالبؔ میاں کا رونا نہیں بلکہ قومی حالات کا نہ بدلنا ہوگا جس وجہ سے غالب رو رہا ہے

خیر خواہی آپ کی ناصر کو تھی مدِ نظر ؛ تلخ باتیں آپ سے کرنا جو آساں ہو گئیں

(شارع)

غزل ۱۱۰

دیوانگی سے دوش پہ زنّار بھی نہیں　　یعنی ہماری جیب میں اک تار بھی نہیں

فرماتے ہیں۔ عجیب دیوانگی ہے کہ جس نے ہمارے گریبان میں ایک تار بھی باقی نہیں رہنے دیا۔ اگر دو چار بھی تار جنوں کے ہاتھوں بچتے تو ہم زنّار بنا کر ہی کندھے پہ ڈال لیتے اور اہلِ جہاں ہمیں اس قدر مجنوں نہ سمجھتے۔ مطلب یہ ہے کہ عشق کی انتہا یہ ہے کہ کچھ ہوش ہی نہیں رہتا۔

دل کو نیازِ حسرتِ دیدار کر چکے　　دیکھا تو ہم میں طاقتِ دیدار بھی نہیں

فرماتے ہیں۔ حصولِ دیدار کی تمنا میں اپنے آپ کو خاک میں ملا لیا۔ اب خیال آتا ہے کہ بوقتِ دیدار دیدار کی طاقت ہی نہیں ہوگی۔ مطلب یہ ہے کہ حصولِ مقصد کی تمنا میں اتنی جان کاہی سے کام لینا پڑتا ہے کہ جب وہ مقصد حاصل ہو جاتا ہے تو اس سے لطف اندوزی کی طاقت ہی باقی نہیں رہتی۔ یہی حقیقت دنیاوی مقاصد کے حاصل ہونے پر ہوتی ہے۔ جب راحت کا وقت آتا ہے تو زندگی ایسی منزل میں پہنچ چکی ہوتی ہے کہ لذّت اندوزی سے کوئی واسطہ نہیں رہتا۔

ملنا ترا اگر نہیں آساں تو سہل ہے　　دشوار تو یہی ہے کہ دُشوار بھی نہیں

فرماتے ہیں۔ اللہ اللہ کس قدر موزونیتِ محاورات ہے اور شعر حقیقت اور مجاز دونوں پر بیک وقت محمول ہوتا نظر آتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر تیرا ملنا آسان نہ ہوتا تو ہم ہمّت نہ کرتے اور مایوس ہو کر بیٹھ رہتے اور تیرے حصول کی خلش سے نجات حاصل کر لیتے مگر چونکہ دشوار نہیں ہے تو ہمارے لئے یہی دشواری ہے۔ وہ شاہدِ حقیقی خود بھی کہتا ہے کہ میں تمہاری شہ رگ سے بھی

قریب ہوں. یعنی رگ جان سے بھی پھر بھی اُس کے پانے میں عمر تمام ہو جاتی ہے اور بعض سالک
تو اس کے وجود کا ہی انکار کر بیٹھتے ہیں۔

بے عشق عمر کٹ نہیں سکتی ہے اور یاں طاقت بقدرِ لذّتِ آزار بھی نہیں

فرماتے ہیں ۔ بغیر عشق کے زندگی گذارنا محال ہے۔ اور اس راہ میں جن مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا
ہے۔ مجھ میں اس کی طاقت بھی نہیں ہے۔ عشق خواہ دنیوی ہو یعنی دُنیا کی لذتوں کے حصول
کا ہو یا عشقِ حقیقی دونوں میں مشکلات حائل ہیں لیکن ہمارا یہ حال ہے کہ ہم میں مشکلات کی
نہ برداشت ہے اور نہ ہمت ۔

شوریدگی کے ہاتھ سے سر ہے وبالِ دوش صحرا میں اے خدا کوئی دیوار بھی نہیں

فرماتے ہیں ۔ عشق نے جنون کو جنم دیا جس سے شوریدہ سری پیدا ہوئی ۔ سب کچھ لُٹا بیٹھے۔ لیکن صحرا
میں اس کا کوئی علاج نہیں۔ کوئی دیوار ہوتی جس سے سر ٹپک کر مر جاتے اور شوریدگی سے نجات
مل جاتی۔ یہ مطلب ہے اگر شعر کے لفظوں کو نہ پکڑا جائے اور حقیقت سے گریز کرتے ہوئے
اس قدر معنی ہیں کہ شوریدہ سری کی وجہ سے سر اپنے کندھوں پر وبالِ جان بنا ہوا ہے۔ گھر سے
دیوانگی میں صحرا میں آ گئے اب مرنا بھی چاہیں تو سر پھوڑنے کے لئے یاں دیوار بھی نہیں۔

گنجائشِ عداوتِ اغیار اک طرف یاں دل میں ضعف سے ہوسِ یار بھی نہیں

فرماتے ہیں۔ گنجائش عداوتِ اغیار کا ذکر ہی چھوڑو۔ عشق و ہوس کا زمانہ گزر جانے کے بعد اپنی پڑ جاتی ہے
نہ یار سے وصل کی تمنا رہ جاتی ہے۔ نہ غیروں سے عداوت باقی رہتی ہے اللہ بس باقی ہوس۔

ڈر نالہ ہائے زار سے میرے۔ خدا کو مان آخر نوائے مرغِ گرفتار بھی نہیں

فرماتے ہیں) ۔میرے نالوں سے خوف کھا' میرا دل نہ دکھا۔ مجھے نہ ستا۔ میرے خدا کا خوف کھا کہ وہ مظلوم کی فریاد سنتا اور دادرسی کو پہنچ جاتا ہے آخر میرے نالے مرغِ گرفتار کی آواز تو نہیں کہ صیاد اُس کی فریاد پر دھیان نہ دے اور اُسے آزاد نہ کرے ۔

دل میں ہے یار کی صفِ مژگاں سے رو کشی حالانکہ طاقتِ خلشِ خار بھی نہیں

فرماتے ہیں ۔ دل میں کبھی کبھی فوجِ مژگانِ یار سے مقابلہ کا خیال آتا ہے ۔ حالانکہ نوبت یہاں تک پہنچ چکی ہے کہ کانٹے کی تکلیف بھی برداشت کرنے کی تاب نہیں ۔

اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

فرماتے ہیں ۔ اے خدا وہ کون ہوگا جو میرے معشوق کی سادگی دیکھ کر اپنا دل نہ دے بیٹھے کہ آزمودہ کاروں سے لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں ۔ مطلب یہ ہے کہ آج کل اپنی قوم کی بھی یہی حالت ہے بڑی بڑی قوموں کا مقابلہ کرنا چاہتے ہیں مگر بمقابلہ دوسروں کے ہاتھ میں تلوار بھی نہیں ۔

دیکھا اسدؔ کو خلوت و جلوت میں بارہا دیوانہ گر نہیں ہے تو ہشیار بھی نہیں

۔ فرماتے ہیں ہم نے اسد کو مجلسوں میں دیکھا اور تنہائی میں بھی دیکھا ہے اُس سے ملے ہیں بات چیت کی ہے اور اگر بقول تمہارے وہ دیوانہ نہیں ہے تو کامل طور پر ہم اسے ہشیار بھی نہیں سمجھتے ۔ـــہ

ہ ال کیسے کہوں اُس رند کی سرمستی کا ؛ جام جب، نے ہو پیا عشق کے میخانے کا

(شارح)

غزل ۱۱۱

نہیں ہے زخم کوئی بخیئے کے درخور مرے تن میں

ہوا ہے، تارِ اشکِ یاس رشتہ چشمِ سوزن میں

فرماتے ہیں ۔ میرے جسم میں کوئی بھی زخم ایسا نہیں جو بہت گہرا نہ ہو لہٰذا اُن کو سیا بھی نہیں جا سکتا۔
اسی وجہ سے تاگا سوئی کے ناکے میں جاکر تارِ اشک بن گیا ہے۔
مطلب یہ ہے کہ اگرچہ میری چھوٹی موٹی تکلیف ہوتی تو کوئی دوست احباب غم خواری کر کے میری مدد کرتے ۔معاملہ چونکہ بہت زیادہ بگڑا ہوا ہے اس لئے اُن مددگاروں غم خواروں کے پاس سوائے مایوسی کے آنسو بہلانے کے میرے لئے کچھ نہیں ہے۔

ہوئی ہے مانعِ ذوقِ تماشا خانہ ویرانی　　کفِ سیلاب باقی ہے برنگِ پنبہ روزن میں

فرماتے ہیں ۔خانہ ویرانی کا تماشا دیکھنے کا جو ذوق ہمارے دل میں تھا وہ پورا نہ ہو سکا کیونکہ کفِ سیلاب ہمارے گھر کے روزنوں میں روئی کے پھایوں کی طرح درمیان میں آ گیا جس کی وجہ سے ہمارا ذوق ادھورا رہ گیا۔

ودیعت خانۂ بیدادِ کاوش ہائے مژگاں ہوں　　نگینِ نامِ شاہد ہے مرے ہر قطرہ خوں تن میں

فرماتے ہیں ۔میں امین ہوں خانۂ بے دادِ کاوش ہائے مژگانِ یار کا۔ میرے جسم کے ہر قطرۂ خوں پر میرے معشوق کا نام کندہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ میرے جسم کا رُواں رُواں مرہونِ منّتِ معشوق ہے لہٰذا مجھے ہر وقت خدا کا شکر کرتے رہنا چاہیئے۔

بیاں کس سے ہو ظُلمت گستری میرے شبستاں کی

شبِ مہ ہو جو رکھ دیں پنبہ دیواروں کے روزن میں

فرماتے ہیں ۔ میرے ظلمت کدہ کی تاریکی کون بیان کرسکتا ہے بس یہ سمجھ لو کہ اگر اُس کے روزنِ دیوار میں روئی رکھ دی جائے تو وہ روشنی کا کام دے گی ۔ جیسا کہ چاندنی رات ہوتی ہے ۔

نکوہش مانعِ بے ربطیِ شورِ جنوں آئی

ہُوا ہے خندۂ احباب بخیہ جیب و دامن میں

فرماتے ہیں ۔ احباب کی ملامت و سرزنش کی وجہ سے میری بے ربطیِ شورِ جنوں رُک گئی اور اُن کا تمسخر میرے جیب و دامن کا بخیہ بن گیا ۔ مطلب یہ ہے کہ میں دوستوں کی لعن طعن کی وجہ سے آوارگی سے بچ گیا ورنہ خدا جانے کہاں تک نوبت آتی ۔

ہُوئے اُس مہروش کے جلوۂ تمثال کے آگے

پَرافشاں جوہرِ آئینہ مثلِ ذرّہ روزن میں

فرماتے ہیں ۔ اُس پیکرِ حسن کے جلوے کے آگے آئینہ کے جوہر اس طرح اُڑتے ہیں جیسے دیواروں کے روزنوں میں سورج کی دُھوپ میں ذرّے نظر آتے ہیں ۔

نہ جانوں نیک ہُوں یا بَد ہُوں، پر صحبت مُخالف ہے

جو گُل ہُوں تو ہُوں گلخن میں جو خس ہوں تو ہُوں گلشن میں

فرماتے ہیں ۔ کہ میں اپنے آپ کو نیک کہتا ہوں نہ بد ۔ بس اتنا کہتا ہوں کہ میں غلط جگہ پر ہوں اگر گل ہوں تو میں بھٹی میں ڈالا گیا ہوں اور اگر خس ہوں تو مجھے گلشن میں جگہ ملی ہے ۔

ہزاروں دِل دیئے جوشِ جنونِ عشق نے مجھ کو

سیہ ہو کر سویدا ہو گیا ہر قطرہ خوں تن میں

معنی ۔ سویداء کالا داغ

فرماتے ہیں ۔ جوشِ جنوں نے مجھے ایک نہیں ہزاروں دل دیئے لیکن دیوانگی کی وجہ سے جو خون میرے جسم میں تھا سیاہ ہو گیا اور ہر قطرہ اپنی جگہ پر جم کر سویدا یعنی کالا دھبہ بن کر دل پر نمودار ہو گیا ۔

اسد زندانیٔ تاثیرِ اُلفت ہائے خوباں ہوں

خمِ دستِ نوازش ہو گیا ہے طوق گردن میں

فرماتے ہیں ۔ اسد حسینوں کی تاثیرِ محبت نے تجھے قید کر لیا ہے ۔ یہ تیرے لئے قید خانہ بن گیا ہے اور مہربانیاں نوازشیں تیری گردن میں طوق کا کام کر رہی ہیں ۔ مطلب یہ ہے کہ وہ حسینوں کی نوازشات کا اسیر ہو کر رہ گیا ہے ۔

غزل ۱۱۲

مزے جہان کے اپنی نظر میں خاک نہیں　　　سوائے خونِ جگر، سو جگر میں خاک نہیں

فرماتے ہیں ۔ دُنیا کے عیش و آرام کھانے پینے کی لذتیں میری نظر میں کچھ وقعت نہیں رکھتیں نہ پہلے رکھتی تھیں ۔ البتہ خونِ جگر پیا کرتا تھا سو وہ بھی اب جگر میں نہیں ہے مطلب یہ ہے کہ اب زندگی کا ہر لطف جاتا رہا ۔

دو روزہ ہے یہ لطفِ عیش و نشاطِ دنیا ❖ ادائے شب عروسی مہمان ہے پیرہن میں　آتش

مگر غبار ہوئے پر ہوا اُڑا لے جائے　　　　وگرنہ تاب و تواں بال و پر میں خاک نہیں

فرماتے ہیں ۔ شاید غبار ہونے کے بعد ہوا اڑا کر منزلِ مقصود پر لے جائے ۔ ویسے ہم میں تو اب تاب و تواں نہیں ہے کس قدر ذوقِ وصالِ یار ہے لیکن تاب و تواں، جواب دے گئی ہے۔ عہدِ پیری میں ذوقِ وصالِ یار ترقی پذیر رہتا ہے۔ اور تمام اعضاء زوال پذیر ہیں ۔

یہ کس بہشت شمائل کی آمد آمد ہے　　　　کہ غیرِ جلوۂ گُل رہ گزر میں خاک نہیں

فرماتے ہیں ۔ یہ کس با خدا انسان کی آمد ہوئی ہے کہ ساری رہ گزر جلوۂ گل کی طرح سجی ہوئی ہے اور سوائے جلوۂ گل کے کچھ نظر نہیں آتا ۔

بھلا اُسے نہ سہی، کچھ مجھی کو رحم آتا　　　　اثر مرے نفسِ بے اثر میں خاک نہیں

فرماتے ہیں ۔ اگر اُسے نہیں تو میں ہی اپنی جان پر رحم کرتا اور نالہ کشی سے باز رہتا مگر جبکہ یہ معلوم ہے کہ میرے نالۂ بے اثر میں کچھ بھی اثر نہیں ہے ۔

خیالِ جلوۂ گُل سے خراب ہیں مے کش　　　　شراب خانہ کے دیوار و در میں خاک نہیں

فرماتے ہیں۔ خیالِ جلوہ گُل یعنی محبوبوں کے خیال سے میکش بدمست ہو رہے ہیں ۔ ورنہ اس شراب خانۂ دُنیا کے دیوار و در میں کچھ بھی نہیں ۔ مطلب شعر کا یہ ہے کہ لطفِ زندگی صرف محبتِ الہٰی میں ہے۔ دُنیا کی لذتوں میں کچھ نہیں رکھا کیونکہ وہ فانی ہیں ۔

ہُوا ہوں عشق کی غارت گری سے شرمندہ　　　　سوائے حسرتِ تعمیر گھر میں خاک نہیں

فرماتے ہیں۔ عشقِ دنیا غارت گری کے سوا گھر میں خاک بھی نہیں چھوڑتا ایسی بلا ہے کہ سب کچھ تباہ و برباد کر دیتا ہے ۔ جس گھر میں قدم رکھے اس کا ستیاناس ہی کرتا ہے ۔ اسی وجہ سے ایسے

عشق سے میں شرمندہ ہوں جو انسان کے پاس سوائے حسرت تعمیر کے اور کچھ نہیں چھوڑتا۔

ہمارے شعر ہیں اب صرف دل لگی کے اسدؔ کھلا، کہ فائدہ عرضِ ہنر میں خاک نہیں

فرماتے ہیں ۔ اے اسدؔ اب ہمارے شعروں میں، دل لگی کے سامانوں کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔ اچھے شعروں کے قدردان نہیں رہے نہ ہمارے شعروں کی خوبیاں پہچاننے والے کہیں نظر آتے ہیں۔ اس لئے ہم نے بھی اپنے تغزل کا رنگ تبدیل کر دیا ہے۔

ذوقِ سخن جہاں نہیں، بزمِ ادب جہاں نہیں ؛ ناصرِؔ خوش نوا وہاں اپنی غزل سنائے کیوں (شارح)

غزل ۱۱۳

دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت، درد سے بھر نہ آئے کیوں؟

روئیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں ستائے کیوں؟

فرماتے ہیں ۔ جور و ستم بھی کرتے ہیں اور ضبط کی تاکید بھی کرتے ہیں یہ ہمارا دل ہے کوئی اینٹ پتھر تو نہیں کہ درد محسوس نہ کرے۔ آخر جب ظلم و ستم کی انتہا ہو گی تو ہمارا دل ضرور بھر آئے گا اور ہم رو کر اپنے دل کی آگ بجھائیں گے اور ہزار بار یونہی کریں گے کوئی ہمیں ستاتا کیوں ہے محبوب کو خطاب کرنے کے لئے "کوئی" کا لفظ استعمال کیا ہے۔

دَیر نہیں، حرم نہیں، در نہیں، آستاں نہیں

بیٹھے ہیں رہ گزر پہ ہم، غیر ہمیں اُٹھائے کیوں

یہ شعر لاکھوں میں ایک ہے معنی بھی صاف اور لطف انداز ہیں۔

جب وہ جمالِ دل فروز، صورتِ مہرِ نیم روز
آپ ہی ہو نظارہ سوز پردے میں منہ چھپائے کیوں؟

فرماتے ہیں ۔ جبکہ شاہدِ حقیقی جو کہ دل کو روشن کرنے والا اور مہرِ نیم روز کی طرح سے اپنا جمال اپنی مخلوق کو خود ہی دکھا رہا ہے۔ اور اپنے جلووں سے ہمارے دل کو گرما رہا ہے تو ہمیں اپنی آنکھوں پر پٹی نہیں باندھنی چاہیئے۔ یہ شعر اُن شعروں میں سے جو غالبؔ کی حق کی گفتگو سے بڑے لطیف انداز میں کہا گیا ہے۔

دشنۂ غمزہ جاں ستاں، ناوکِ ناز بے پناہ
تیرا ہی عکسِ رُخ سہی، سامنے تیرے آئے کیوں؟

فرماتے ہیں ۔ جبکہ صورتِ حال یہ ہے کہ تیرے غمزہ کا خنجر جاں ہلاک کرنے والا اور تیرے تیرِ ناز بے پناہ ہیں تو تیرے روبرو تیرے سامنے بتا کون آسکتا ہے۔ جو آئے گا وہ سلامت کیسے رہ سکتا ہے ۔
مطلب یہ ہے کہ شاہدِ مطلق کا جمال و حسن ایسا ہے کہ وہ ہستیاں جنہوں نے اس کے جمال سے اکتساب بھی کیا ہے اور اُس کے نور سے حصّہ بھی پایا ہے۔ وہ بھی اُس کے رُوبرو یا آ.منے سامنے نہیں ہو سکتے۔ اسی وجہ سے حضرت جبرائیل علیہ السلام شبِ معراج میں آگے چلنے سے معذوری کا اظہار کرتے ہیں اور ہمارے آقا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے جب اُم المومنین حضرت عائشہؓ نے پوچھا یا رسولؐ اللہ شبِ معراج میں آپ نے اللہ تعالیٰ کو دیکھا۔ تو ارشاد ہوا کہ عائشہ وہ تو نور ہی نور ہے اُسے حقیقی طور پر کب کوئی دیکھ سکتا ہے ۔

قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں؟

فرماتے ہیں ۔ قیدِ حیات اور بندِ غم ایک ہی چیز کے دو نام ہیں جب تک غم ہے زندگی ہے اور جب تک زندگی ہے غم ضرور ہے۔ تو پھر یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ انسان موت سے پہلے غم سے نجات حاصل کر لے یہ جامِ ہلاکو تھام ے آبِ حیات ہے ہی ! پیتا نہیں جو یہ شراب رہ نجات پائے کیوں (شارح)

حُسن اور اس پہ حُسنِ ظن ، رہ گئی بوالہوس کی شرم

اپنے پہ اعتماد ہے غیر کو آزمائے کیوں ؟

فرماتے ہیں ۔ اللہ تعالیٰ سے حُسن ملا تو اُس نے حسنِ ظن بھی عطا کیا ہے۔ لہٰذا جانتے ہیں ہمیں کوئی دیکھے گا تو ضرور اپنا دل ہمارے حوالے کر دے گا ۔ اعتماد حاصل ہے تو پھر بوالہوس کو آزمانے کی ضرورت نہ رہی) اور اس وجہ سے بوالہوس کی لاج قائم رہی اور اُس کے عشق و ہوس کا بھانڈا نہیں پھوٹا ۔

واں وہ غرورِ عزّ و ناز ، یاں یہ حجاب پاسِ وضع

راہ میں ہم ملیں کہاں ؟ بزم میں وہ بلائے کیوں ؟

فرماتے ہیں ۔ ہمیں پاسِ وضع داری ہے ہم راستہ میں محبوب سے ملتے ہوئے شرماتے ہیں اور ادھر اُن کو غرورِ عزّ و ناز ہے کہ ہم اس دیوانہ کو اپنی بزم میں کیوں بلائیں ۔ اس میں ہماری کسرِ شان ہے ۔ ہمارا اُن سے ملنا ان حالات میں ناممکن ہے ۔

غالبِ خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں

روئیے زار زار کیا ؟ کیجئے ہائے ہائے کیوں ؟

فرماتے ہیں ۔ مرزا غالب اپنی وفات و توقع میں آجانے کے بعد اپنے دوست احباب کو صبر کی تلقین دلاتے ہیں کہ غالبِ خستہ کے بغیر دنیا کا کوئی کام بند نہیں ہو گا ۔ لہٰذا کوئی واویلا کرنے کی حاجت نہیں ۔

ہاں وہ نہیں خدا پرست، جاؤ وہ بے وفا سہی

جس کو ہوں دین و دل عزیز اُس کی گلی میں جائے کیوں؟

فرماتے ہیں۔ غالب ان لوگوں کو جو دنیاوی حسینوں کی طرف مائل ہیں مخاطب کر کے کہتے ہیں کہ جب وہ بے وفا محبوب وفا پرست نہیں تو تم اُن کی گلی میں جاتے ہی کیوں ہو۔

غزل ۱۱۴

غنچۂ ناشگفتہ کو دُور سے مت دکھا، کہ یُوں

بوسہ کو پوچھتا ہُوں میں، مُنہ سے مجھے بتا کہ یُوں

فرماتے ہیں۔ میں نے دریافت کیا کہ بوسہ کس طرح لیا جاتا ہے تو اس نے اپنا غنچۂ ناشگفتہ یعنی مُنہ مجھے دُور سے دکھا دیا۔ اس پر میں نے کہا کہ مجھے بوسے کر بتا مجھے دُور سے اپنا منہ نہ دکھا۔

پرسشِ طرزِ دلبری کیجئے کیا، کہ بن کہے

اُس کے ہر اِک اشارے سے نکلے ہے یہ ادا کہ یُوں

فرماتے ہیں۔ کیا ضرورت ہے کہ اُس سے پوچھا جائے کہ دل چھین لینے کے کیا کیا طریق ہیں۔ اس کی تمام حرکات و سکنات، یہ اشارے یہ ادائیں زبانِ حال سے دلبری کا فرض ادا کر رہی ہیں۔

رات کے وقت مے پیئے ساتھ رقیب کو لئے

آئے وہ یاں خدا کرے پر نہ کرے خدا کہ یُوں

فرماتے ہیں ۔ ہماری دلی آرزو ہے کہ وہ ہمارے گھر تشریف لائے ۔ خدا ایسا کرے ۔ مگر خدا نہ کرے کہ وہ رات کے وقت نشہ میں دُھت اور پھر اپنی حفاظت کی غرض سے رقیب کو ساتھ لے کر آئے ۔ یہ دونوں باتیں ہمارے لئے ناقابل برداشت ہیں ۔

"غیر سے رات کیا بنی" یہ جو کہا تو دیکھئے

سامنے آن بیٹھنا ، اور یہ دیکھنا کہ یوں

فرماتے ہیں ۔ میں نے اُس سے یہ پوچھا کہ غیر کے ساتھ رات کیا معاملہ گزرا ۔ اس کے جواب میں وہ میرے سامنے آبیٹھا کہ یہ بنی ۔ یعنی میں آ ۔ ن کے ، برو بیٹھا اور وہ میرا منہ تکتا رہا ۔

بزم میں اُس کے روبرو کیوں نہ خموش بیٹھئے

اُس کی تو خامشی میں بھی ہے یہی مدعا کہ یوں

فرماتے ہیں ۔ کیسے ممکن ہے کہ اُن کی بزم میں خاموش باادب نہ بیٹھا جائے جبکہ اُن کے خود خاموش بیٹھنے میں بھی یہی مدعا ہے کہ تم بھی خاموش رہو ۔ کیونکہ پاسِ ادب اور مہر و محبت کا بھی یہی تقاضا ہے ۔

مَیں نے کہا کہ "بزمِ ناز چاہیئے غیر سے تہی"

سُن کے ستم ظریف نے مجھ کو اُٹھا دیا کہ یوں

معنی ۔ ستم ظریف ۔ جس کے ستم میں ظرافت پائی جائے ۔

فرماتے ہیں ۔ میں نے رقیب کو بزمِ ناز میں دیکھ کر محبوب سے کہا کہ یہ بزمِ ناز غیر سے خالی ہونی چاہیے تو اس ستم ظریف نے مجھے ہی اٹھا کر کہا کہ تم ٹھیک کہتے ہو ۔

مجھ سے کہا جو یار نے جاتے ہیں ہوش کس طرح

دیکھ کے میری بے خودی چلنے لگی ہوا کہ یوں

فرماتے ہیں ۔یار نے مجھ سے دریافت کیا کہ ہوش و حواس کس طرح چلے جاتے ہیں تو میری بیخودی کو دیکھ کر ہوا خوب چلنے لگی مطلب یہ ہے کہ بعض دفعہ قدرتی طور پر الٰہی مدد حاصل ہو جاتی ہے اور تمام کام خود ہی بننے لگتے ہیں اور زمانہ سازگار ہونے لگتا ہے

کب مجھے کوئے یار میں رہنے کی وضع یاد تھی

آئنہ دار بن گئی حیرتِ نقش پا کہ یوں

فرماتے ہیں ۔ مجھے کوئے یار میں رہنے کا طور طریق کب آتا تھا۔اُس کے نقشِ پا نے مجھے سکھا دیا کہ خاک میں میری طرح ملو اور جلوہُ یار سے حیرت زدہ ہو کر رہنے کا سلیقہ سیکھو ۔

گر ترے دل میں ہو خیال، وصل میں شوق کا زوال

موجِ محیط آب میں مارے ہے دست و پا کہ یوں

فرماتے ہیں ۔ اگر یہ خیال تیرے دل میں پیدا ہو کہ وصل میں کوئی زوال پیدا ہو سکتا ہے تو تُو موجِ محیط کو دیکھ کہ وہ کس طرح دست و پا مار کر ساتھ ساتھ رہتی ہے اور کبھی ساتھ نہیں چھوڑتی اور نہ ان کے اتحاد میں کوئی کمی واقع ہوتی ہے مطلب یہ ہے کہ کامیابی کو بھی قائم رکھنے کیلئے جد و جہد کرتے رہنا چاہیئے ۔

جو یہ کہے کہ ریختہ کیوں کہ ہو رشکِ فارسی

گفتۂ غالب ایک بار پڑھ کے اُسے سُنا کہ یوں

معنی ۔ ریختہ = اُردو

فرماتے ہیں، اگر کوئی تجھ سے کہے کہ اردو شاعری تو ایک نوزائیدہ ہے وہ رشکِ فارسی کس طرح ہوسکتی ہے تو تو اسے ایک بار غالب کے اُردو اشعار پڑھ کر سنا تا کہ وہ آئندہ اردو کی کم مائیگی کا طعنہ نہ دے سکے یہ۔ اُردو ہے جس کا نام ہمیں جانتے ہیں داغؔ ؛ سارے جہاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے (داغ)

غزل ۱۱۵

حسد سے دل اگر افسردہ ہے، گرمِ تماشا ہو　　　کہ چشمِ تنگ شاید کثرتِ نظارہ سے وا ہو

فرماتے ہیں۔ کہ اگر تو حسد کرتا ہے اور لوگوں کی ترقی اور خوشحالی تیرے دل کو افسردہ کرتی ہے تو اس کا علاج یہ ہے کہ گرمِ تماشا ہوجا۔ اپنے تنگ دائرے یا حلقے سے باہر نکل کر دیکھ کہ لوگ اپنی ترقی اور خوشحالی کے لئے کس قدر جد و جہد کرتے ہیں۔ پھر تو خود ہی انصاف سے کہے گا کہ ان لوگوں نے اگر ترقی کی ہے تو پھر اس کے لئے کام بھی کیا ہے اور اس طرح تیری چشمِ تنگ کھل جائے گی اور تو خود بھی ترقی کی راہ پر گامزن ہوگا اور حسد کرنا چھوڑ دے گا۔

بہ قدرِ حسرتِ دل چاہیئے ذوقِ معاصی بھی　　　بھروں یک گوشۂ دامن اگر آبِ ہفت دریا ہو

فرماتے ہیں، گناہ کا شوق حسرتِ دل کے مطابق ہونا چاہیئے میں اپنے دامن کا ایک گوشہ تر کروں اگر سات دریاؤں کا پانی ملے۔ کثرتِ معاصی کا استعارہ ہفت دریا سے لیا ہے مطلب یہ ہے کہ گناہ کر لینے کے بعد بھی حسرت باقی رہتی ہے جس طرح مال و دولت سے انسان کا پیٹ نہیں بھرتا یہی حال گنہگاروں کا ہے کہ ایک گناہ کرنے پر لذتِ گناہ دوسرا گناہ کرنے پر اکساتی ہے اور یہ سلسلہ کہیں جاکر ختم نہیں ہوتا۔

اگر وہ سروِ قد گرمِ خرامِ ناز آجائے　　　کفِ ہر خاکِ گلشن شکلِ قمری نالہ فرسا ہو

فرماتے ہیں۔ اگر وہ سرو قد اپنے خرامِ ناز کے ساتھ گلشن کی سیر کو آجائے تو گلشن کی مٹی قمری بن

کہ اُس سے نالہ و فریاد کرنے لگے مطلب یہ ہے کہ اس سے شکوہ گلہ کرے کہ ہمیں کیوں اپنے جلوے سے محروم کر رکھا ہے ۔

غزل ۱۱۶

کعبے میں جا رہا تو نہ دو طعنہ کیا کہیں
بھولا ہوں حقِ صُحبتِ اہلِ کنشت کو ؟

فرماتے ہیں ۔ اگر میں ہندوستان سے جا کر کعبے میں رہنے لگوں تو مجھے طعنہ دینے کی ضرورت نہیں میں بتکدے کی صحبت کو بھلانے والا نہیں صنم کدوں سے میرا تعلق ذہنی طور پر تو رہے گا ۔

طاعت میں تا رہے نہ مے و انگبیں کی لاگ
دوزخ میں ڈال دو کوئی لے کر بہشت کو

معنی ۔ انگبیں ۔ شہد

فرماتے ہیں ۔ جو لوگ عبادت محض بہشت میں شراب اور شہد کی نہروں کی خاطر کرتے ہیں وہ کوئی نیکی کا کام نہیں کرتے ۔ وہ بھی کوئی عبادت ہے جو لالچ کی غرض سے کی جائے ۔ اگر بہشت کو دوزخ میں ڈال دیا جائے تو میری عبادت ۔ سے مے و انگبیں کا کوئی واسطہ نہ رہے ۔ اور میری عبادت خالصۃً لِلّٰہ ہو جائے ۔ ایسا ہی حضرت رابعہ بصری کا قول ہے کہ "اللہ تعالیٰ اگر میں نے تیری عبادت جنّت کی خاطر کی ہے تو پھر تو مجھے جنّت میں نہیں دوزخ میں ڈال ۔ اور اگر میں نے صرف تری محبّت میں کی ہے تو تو ہی میری جزا ہے کچھ اور نہیں ۔

تجھ کو ہی مانگتا ہوں میں تجھ سے ؛ اِس سے بہتر تری عطا کیا ہے (شارح)

ہوں منحرف نہ کیوں رہ و رسم ثواب سے

ٹیڑھا لگا ہے قط قلم سرنوشت کو

فرماتے ہیں میرے راہ و رسم ثواب سے برگشتہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ جس قلم سے کاتب تقدیر نے میری نوشتۂ تقدیر لکھا اُس کا سرا ٹیڑھا کٹا ہوا تھا۔ لہٰذا میری سرنوشت میں بھی کجی پیدا ہو گئی۔

آئی اگر بلا تو جگر سے ٹلی نہیں

ایرا ہی دے کے ہم نے بچایا ہے کشت کو

معنی۔ ایرا۔ اروپ شطرنج کا ایک مہرہ جو بادشاہ کو شکست یعنی مات سے بچانے کے لئے استعمال میں لایا جاتا ہے۔ کشت بادشاہ کا محفوظ خانہ میں ہونا ؟

فرماتے ہیں۔ ابھی بلا ٹلی نہیں جگر کے لئے بے حد خطرہ لاحق ہے فی الحال ایرا بیچ میں ڈال دیا ہے تاکشت قائم رہے۔

غالبؔ کچھ اپنی سعی سے ملتا نہیں مجھے

خرمن جلے اگر نہ ملخ کھائے کشت کو

معنی۔ ملخ۔ ٹڈیاں جو فصلیں کھا جاتی ہیں۔ کشت۔ کھیتی مزارعت۔

فرماتے ہیں۔ اے غالبؔ مجھے محض اپنی کوششوں سے کچھ نہیں ملتا۔ اگر میری کھیتی کو ٹڈیاں نہ کھائیں تو خرمن میں آگ لگ جاتی ہے۔

مطلب یہ ہے کہ انسان صرف اپنی ہی کوششوں سے کامیاب نہیں ہوتا جب تک کہ فضلِ الٰہی شاملِ حال نہ ہو۔

تھا اہلِ کرم وہ مرا ساقی ازل ✦ شکر و ہا پاس اُس کا میں کرتا چلا گیا (بشارت)

غزل ۱۱۷

دارستہ اس سے ہیں کہ محبّت ہی کیوں نہ ہو

کیجئے ہمارے ساتھ عداوت ہی کیوں نہ ہو

فرماتے ہیں ۔ ہم اس خیال سے آزاد ہیں کہ آپ ہم سے محبّت کا ہی سلوک کریں ۔ اگر آپ محبّت کرنا نہیں چاہتے نہ سہی عداوت یعنی دشمنی ہی کرو مگر بغیر شرکتِ غیر کے جو کچھ ہمارے ساتھ ہو وہ معاملہ کسی اور کے ساتھ نہ ہو ۔

چھوڑا نہ مجھ میں ضعف نے رنگ اختلاط کا

ہے دل پہ بارِ نقشِ محبت ہی کیوں نہ ہو

فرماتے ہیں ضعف نے خونِ جگر سارا تمام کر دیا ہے ایک قطرۂ خون بھی جسم میں باقی نہ رہا یہی وجہ ہے جو کچھ رنگِ اختلاط تھا سب جاتا رہا ۔ اب تو حالت یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ نقشِ محبت بھی دل پہ بار ہے ۔

ہے مجھ کو تجھ سے تذکرۂ غیر کا گلہ

ہر چند بر سبیلِ شکایت ہی کیوں نہ ہو

فرماتے ہیں ۔ مجھے تم سے غیر کے ذکر کی شکایت ہے باوجودیکہ تم نے اُس کی شکایت کی ہے مگر میں تو چاہتا ہوں کہ غیر کا نام تک تمہارے ہونٹوں پہ نہ آئے ۔ میرے لئے غیر کا نام سُننا اور وہ بھی تمہاری زبان سے ناقابلِ برداشت ہے ۔

پیدا ہوئی ہے۔ مَے کہتے ہیں "ھــــر درد کی دوا"

یُوں ہو تو چارۂ غمِ الفت ہی کیوں نہ ہو؟

فرماتے ہیں۔ لوگ کہتے ہیں کہ ہر درد کی دوا ہے۔ ہر مرض کا علاج ہے۔ اگر ایسا ہے تو غمِ الفت کا بیمار کیوں اچھا نہیں ہوتا۔ (بیمارِ عشق تو اچھا ہونا چاہتا ہی نہیں قبلہ غالب)

ڈالا نہ بے کسی نے کسی سے معاملہ

اپنے سے کھینچتا ہوں خجالت ہی کیوں نہ ہو؟

فرماتے ہیں۔ خدا کا شکر میری بے کسی نے میرا معاملہ کسی کے ساتھ نہیں ڈالا۔ اور میں اتنا مجبور نہ ہوا کہ غیر سے مدد چاہوں۔ اگر مجھے ان سے کوئی فائدہ بھی نہ پہنچتا پھر بھی شرمندگی تو ضرور ہوتی اور میری گردن بارِ احسان سے جُھکی رہتی میں اگر شرمندہ بھی ہوں تو صرف اپنی ذات سے۔

ہے آدمی بجائے خود اک محشرِ خیال

ہم انجمن سمجھتے ہیں خلوت ہی کیوں نہ ہو

فرماتے ہیں۔ انسان کو اللہ تعالیٰ نے بڑی قوت بخشی ہے کہ وہ خلوت میں اپنے لئے انجمن بنا لیتا ہے اور جلوت میں اپنے لئے خلوت کے سامان پیدا کر لیتا ہے۔ خیالات اور تصورات کی کمی نہیں ہے بلکہ انسان محشرِ خیال پیدا کیا گیا ہے۔ ہاں بکلی خیالات سے رہائی پانا یعنی تخلیۂ نفس پا کر صرف یادِ الہٰی ذکرِ الہٰی میں مشغول ہونا بے حد دشوار ہے۔ مگر ناممکن نہیں۔

ہنگامۂ زبونیٔ ہمت ہے انفعال

حاصل نہ کیجیے دہر سے عبرت ہی کیوں نہ ہو

فرماتے ہیں۔ کسی سے کچھ لینا باعثِ شرمندگی اور کم ہمتی کی دلیل ہے۔ جو کچھ کرنا ہے خود کرو۔ یہاں تک کہ عبرت بھی زمانہ سے نہ لو۔ جیسا کہ ایک جگہ فرماتے ہیں ؎

اپنی ہستی سے ہو جو کچھ ہو ⁂ آگہی گر نہیں غفلت ہی سہی

وارستگی بہانۂ بیگانگی نہیں

اپنے سے کر نہ غیر سے وحشت ہی کیوں نہ ہو

فرماتے ہیں۔ وارستگی وآزادی کا یہ مطلب نہیں ہے کہ انسان وحشت اور بے پروائی کا سلوک دوسروں سے کرے اور نہ یہ خیال کرے کہ ہم دوسروں سے بہتر ہیں بلکہ بیگانگی اور وحشت کا عمل اپنے نفس سے کیا جائے۔ دوسروں کے حقوق تلف نہ کرے۔ اگر اپنے نفس کے تمام حقوق پورے نہ ہو سکیں تو مضائقہ نہیں۔

مٹتا ہے فوتِ فرصتِ ہستی کا غم کوئی

عمرِ عزیز صرفِ عبادت ہی کیوں نہ ہو

فرماتے ہیں۔ زندگی یعنی فرصتِ ہستی وہ شے ہے جس کا غم کبھی نہیں جاتا چاہے کسی نے اپنی ساری عمر عبادت میں ہی کیوں نہ گزاری ہو۔ جو کہ مقصدِ حیات و پیدائش بھی ہے۔ پھر بھی اس دُنیا سے رخصت ہوتے وقت قلق ضرور ہوگا۔ حضرت قبلہ حافظ مختار احمد شاہ جہانپوری نے بہت لمبی عمر پائی کم وبیش ایک سو پندرہ سال اور تمام عمر تقویٰ وطہارت اور گوشہ نشینی میں گزاری۔ آپ فرمایا کرتے تھے کہ یہ شعر غالب صاحب نے ہمارے لئے کہا ہے۔

اُس فتنہ خو کے در سے اب اٹھتے نہیں اسد

اس میں ہمارے سر پہ قیامت ہی کیوں نہ ہو

فرماتے ہیں۔ اے اسد ہم تو اس فتنہ خو کے در سے کبھی نہیں اُٹھیں گے۔ بلا سے سر پہ قیامت ہی کیوں نہ گذر جائے۔ اللہ اللہ کیا ثباتِ قدم ہے۔

غزل ۱۱۸

قفس میں ہوں، گر اچھا بھی نہ جانیں میرے شیون کو
مرا ہونا بُرا کیا ہے نوا سنجانِ گُلشن کو

فرماتے ہیں۔ میں دنیا کے رنج و آلام میں گرفتار ہوں۔ مجھے سرگرم نالہ و فریاد دیکھ کر بُرا نہ مانو۔ اور نہ ہی تحقیر کی نظر سے مجھے دیکھو۔ دوست احباب اگر رنج و غم سے محفوظ ہیں تو ان پر فضلِ الٰہی ہے جس کا شکر ادا کرنا ان پر لازم ہے۔

نہیں گر ہمدمی آساں نہ ہو۔ یہ رشک کیا کم ہے
نہ دی ہوتی خدایا آرزوئے دوست دشمن کو

فرماتے ہیں۔ یہ تو ظاہر ہے کہ دشمن میرے جیسا جوشِ عشق نہیں رکھتا اور نہ وہ اس راہ میں میرا ہمدم بن سکتا ہے مگر اے خدا مجھے تو یہ رشک بھی کھائے جاتا ہے کہ دشمن کو تو نے "آرزوئے دوست" بھی کیوں دی۔ دوسرے معنی یہ بھی ہیں کہ دشمن دوست کا ہمدم تو نہیں ہو سکتا اور یہ بات بہت مشکل ہے مگر میرے لئے تو یہ ہی بڑی رشک کی بات ہے کہ وہ دل میں آرزوئے دوست رکھتا ہے۔

نہ نکلا آنکھ سے تیری اِک آنسو، اُس جراحت پر
کیا سینے میں جس نے خونچکاں مژگانِ سوزن کو

فرماتے ہیں۔ میرے اُن زخموں کا حال سُن کر جن کے سبب سے مژگانِ سوزن سے بھی خون ٹپک پڑا۔ تیری آنکھ سے ایک آنسو بھی نہ نکلا۔ دوست احباب اقربا اور محبوب کی سنگدلی کی تصویر کھینچی ہے۔

خدا شرمائے ہاتھوں کو کہ رکھتے ہیں کشاکش میں
کبھی میرے گریباں کو کبھی جاناں کے دامن کو

فرماتے ہیں۔ خدا میرے ہاتھوں کو شرمائے کہ یہ ہاتھ کبھی جاناں کا دامن پکڑتے ہیں جس سے مجھے شرمندگی کا احساس ہوتا ہے اور کبھی خود میرا گریبان پھاڑ ڈالتے ہیں۔ مرزا صاحب نے اپنے جنونِ وحشت کا الزام اپنے ہاتھوں پر لگا دیا ہے۔ کیا خوب شعر ہے۔

ابھی ہم قتل گہ کا دیکھنا آساں سمجھتے ہیں
نہیں دیکھا شناور جوئے خوں میں تیرے توسن کو

فرماتے ہیں۔ ابھی تک ہم قتل گاہ کا تماشا دیکھنا آسان سمجھتے ہیں کیونکہ ہم نے تیرے گھوڑے کو خون کے دریا میں تیرتا ہوا نہیں دیکھا۔ مطلب یہ ہے کہ ابتدا میں عشق آسان معلوم ہوتا ہے اور دل جوشِ عشق میں سرپٹ دوڑنا چاہتا ہے۔ مگر جب یہی عشق خون کے دریا میں شناوری کرے گا تو عاشق کو موت کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اس کے برعکس فارسی کا ایک حقیقت افروز شعر ہے ؎

عشق اوّل قاتل و خونی بود
تا گریزد ہر کہ بیرونی بود

ہُوا چرچا جو میرے پاؤں کی زنجیر بننے کا
کیا بیتاب کاں میں جنبشِ جوہر نے آہن کو

فرماتے ہیں۔ میری دیوانگی حد سے جب بڑھ گئی اور میرے پاؤں میں زنجیر ڈالنے کی تدبیریں کی جانے لگیں تو جوہرِ آہن بھی کان میں بیتاب ہوگیا کہ میں جلد سے جلد اس عظیم عاشق کے یعنی دیوانے کی پیر کی زنجیر بن جاؤں۔ مطلب یہ ہے کہ میری دیوانگی کا رتبہ بہت بڑا ہے اور اس کیلئے قدرت نے پہلے ہی سے انتظام کر رکھے ہیں۔ عاشق صادق سے ہر شے وابستہ ہونا چاہتی ہے یہی مطلب زمین و آسمان کو انسان کیلئے مسخر کرنے کا ہے

خوشی کیا کھیت پر میرے اگر سو بار ابر آوے
سمجھتا ہوں کہ ڈھونڈے ہے ابھی سے برق خرمن کو

فرماتے ہیں۔ میرے کھیت پر بادلوں کا بار بار آنا میرے لئے موجبِ مسرت نہیں ہے بلکہ میں یہ خیال کرتا ہوں کہ خرمن جمع ہونے سے پہلے ہی برق میری کھیتی کو جلانے کا فیصلہ کر چکی ہے مطلب یہ ہے کہ میں ایسا بدقسمت شخص ہوں کہ میری ساری کوششیں بیکار جاتی ہیں اور ہر کوشش کا انجام ناکامی ہوتا ہے۔

وفاداری بہ شرطِ استواری اصل ایماں ہے
مرے بُت خانہ میں، تو کعبہ میں گاڑو برہمن کو

فرماتے ہیں۔ اگر برہمن ساری عمر بُت خانہ میں بُت پرستی کرتا ہوا اور حقِ وفاداری پوری طرح نبھاتا ہوا مر جائے تو اُس کی وفاداری کے صلہ میں اگر کعبہ میں دفنایا جائے تو وہ اس کا مستحق ٹھہرتا ہے جزا سزا کا انحصار وفاداری، ثباتِ قدم، اطاعت اور خدا کی دی ہوئی سمجھ کے مطابق ہے۔ اگر اخلاص اور نیک نیتی کسی نے اپنی سمجھ کے مطابق کام کیا تو اس کا اجر اللہ تعالےٰ کے پاس ہے۔

شہادت تھی مری قسمت میں جو دی تھی یہ خُو مجھ کو
جہاں تلوار کو دیکھا، جھکا دیتا تھا گردن کو

فرماتے ہیں۔ میری قسمت میں کاتبِ تقدیر نے شہادت لکھ دی تھی تبھی تو مجھ کو گردن جھکا دینے والی خو ملی تھی میں جب کبھی اور جہاں کہیں تلوار دیکھتا تھا وہیں سر کو جھکا دیتا تھا۔ مطلب یہ ہے کہ میں سچ کو دیکھتے ہی پہچان لیتا تھا۔ صدق کی تلوار کے آگے سرِ تسلیم خم کرنا میری فطرت تھی۔

نہ لُٹتا دن کو تو کب رات کو یُوں بے خبر سوتا
رہا کھٹکا نہ چوری کا، دُعا دیتا ہوں رہزن کو

فرماتے ہیں۔ انسان سکونِ قلب، اسی صورت میں حاصل کر سکتا ہے جب وہ عیش و طرب کو چھوڑ کر محنت و مشقت صبر و قناعت پیدا کرے۔ اور راضی بہ رضا ہو جائے۔ قارئین کی لطف اندوزی کیلئے جناب نظیر اکبرآبادی کا واقعہ

پیش خدمت ہے کہتے ہیں کہ نواب واجد علی شاہ نے پانچ ہزار روپے تحفتاً قاصد کو دے کر بھیجا اور اپنے دربار میں بلایا۔ نظیر صاحب نے روپیہ لے کر قاصد سے کہا کہ تمہارے شاہ کی دعوت کا جواب ہم کل صبح دیں گے۔ چوری کے دھڑکے سے تمام رات آنکھوں ہی آنکھوں میں کاٹی ایک پل نہ سو سکے۔ طرح طرح کے خیالات اور وہمات کا شکار رہے۔ صبح کو قاصد آیا تو وہ پانچ ہزار روپیہ اس کے حوالہ کیا اور فرمایا کہ بھائی یہ دولت تو ایک مصیبت ہے ہم چوری کے ڈر سے تمام رات نہ سو سکے۔ ایسی تونگری سے فقیری بھلی۔ آرام سے پیر پھیلا کر سوتا ہوں اور اللہ کا شکر بجا لاتا ہوں۔

سخن کیا کہہ نہیں سکتے کہ جویا ہوں جواہر کے

جگر کیا ہم نہیں رکھتے کہ کھودیں جا کے معدن کو

فرماتے ہیں۔ جگر کاوی کر کے اچھے شعر کہنا معدن کو کھود کر جواہر نکالنے سے بدرجہا بہتر ہے لہٰذا ہم نے سخن سنجی کو جواہرات پر ترجیح دے رکھی ہے۔

مرے شاہِ سُلیماں جاہ سے نسبت نہیں غالبؔ

فریدون و جم و کیخسرو و داراب و بہمن کو

غالبؔ کا مُدعا بادشاہ ظفر کو شاہ سلیمان جاہ کہنے سے یہ ہے کہ سلیمانؑ مومن تھے جبکہ دیگر مشاہیر عالم جس کا ذکر مصرعہ ثانی میں کیا گیا ہے وہ سب کافر تھے لہٰذا وجہ فوقیت ظاہر ہے۔

غزل ۱۱۹

دھوتا ہوں جب میں پینے کو اس سیم تن کے پاؤں

رکھتا ہے ضد سے کھینچ کے باہر لگن کے پانو

معنی (پانو دھو کر پینا) جوشِ محبت میں

فرماتے ہیں کہ میں جب بھی اس سیم تن کے پانو دھو کر پینا چاہتا ہوں، وہ اپنے پانو شوخی سے لگن کے باہر نکال لیتا ہے۔

دی سادگی سے جان ۔ پڑوں کوہکن کے پانو

ہیہات کیوں نہ ٹوٹ گئے پیرزن کے پانو

فرماتے ہیں ۔ فرہاد نے ایک عیار عورت کے فریب میں آکر جان دے دی ۔ مرزا صاحب کوہکن کی اس سادگی کا اظہار اس طرح کرتے ہیں جو اُن کے ایک مصرعہ سے بھی عیاں ہے ۔ فرماتے ہیں ۔

اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا!

بھاگے تھے ہم بہت ، سو اسی کی سزا ہے یہ

ہو کر اسیر دابتے ہیں راہ زن کے پانو

فرماتے ہیں ۔ کہ راہزن سے بچنے کے لیے بھاگ جانا چاہا لیکن اس نے ہم کو پکڑ لیا اور اپنی خدمت پر لگا دیا ۔ اے کاش کہ ہم نے ایسا نہ کیا ہوتا تو اس ذلت سے محفوظ رہتے ۔ مطلب یہ ہے کہ تقدیر الٰہی سے فرار نہیں ۔ چاہے کتنی ہی کوشش کوئی کیوں نہ کرے ۔

مرہم کی جستجو میں پھرا ہوں جو دُور دُور

تن سے سوا فگار ہیں اس خستہ تن کے پانو

فرماتے ہیں ۔ کہ اپنے تن کے زخموں کے اندمال کے لئے مرہموں کی تلاش میں ہمیں دوسری مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا یہاں تک کہ تن کے زخموں سے کہیں زیادہ پیر زخمی ہو گئے ۔

اللہ رے ذوقِ دشت نوردی کہ بعد مرگ،

ہلتے ہیں خود بخود مرے اندر کفن کے پانو

فرماتے ہیں ۔ شوقِ صحرا نوردی مرنے کے بعد بھی قائم رہا جس کا ثبوت یہ ہے کہ مرنے کے بعد بھی میرے پاؤں کفن کے اندر حرکت کر رہے ہیں ۔ مطلب یہ ہے کہ اخروی زندگی میں بھی میرا ذوق و شوق کم نہ ہوگا ۔

ہے جوشِ گُل بہار میں یاں تک کہ ہر طرف

اُڑتے ہوئے اُلجھتے ہیں، مرغ چمن کے پانْو

فرماتے ہیں۔ اس دفعہ چمن میں ایسی بہار آئی ہے اور درختوں نے ایسی نشوونما پائی ہے کہ چمن کے پرندوں کے پاؤں لمبی لمبی شاخوں میں اُلجھ کر رہ جاتے ہیں۔

شب کو کسی کے خواب میں آیا نہ ہو کہیں

دُکھتے ہیں آج اُس بتِ نازک بدن کے پانْو

فرماتے ہیں۔ آج اُس نازک بدن کے پاؤں کیوں دُکھتے ہیں شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ وہ کسی جلنے والے کے پاس خواب میں جا کر لوٹا ہے۔

غالبؔ مرے کلام میں کیوں کر مزا نہ ہو

پیتا ہوں دھو کے خسروِ شیریں سخن کے پانْو

فرماتے ہیں۔ کہ میرے کلام میں جو شیرینی نظر آتی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ میں خسروِ شیریں سخن یعنی بہادر شاہ ظفر کے پاؤں دھو دھو کر پیتا ہوں۔

حُسن و خوبی یہ ہے ناصرؔ آپ کے اشعار میں
رنگ غالبؔ کا ہے ان میں کیف کچھ کچھ میرؔ کا
(شارح)

غزل ۱۲۰

واں اُس کو ہولِ دل ہے تو یاں میں ہوں شرمسار

یعنی یہ میری آہ کی تاثیر سے نہ ہو

فرماتے ہیں ۔ جوشِ محبت میں عاشق اپنے محبوب کے ہر دُکھ اور تکلیف کی ذمہ داری اپنے اُوپر ڈالتا ہے اور کہتا ہے کہ محبوب کو جو ہولِ دل کی تکلیف ہے وہ کہیں میری آہوں کے اثر ہونے کے نتیجہ میں تو نہیں ہے وہ اس خیال سے دل ہی دل میں شرمندگی محسوس کر رہا ہے ۔

اپنے کو دیکھتا نہیں ذوقِ ستم تو دیکھ

آئینہ تاکہ دیدۂ نخچیر سے نہ ہو

فرماتے ہیں ۔ میرے معشوق کا ذوقِ ستم دیکھنے کے قابل ہے وہ اپنی صورت بھی آئینہ میں نہیں دیکھتا جب تک آئینہ مقتول کی آنکھ کا نہ ہو ۔

مطلب یہ ہے کہ محبوب میں ذوقِ ظلم و ستم حیرت انگیز طور پر بڑھ گیا ہے اور وہ اپنے ہر مقتول کی آنکھ میں اپنی تصویر دیکھنا پسند کرتا ہے اُسے کسی دوسرے آئینے کی حاجت نہیں ۔

نوٹ : مشہور ہے کہ مقتول کی آنکھوں میں قاتل کی تصویر اُتر آتی ہے

اب تلک آئینہ شاید آپ نے دیکھا نہیں

آپ جو کہتے ہیں ہم رکھتے نہیں اپنا جواب

(عارف)

غزل ۱۲۱

واں پہنچ کر جو غش آتا پئے ہم ہے ہم کو

صد رہ آہنگِ زمیں بوسِ قدم ہے ہم کو

فرماتے ہیں۔ ہماری کمزوری و ناتوانی کا یہ عالم ہے کہ کوچہ یار میں پہنچتے ہی ہمارے پیر جواب دے جاتے ہیں۔ اور یہ ہمارے پیروں کا ہم پر احسان ہے لہٰذا ہم اپنے قدم چومنے کے لئے زمین پر گر پڑتے ہیں جہاں ہمارا نقشِ قدم ہے۔

دِل کو میں، اور مجھے دل محوِ وفا رکھتا ہے

کس قدر ذوقِ گرفتاریٔ ہم ہے ہم کو

فرماتے ہیں ۔ دل کو میں اور مجھے دل محوِ وفا رکھتا ہے۔ اس طرح ہم دونوں ایک دوسرے کو قید رکھتے ہیں مطلب یہ ہے کہ دل اور زبان و عمل کی ایک ہی حالت ہے منافقت نہیں ہے۔

ضُعف سے نقشِ پئے مور ہے طوقِ گردن

تیرے کوچے سے کہاں طاقتِ رَم ہے ہم کو!

فرماتے ہیں۔ ضعف ناتوانی کی وجہ سے چیونٹی کا قدم بھی ہمارے لئے طوقِ گردن ہے۔ ہم اتنے بھاری بوجھ کو اٹھا کر تیرے کوچے سے کیسے بھاگ سکتے ہیں۔

مطلب یہ ہے کہ انسان باوجود سب کچھ ہونے کے پھر بھی چیونٹی کی طرح مجبور ہے۔ ہر قدم پر مشیتِ ایزدی ہے جو چاہتی ہے کرتی ہے۔ انسان کو طاقت نہیں کہ ان زنجیروں کو توڑ سکے۔

جان کر کیجے تغافل کہ کچھ امید بھی ہو

یہ نگاہِ غلط انداز تو سم ہے ہم کو

فرماتے ہیں۔ سوچ سمجھ کر ارادہ کر کے ہم سے چشم پوشی کیجیے تاکہ میں یہ سمجھوں کہ ایک دن میری حالتِ زار پر اُن کو رحم بھی آجائے گا۔ یہ جو نگاہِ غلط انداز کبھی کبھی پڑتی ہے یہ تو میرے لئے زہرِ قاتل کا حکم رکھتی ہے۔

رشکِ ہم طرحی و دردِ اثرِ بانگِ حزیں

نالۂ مرغِ سحر تیغِ دو دم ہے ہم کو

معنی۔ رشکِ ہم طرحی = ہم نوائی کا رشک

فرماتے ہیں۔ کہ ایک تو ہم نوائی کا رشک دوسرے بانگِ حزیں کے درد کا اثر۔ ان دونوں نے مرغِ سحر کی فریاد کو میرے لئے دو دھاری تلوار بنا دیا ہے۔

سر اُڑانے کے جو وعدے کو مکرّر چاہا

ہنس کے بولے کہ "ترے سر کی قسم ہے ہم کو"

فرماتے ہیں۔ میں نے محبوب سے سر کے کاٹنے کے وعدے کو دوسری دفعہ چاہا۔ وہ ہنس کر کہنے لگے کہ تیرے سر کی قسم ہے ہم کو کہ ہم تیرے سر کو ضرور کاٹیں گے۔ دوسرے معنی یہ ہیں کہ ہم ہرگز تیرا سر نہیں کاٹیں گے۔ جیسے کہتے ہیں کہ ہم کو فلاں کام کرنے کی قسم ہے مطلب یہ ہوتا ہے کہ ہم ہرگز یہ کام نہیں کریں گے

دل کے خوں کرنے کی کیا وجہ؟ ولیکن ناچار

پاسِ بے رونقیٔ دیدہ اہم ہے ہم کو

فرماتے ہیں ۔ دل کے خون کرنے کی کوئی خاص وجہ نہیں ہے۔ لیکن ہم سے بے رونق آنکھیں دیکھی نہیں جاتیں ہیں، آنکھوں کی آب و تاب کا بہت خیال ہے ۔اس وجہ سے ہم خون کے آنسو روتے رہتے ہیں ۔

تم وہ نازک کہ خموشی کو فغاں کہتے ہو
ہم وہ عاجز کہ تغافل بھی ستم ہے ہم کو

فرماتے ہیں ۔تم وہ نازک ہو کہ ہماری خموشی کو بھی آہ و فغاں سے تعبیر کرتے ہو اور اِدھر ہم اتنے عاجز ہیں کہ تمھاری لاپرواہی اور کوئی ستم نہ کرنا بھی ہمارے لیے ستم ہے ۔شاید تم نے ہماری کمزوری کو دیکھ کر ستم سے ہاتھ اٹھایا ہے مگر ہم پر تو یہ اور بھی ستم ہے کہ تم ہمارے ساتھ تغافل سے کام لیتے ہو۔

قطعہ

لکھنؤ آنے کا باعث نہیں کھلتا یعنی ہوسِ سیر و تماشا سو وہ کم ہے ہم کو

فرماتے ہیں ۔ لکھنؤ ہم کیوں آئے اِس کا سبب ہم پر بھی ظاہر نہ ہو سکا ۔سیرِ و تماشا کی غرض سے لوگ سفر کرتے ہیں جگہ جگہ جاتے ہیں مگر ہم کو تو یہ شوق بالکل نہیں ہے ۔

مقطعِ سلسلۂ شوق نہیں ہے یہ شعر عزمِ سیرِ نجف و طوفِ حرم ہے ہم کو

فرماتے ہیں ۔ یہ شعر سلسلۂ شوق کا مقطع نہیں ہے ۔ ہاں ہمارے دل میں سیرِ نجف اور طواف حرم کا ارادہ ضرور ہے ۔

جادۂ رہ کششِ کافِ کرم ہے ہم کو
لئے جاتی ہے کہیں ایک توقع غالب

غالب پنشن کی بحالی کے سلسلہ میں کلکتہ جاتے ہوئے لکھنؤ بنارس وغیرہ ٹھہرے تھے
اس مقطع میں اس کا اشارہ پایا جاتا ہے۔

غزل ۱۲۲

تُم جانو تم کو غیر سے جو رسم و راہ ہو
مجھ کو بھی پوچھتے رہو تو کیا گناہ ہو

فرماتے ہیں۔ غیر سے بیشک راہ و رسم رکھو میں تمہیں روکتا نہیں میری غرض صرف یہ ہے کہ کبھی کبھار نظر لطف و کرم مجھ پر بھی پڑتی رہے تو کوئی بُری بات نہیں ہے مطلب یہ ہے کہ میں تنگ نظر نہیں ہوں۔

بچتے نہیں مواخذۂ روزِ حشر سے
قاتل اگر رقیب ہے تو تم گواہ ہو

فرماتے ہیں۔ روزِ محشر تمہیں بھی بطور گواہ ہی سہی، حاضر ہونا ہوگا۔ اگر مجھے رقیب نے رشک دلا دلا کر ہلاک کیا ہے تو تم اس کے گواہ ہو (سچے گواہ کی کوئی سزا نہیں ہوتی)

کیا وہ بھی بے گنہ وحق ناشناس ہیں
مانا کہ تم بشر نہیں، خورشید و ماہ ہو

فرماتے ہیں۔ یہ ہم مانتے ہیں کہ تم بشر نہیں ہو بلکہ خورشید و ماہ ہو۔ لیکن کیا وہ بھی تمہاری طرح حق تلفی

کرنے والے اور بے گناہ لوگوں کو مارنے والے ہیں ۔

جب میکدہ چھٹا، تو پھر اب کیا جگہ کی قید

مسجد ہو، مدرسہ ہو، کوئی خانقاہ ہو

فرماتے ہیں ۔ جب میکدہ ہم سے چھوٹ گیا۔ جہاں ساقی شراب پلاتا تھا اور ہم حریفوں کے ساتھ مزے لے لے کر پیا کرتے تھے۔ وہ پینے پلانے کا دور ختم ہوگیا۔ اب ہم مسجد میں بیٹھ کر شراب پئیں یا کسی خانقاہ میں ایک ہی بات ہے کسی جگہ کی قید نہیں ۔ کوکب شاہجہانپوری نے کیا خوب کہا ہے:

ے برباد کر دیا دلِ آوارہ گرد نے
ورنہ نشاطِ روح تو اس انجمن میں تھی

اُبھرا ہوا نقاب میں ہے اُن کے ایک تار

مرتا ہوں مَیں کہ یہ نہ کسی کی نگاہ ہو

فرماتے ہیں ۔ اُن کے نقاب میں ایک تار ابھرا ہوا نظر آتا ہے ۔ میرے دل میں یہ خوف پیدا ہو رہا ہے کہ یہ کسی مشتاقِ جمال رقیب کی نگاہ، تو نقاب میں اُلجھ کر نہیں رہ گئی ۔ مطلب یہ ہے کہ محبوب کے پاس کسی بھی شے کو دیکھ کر بوجہ رشک طرح طرح کے توہمات اور خیالات پیدا ہو جاتے ہیں ۔ حالانکہ نقاب کا تار ایک بے جان چیز ہے اسے تارِ نگاہ سے کیا تعلق

سُنتے ہیں جو بہشت کی تعریف، سب درست

لیکن خُدا کرے وہ ترا جلوہ گاہ ہو

فرماتے ہیں ۔ بہشت کے متعلق جو کہا گیا ہے وہ اپنی جگہ درست ہے لیکن ہمیں اس سے غرض نہیں ہے ہمیں تو جو کچھ وہاں چاہیئے وہ یہ ہے کہ خدا کرے، تیرا جلوہ نصیب ہو۔ مطلب یہ ہے کہ بہشت

کے متعلق سب کچھ ٹھیک ہے مگر ہمیں تو دیدارِ الٰہی چاہیئے۔ خدا کرے کہ وہ اپنے دیدار سے
سرفراز فرمائے۔

غالبؔ بھی گر نہ ہو تو کچھ ایسا ضرر نہیں

دُنیا ہو یارب! اور مرا بادشاہ ہو

فرماتے ہیں۔ غالبؔ ایسا باکمال شاعر بھی دُنیا سے چلا جائے تو کوئی نقصان نہیں ہوگا مگر میرا بادشاہ
اور اُس کی رعایا سلامت رہے۔

غزل ۱۲۳

گئی وہ بات کہ ہو گفتگو تو کیوں کر ہو

کہے سے کچھ نہ ہُوا پھر کہو، تو کیوں کر ہو

فرماتے ہیں۔ بہت سوچ بچار کیا کرتے تھے کہ ہم انہیں حالِ دل کیسے سنائیں۔ اظہارِ شوق کیسے
کریں۔ مگر جب ہمیں موقعہ مل گیا اور سب کچھ انہیں سنا دیا۔ پھر بھی بات نہ بنی۔ اب اور کیا
کریں وہ بات ہی ختم ہوگئی جس پر آس لگائے بیٹھے تھے۔ مطلب یہ ہے کہ ہم نے ان کو سب
کچھ سنا دیا مگر اُن پر خاک اثر نہ ہوا۔ اُن کے سینہ میں دل نہیں پتھر ہے۔

ہمارے ذہن میں اِس فکر کا ہے نام وصال

کہ گر نہ ہو تو کہاں جائیں ہو تو کیوں کر ہو

فرماتے ہیں۔ ہمارے نزدیک وصال کی جستجو کرتے رہنا اور انجام پر نظر رکھنا ہی وصال ہے۔ ہم بہر دو

بیٹھے سوچتے رہتے ہیں کہ وصالِ یار نصیب نہ ہوا تو کیا کریں گے کہاں جائیں گے۔ اور اگر ہو سکتا ہے
تو کیا طریق کار ہونا چاہیئے۔

ادب ہے اور یہی کشمکش تو کیا کیجیے

حیا ہے اور یہی گومگو تو کیوں کر ہو

فرماتے ہیں ۔ شوقِ تمنا یہی چاہتا ہے کہ دِل مراد بر آئے مگر ادب جلد بازی کی اجازت نہیں دیتا لہٰذا
شوقِ تمنا اور ادب میں برابر کشمکش جاری ہے۔ اور حیا بھی اسی جھگڑے میں قدم رکھنا چاہتی ہے
اب بتاؤ ہم کیا کریں ۔

تم ہی کہو کہ گزارہ صنم پرستوں کا

بُتوں کی ہو اگر ایسی ہی خو۔ تو کیوں کر ہو

فرماتے ہیں ۔ ہم تم ہی سے پوچھتے ہیں کہ ایمان سے کہہ دو کہ اگر تمام حسینانِ عالم تمہاری جیسی خُو رکھتے ہوں
کہ انکار کے سوا کچھ کہنا ہی نہ چاہیں تو صنم پرستوں کا گزارہ کیونکر ہو۔

اُلجھتے ہو تم اگر دیکھتے ہو آئینہ

جو تم سے شہر میں ہوں ایک دو تو کیوں کر ہو

فرماتے ہیں تم جیسے نازک مزاج جو اپنا عکس بھی آئینہ میں دیکھتے ہیں تو اُلجھتے ہیں تمہیں اپنا عکس بھی گوارا
نہیں۔ لیکن آپ کی مانند شہر میں کچھ حسین اور بھی ہوں تو تمہارا کیا حال ہوگا۔ معلوم نہیں کیا قیامت
برپا کر دگے۔

جسے نصیب ہو روزِ سیاہ میرا سا

وہ شخص دن نہ کہے رات کو تو کیوں کر ہو

فرماتے ہیں ۔ میرے جیسا سیہ بخت اگر رات کو بھی دن نہ کہے تو اور کیا کرے ۔

ہمیں پھر اُن سے اُمید، اور انہیں ہماری قدر

ہماری بات ہی پوچھیں نہ وہ تو کیوں کر ہو

فرماتے ہیں ۔ اگر ہمارا محبوب ہماری بات ہی نہیں پوچھتا نہ ہمارے حال سے واقف ہے، تو اسے ہماری قدر کیسے ہو اور ہم اس سے امید کیا رکھیں ۔

غلط نہ تھا ہمیں خط پر گماں تسلّی کا

نہ مانے دیدۂ دیدار جو تو کیوں کر ہو

فرماتے ہیں ۔ ہمارا گمان غلط نہ تھا کہ اگر محبوب کا جواب آ جائے گا تو دل کو تسلی ہوگی مگر ہماری آنکھ جو اس کا دیدار چاہتی ہے تسلی حاصل نہ کرے تو کیا کیا جائے ۔

بتاؤ اس مژہ کو دیکھ کر ہو مجھ کو قرار

یہ نیش ہو رگِ جاں میں فرو تو کیوں کر ہو

فرماتے ہیں ۔ خطاب شاید ناصح سے ہے کہ آپ مجھے صبر و قرار کا وعظ کر رہے ہیں آپ ذرا اس ظالم کی پلکوں کو دیکھ کر کہو کہ جب ایسے نشتر دل میں چبھیں تو صبر و قرار کیسے آئے ۔

مجھے جنوں نہیں غالبؔ و لے بقولِ حضور

فراقِ یار میں تسکین ہو تو کیوں کر ہو

بقولِ حضور سے مراد بہادر شاہ ظفر ہیں۔ اور مصرعۂ ثانی اُن کا ہی ہے۔ شعر کا مطلب صاف ہے۔

غزل ۱۲۴

کسی کو دے کے دل کوئی نوا سنجِ فغاں کیوں ہو

نہ ہو جب دل ہی سینے میں تو پھر منہ میں زباں کیوں ہو

فرماتے ہیں ۔ جب کسی کو دل جیسی شے دے دی ۔ اور عاشق ہو بیٹھے، تو اب رونے پیٹنے کا موقعہ نہیں یہ شانِ عاشقی کے خلاف ہے جب دل سینہ میں نہیں تو زبان بھی نہیں ہونی چاہیئے ۔ عاشق کو خاموش اور پردہ دار رہنا چاہیئے ۔

وہ اپنی خو نہ چھوڑیں گے ہم اپنی وضع کیوں چھوڑیں

سُبک سر بن کے کیا پُوچھیں کہ ہم سے سرگراں کیوں ہو

فرماتے ہیں ۔ وہ اگر روٹھنے کی عادت نہیں چھوڑیں گے تو ہم اپنی خود داری کو کیوں چھوڑیں اور نیچے ہو کر ان سے کیوں کہیں کہ آپ ہم سے کیوں ناراض ہو ۔

کیا غم خوار نے رسوا لگے آگ اِس محبت کو

نہ لادے تاب جو غم کی وہ میرا رازداں کیوں ہو

فرماتے ہیں ۔ ایسے غم خوار کی غم خواری اور محبت بھاڑ میں جائے جس نے غم کی تاب نہ لا کر ہمارا بھانڈا ہی پھوڑ دیا یعنی رازِ عشق فاش کر دیا ۔ ایسے کم ظرف کو میں اپنا رازداں کیوں بناؤں ۔
حقیقی راز تو وہ ہے جو دل میں دفن ہو جائے بہ کسی کو راز رکھنا ہو تو پھر منہ میں زباں کیوں ہو (شارح)

وفا کیسی؟ کہاں کا عشق؟ جب سر پھوڑنا ٹھہرا
تو پھر اے سنگ دل تیرا ہی سنگِ آستاں کیوں ہو؟

فرماتے ہیں۔ جب اُس کی نظر میں ہماری وفا کی کوئی قدر و قیمت ہی نہیں اور نہ ہی وہ ہمارے عشق کی سچائی کا قائل ہے بلکہ ہماری ان خوبیوں کو سر پھوڑنے کے برابر سمجھتا ہے تو پھر غالبؔ تو ایسے سنگ دل کو چھوڑ اور اُس کے سنگِ آستاں پر اپنا سر نہ پھوڑ۔ اور بھی بہت سے حسین و جمیل محبوب ہیں جو تیری وفاداری کی قدر کریں گے تیرے عشق کا مذاق نہ اڑائیں گے۔

قفس میں مجھ سے رودادِ چمن کہتے نہ ڈر ہمدم
گری ہے جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو؟

فرماتے ہیں۔ اے ہم صفیر اے میرے ساتھی۔ تو جو ابھی گرفتار ہو کر یہاں آیا ہے۔ میں ایک عرصہ سے قید ہوں مجھے کچھ چمن کے حالات بتا کہ چمن اور اہلِ چمن کی کیا حالت ہے تو جلدی سے رودادِ چمن بیان کر دے۔ کل جس آشیاں پر بجلی گری تھی وہ شاید میرا آشیانہ نہ ہو۔ مطلب شعر کا یہ ہے کہ حقیقت کے اظہار میں کسی خوف اور تردد کو ایک طرف اُٹھا کر رکھ دینا چاہیئے۔

یہ کہہ سکتے ہو "ہم دل میں نہیں ہیں" پر یہ بتلاؤ
کہ جب دل میں تمہی تم ہو تو آنکھوں سے نہاں کیوں ہو؟

فرماتے ہیں۔ اے شاہدِ حقیقی یہ تو تم نہیں کہہ سکتے کہ ہم دل میں نہیں ہیں۔ تم سے کوئی شے چھپی ہوئی نہیں ہے مگر ہم کو یہ بتا دو کہ جب دل میں تم ہی تم ہو اور تمہارے علاوہ کوئی دوسرا نہیں ہے تو پھر میری آنکھوں سے پوشیدہ کیوں ہو۔ کچھ نہ کچھ تو تسکین کے لئے میری آنکھوں کو بھی چاہیئے۔

بنایا ہے جس نے ہر اک شے کو تجلی کا ۔ نظر جس کی ہو ہر دم اس کی نظروں سے نہاں کیوں ہو۔ شارح

غلط ہے جذبِ دل کا شکوہ، دیکھو جرم کس کا ہے

نہ کھینچو گر تم اپنے کو کشاکش درمیاں کیوں ہو؛

فرماتے ہیں ۔ تم مجھ سے میرے جذبِ دل کی شکایت کرتے ہو کہ تمھارا جذبِ دل ہمیں اپنی طرف کھینچتا ہے۔ یہ بات غلط ہے اگر آپ اپنے آپ کو نہ کھینچیں تو جذبِ دل کو کھینچنے کی ضرورت ہی پیش نہ آئے بجائے شکایت کرنے کے تم خود ہی سوچ لو کہ قصور تمھارا ہے یا میرے جذبِ دل کا۔ اگر تم اپنے آپ کو نہ کھینچو گے تو کشاکش خود بخود درمیان سے ہٹ جائیگی ۔

یہ فتنہ آدمی کی خانہ ویرانی کو کیا کم ہے

ہوئے تم دوست جس کے دشمن اس کا آسماں کیوں ہو؛

فرماتے ہیں ۔ تمہارا کسی کا دوست ہو جانا خانہ ویرانی کے لئے کافی ہے۔ تم جس کے دوست ہو آسمان اس کا دشمن کیوں ہو۔ تمھاری ہی دوستی دشمنی سے بھری ہے۔ آسمان خواہ مخواہ اپنا نام دشمنوں میں کیوں درج کرلے ۔

یہی ہے آزمانا، تو ستانا کس کو کہتے ہیں

عدو کے ہو لئے جب تم، تو میرا امتحاں کیوں ہو؛

فرماتے ہیں ۔ میرے عشق و محبت اور وفاداری کا امتحان، اگر لینا تھا تو پھر عدو کے ہونے کی ضرورت نہیں تھی اور اگر اس سے عمر بھر نبھاہنے کا وعدہ کر چکے تو پھر مجھے کیوں آزماتے ہو۔ یہ آزمانا نہیں ہے بلکہ یہ تو سراسر ستانا منظور ہے ۔

بدنام ہوگے رہنے بھی دو امتحان کو ✣ رکھے گا تم سے کون عزیز اپنی جان کو

میر تقی میر

کہا تم نے کہ "کیوں ہو غیر کے ملنے میں رسوائی
بجا کہتے ہو، سچ کہتے ہو، پھر کہیو کہ ہاں کیوں ہو؟

فرماتے ہیں۔ کہ تم نے جو یہ کہا کہ کیوں "ہو غیر کے ملنے میں بدنامی و رسوائی کیوں ہو۔ کیا وجہ ہے کہ ایسا ہو۔ ہم تم سے بھی تو ملتے ہیں۔" بجا کہتے ہو۔ سچ کہتے ہو۔ پھر دوبارہ کہو کہ کیوں ہو۔ مطلب یہ ہے کہ رسوائی ضرور ہوگی۔

نکالا چاہتا ہے کام کیا طعنوں سے تو غالبؔ
ترے بے مہر کہنے سے وہ تجھ پر مہرباں کیوں ہو؟

فرماتے ہیں۔ اے غالبؔ تو طعنے دے کر اپنا کام نکالنا چاہتا ہے۔ وہ تیرے بے مہر کہنے سے تجھ پر کیوں مہربان ہو۔ معشوق تیری چالوں کو سمجھ گیا ہے پہلے وہ ضد سے جو کچھ اُلٹ کرتا تھا۔ مگر اب ایسا نہیں ہوگا۔

غزل ۱۲۵

رہیئے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو
ہم سخن کوئی نہ ہو اور ہم زباں کوئی نہ ہو

فرماتے ہیں اِس بے وفا ماحول سے اِس دُنیا سے دل بھر گیا نہ یہاں دوستی ہے نہ ہم وطنی کا خیال ہے ہم سخن جو کہ ہم پیشہ ہیں ان سے دل برداشتہ ہو چکا ہوں۔ اب کوئی ایسی جگہ چلیں جہاں ان سب سے نجات حاصل ہو۔

بے در و دیوار سا اک گھر بنانا چاہیئے

کوئی ہمسایہ نہ ہو اور پاسباں کوئی نہ ہو

فرماتے ہیں۔ اس ماحول سے تو بہتر ہے کہ انسان جنگل میں چلا جائے۔ لکڑی پھونس کا ایک گھر بنالے۔ جہاں نہ در ہو نہ کوئی دیوار ہو اور نہ ہی کوئی پڑوسی ہو اور وہاں کسی پاسبان کی بھی ضرورت نہ ہو تاکہ یہ غم اور لعن طعن کے جو صدمات ماحول کی طرف سے میرے دل کو چھلنی کرتے رہتے ہیں ان سب سے نجات مل جائے۔

پڑیئے گر بیمار تو کوئی نہ ہو تیماردار

اور اگر مر جایئے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو

فرماتے ہیں۔ مذکورہ بالا جگہ پر بیماری کے دنوں میں ان دشمنوں میں سے کوئی تیماردار بھی نہ بنے گا اور ہم اگر وہاں اس جہانِ فانی سے گزر بھی جائیں گے تو رونے پیٹنے والا بھی وہاں کوئی نہ ہوگا۔

غزل ۱۲۶

از مہر تا بہ ذرہ، دل و دل ہے آئنہ

طوطی کو شش جہت سے مقابل ہے آئنہ

فرماتے ہیں۔ آفتاب سے ذرہ تک اس کائنات میں مکمل اتحاد ہے ہر شے ایک دوسرے کے مقابل بھی ہے مگر پھر بھی اپنے وجود کے لئے دل سے دل ملائے ہوئے ہے منہ سے منہ ملائے ہوئے اور ایک دوسرے کا سہارا لئے ہوئے اور پھر سب کسی کا سہارا لئے ہوئے ہیں۔ طوطی شش جہت

میں جس طرف منہ کرے گی مقابل میں آئینہ پائے گی۔ طوطی کو استعارۃً استعمال کیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ساری کائنات عکسِ خالق ہے اور اسی کا نمودِ حسن ہے جو اپنی ذات میں جب ہی تک قائم ہے جب آئینہ کے سامنے خالقِ حقیقی کا چہرہ ہے۔ جونہی چہرہ ہٹے گا سب جلوہ ختم ہو جائے گا۔

غزل ۱۲۷

ہے سبزہ زار ہر در و دیوارِ غم کدہ
جس کی بہار یہ ہو پھر اس کی خزاں نہ پوچھ

فرماتے ہیں۔ میرے غم کدہ کی یہ حالت ہے کہ در و دیوار منہدم ہو چکے ہیں اور خود رو سبزہ ہر جگہ پر اُگ آیا ہے۔ جس گھر کی بہار کا یہ عالم ہے اس کی خزاں کا عالم کیا ہوگا۔

ناچار بے کسی کی بھی حسرت اُٹھائیے
دشواریٔ رہ و ستمِ ہم رہاں نہ پوچھ

فرماتے ہیں راہ کی دشواریاں اور ہم سفروں کے ستم کا حال مجھ سے نہ پوچھو۔ میں نے ہمراہیوں کو چھوڑ دیا ہے اب منزلیں خود ہی طے کروں گا اور بے کسی اور تنہائی کی حسرت اُٹھاؤں گا۔

منزل بھلا ملے تو ملے کیسے ہم سفر
جو راہبر ہیں آج وہی راہزن بھی ہیں
(جاوید وشسٹ)

غزل ۱۲۸

صد جلوہ رو برو ہے جو مژگاں اٹھائیے　　طاقت کہاں کہ دید کا احساں اٹھائیے

فرماتے ہیں ۔ محبوبِ حقیقی کے جلوے چاروں طرف بکھرے پڑے ہیں اگر آنکھ اٹھا کر دیکھئے کون سی شے ہے جو اُس کے حُسن کی نمائش نہیں کر رہی ۔ مگر یہ طاقت کس کو ہے ان سب کیفیات کو دیکھے اور ان میں جو ہزار حسن ہیں اُس سے لطف اندوز ہو سکے ۔ دیکھتے دیکھتے آنکھیں خیرہ ہو جائیں گے مگر اُس کی قدرتوں کی نیرنگیاں کبھی بھی ختم نہ ہوں ۔ میر انیس لکھنوی فرماتے ہیں اور کیا خوب فرماتے ہیں ۔ ؎

جنگل میں پھروں کہ سیرِ صحرا دیکھوں　　یا معدنِ کوہ و دشت و دریا دیکھوں

ہر رنگ میں ہیں تیرے ہزاروں جلوے　　حیران ہوں دو آنکھوں سے کیا کیا دیکھوں

ہے سنگ پر براتِ معاشِ جنونِ عشق　　یعنی ہنوز منتِ طفلاں اُٹھائیے

معنی ۔ برات ۔ تنخواہ کی چھٹی

فرماتے ہیں ۔ لڑکے جو پتھر مارتے ہیں ان پتھروں میں ہماری تنخواہ کی چِھٹیاں لکھی ہیں جس سے ہماری معاش کا سلسلہ جاری ہے ۔ لہٰذا ابھی اور عرصہ تک لڑکوں کے پتھروں کی مار کھانی ضروری ہے ۔ پھر ہمارا جنونِ عشق تکمیل کو پہنچے گا ۔

دیوار بارِ منتِ مزدور سے ہے خم　　اے خانماں خراب نہ احساں اٹھائیے

فرماتے ہیں ۔ دیوار بھی مزدور کے احسان کا بوجھ نہ اٹھا سکی جو بہت مضبوطی سے بنی ہے ۔ تو اے

خانماں خراب تو دُنیا میں کسی کا احسان کیسے اُٹھائے گا لہٰذا دیوار سے عبرت حاصل کر

زخمِ دل و جگر کا بھی ممکن تھا کچھ علاج ؛ آہ ، تھی اپنی آن کہ احساں اٹھائیے (شارح)

یا میرے زخمِ رشک کو رسوا نہ کیجئے   یا پردۂ تبسمِ پنہاں اٹھائیے

فرماتے ہیں ۔ آپ اپنی چھپی ہوئی مسکراہٹ کی کیفیت سے آگاہی بخشیں کہ وہ کس لئے ہے تاکہ پھر

میرے زخمِ رشک کا کوئی مداوا کر سکے ؂ میرا الیقین بھی کبھی عین الیقیں بنے

اک دن تو پردۂ رخِ تاباں اٹھائیے (شارح)

غزل ۱۲۹

مسجد کے زیرِ سایہ خرابات چاہیئے   بھوں پاس آنکھ قبلۂ حاجات چاہیئے

شاعر آنکھ کو میخانہ اور بھوں کو محراب سے تشبیہ دیتے ہیں ۔ قبلۂ حاجات طنزاً خشک ملا یا زاہد

فرماتے ہیں ۔ اے قبلۂ حاجات مسجد کے پاس ہی خرابات یعنی میخانہ ہونا چاہیئے تاکہ لوگوں کا امتحان

لیا جاسکے یہی خالقِ مطلق کا منشا اور سکیم ہے ۔ کیا اس نے آدم کے ساتھ شیطان کو پیدا نہیں

کیا تا نیکی اور بدی دونوں اپنا اپنا کام کرتی رہیں جس طرح بھوں کے پاس ہی آنکھ ہے ۔ محرابِ

مسجد کے اندر ہی میخانہ ہے ۔ ہر چیز کی ضد ہونی لازمی ہے ۔

عاشق ہوئے ہیں آپ بھی اک اور شخص پر   آخر ستم کی کچھ تو مکافات چاہیئے

فرماتے ہیں ۔ اچھا ہوا کہ آپ بھی کسی اور شخص پر عاشق ہو گئے جس طرح ہم آپ پر ہوئے تھے ۔ اب

اُن تمام ظلم و ستم کا بدلہ آپ کو ضرور مل جائے گا جو آپ نے ہمارے لئے روا کئے ہوئے تھے ۔

دے داد اے فلک دلِ حسرت پرست کی   ہاں کچھ نہ کچھ تلافیِ مافات چاہیئے

فرماتے ہیں ۔ اے فلک تمنائیں آرزوئیں سب خاک میں مل گئیں اور میرا دل بس حسرت پرست ہو کر رہ گیا ہے اس دلِ حسرت پرست کی کبھی تو کوئی آرزو پوری کر دے۔ کچھ اور نہیں کرتا تو کم ازکم داد ہی دے جس سے گزری ہوئی تمناؤں کی تلافی ہو سکے۔

سیکھے ہیں مہ رُخوں کے لئے ہم مصوّری
تقریب کچھ تو بہرِ ملاقات چاہیئے

فرماتے ہیں ۔ ہم نے حسینوں کے لئے مصوری سیکھی ہے تاکہ معشوقوں کی ملاقات کریں، تو کوئی تحفہ پیش کرکے ذریعہ تقریب بنائیں۔

مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو
اک گونہ بے خودی مجھے دن رات چاہیئے

فرماتے ہیں ۔ شراب پینے سے میری غرض نشاط و سرور حاصل کرنا نہیں بلکہ میں تو اپنے رنج وغم کو بھول جانے کے لیے شراب پیتا ہوں۔ مجھ کو غم غلط کرنے کے لئے دن رات ایک بیخودی کی ضرورت ہے ۔

ہے رنگِ لالہ وگل و نسریں جُدا جُدا
ہر رنگ میں بہار کا اثبات چاہیئے

فرماتے ہیں ۔ جس طرح لالہ وگل اور نسرین کے رنگ جدا جدا ہیں اور ہر ایک اپنی جگہ خوبصورت اور خوشنما ہے اور اپنی بہار دکھا رہا ہے یہ اللہ تعالیٰ کی قدرت نمائی ہے اور اسی کا ہاتھ ہر جگہ نظر آرہا ہے۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ گلشن میں بہار آئی ہوئی ہے۔ جس قدر حُسن ہم کائنات میں دیکھتے ہیں وہ سب کے سب شاہدِ مطلق میں موجود ہیں اور ان سب سے اللہ تعالیٰ کی صفات ظاہر ہو رہی ہیں۔

ق

سر پائے خم پہ چاہیئے ہنگامِ بے خودی
رُو سوئے قبلہ وقتِ مناجات چاہیئے

فرماتے ہیں ۔ بوقتِ بے خودی سر کو پائے خم پہ ہونا چاہیئے جس طرح مناجات کے وقت قبلہ رو ہوتے

ہیں پھر آپ ہی معنی کو مزید واضح کرتے ہوئے فرماتے ہیں ۔

یعنی بحسبِ گردشِ پیمانۂ صفات　　　عارف ہمیشہ مستِ مئے ذات چاہیئے

فرماتے ہیں ۔ حسب منشا گردشِ پیمانۂ صفات عارف کو چلتے رہنا چاہیئے ۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی یوں تو تمام صفات اَزلی و اَبدی ہیں اور اُن میں کسی قسم کا ردّ و بدل نہیں لیکن پھر بھی اُس کی ایک ایک صفات کا دَور چل رہا ہوتا ہے اور عارف باللہ کے لئے وہی ایک صفت اسمِ اعظم ہوتی ہے ۔ اسی وجہ سے ہر نبی نے اپنے اپنے وقت میں مختلف صفات کا پرچار کیا ہے جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی بعثت میں اَلمنتقم اور اَلجبار کی صفت ظاہر کی ، حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اَلغفور کی صفت ۔ ہمارے آقا و مولا حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کی تمام صفاتِ حسنہ معلومہ کا اظہار کر کے اپنی ذاتِ متعددہ صفات کو ذاتِ الٰہی کا مظہر اتم ثابت کیا ہے ۔

نشو و نما ہے اصل سے غالبؔ فروع کو　　　خاموشی ہی سے نکلے ہے جو بات چاہیئے

فرماتے ہیں ۔ شاخیں اصل یعنی جڑ کے بغیر قائم نہیں رہ سکتیں ۔ یعنی درخت کی جڑ ہو گی تو درخت کی تمام شاخیں پھولیں گی ۔ انسان جو بات مُنہ سے کہتا ہے اُس کی اصل یعنی جڑ ذہن میں ہوتی ہے ۔ اس شعر میں اور اس سے پہلے شعروں میں شاہدِ مطلق اور اس کی صفات کی بات چل رہی ہے یہاں بھی اسی میں سے ایک کا اظہار ہے کہ تمام کائنات کا ایک پیدا کرنے والا ہے اور وہ عالمِ ظہور سے پوشیدہ ہے جس طرح درخت کی شاخیں باہر اور اس کی اصل یعنی جڑ پوشیدہ ہے ۔ علامہ اقبال کا ایک شعر بھی اسی قبیل کا ہے ۔ فرماتے ہیں ۔ ؎

شاعر کی فکر کو پرِ پرواز خامشی
سرمایہ دار گرمی آواز خامشی

غزل ۱۳۰

بساطِ عجز میں تھا ایک دل یک قطرہ خوں وہ بھی
سو رہتا ہے باندازِ چکیدن سرنگوں وہ بھی

معنی۔ چکیدن۔ ٹپکنا، ٹکنا۔ بساطِ عجز۔ سرمایۂ عاجزی

فرماتے ہیں۔ بساطِ عجز میں دل کی حقیقت ایک خون کے قطرے کی ہے مگر ٹپکنے کی وجہ سے وہ ہر وقت سرنگوں رہتا ہے۔ خبر نہیں کب ٹپک جائے۔

مطلب اس شعر کا یہ معلوم ہوتا ہے کہ میری متاعِ عشق صرف ایک دل تھا اب اس کے مسلسل ٹپکنے سے ہر وقت خوف رہتا ہے۔

رہے اُس شوخ سے آزردہ ہم چندے تکلّف سے
تکلّف برطرف، تھا ایک اندازِ جنوں وہ بھی

فرماتے ہیں۔ اُس شوخ کے ساتھ تھوڑے دن تک بناوٹ سے آزردہ خاطر رہے۔ لحاظ کیا اُس کا پاس کیا اُس کا۔ وہ بھی ایک اندازِ جنوں تھا جو شرم و لحاظ سے پیدا ہوا تھا۔

خیالِ مرگ کب تسکیں دلِ آزردہ کو بخشے
مرے دامِ تمنّا میں ہے اک صیدِ زبوں وہ بھی

فرماتے ہیں۔ ہمارا آزردہ و غمگین دل مرجانے کے خیال سے بھی تسکین نہیں پاتا۔ میری تمنا کے دام میں خیالِ مرگ ایک مریل سا شکار ہے۔ مطلب یہ ہے کہ مرضِ عشق ایسا نہیں کہ مرکر پیچھا

چھوٹ جائے۔ مجازی عشق حقیقی عشق میں تبدیل ہو جائے گا۔

نہ کرتا کاش نالہ، مجھ کو کیا معلوم تھا ہمدم

کہ ہوگا باعثِ افزائشِ دردِ درُوں وہ بھی

فرماتے ہیں۔ اے میرے دوست کاش میں نالہ و فغاں نہ کرتا تو میرے لیے بہتر ہوتا مجھے کیا معلوم تھا کہ رازِ عشق فاش ہو جائے گا اور ضبط نہ کرنے کی وجہ سے وہ چھپے ہوئے دبے ہوئے سارے غم ظاہر ہو جائیں گے اور بجائے کمی کے یہی نالہ و فغاں باعثِ افزائش رنج و غم ہو جائے گا۔ میرا خیال تھا کہ نالہ با اثر ہونے کی صورت میں کامیابی حاصل ہوگی، مگر میرا نالہ بے اثر رہا اور اُلٹا باعثِ درد بنا

نہ اتنا بُرّشِ تیغ جفا پر ناز فرماؤ

مرے دریائے بیتابی میں ہے اک موجِ خوں وہ بھی

فرماتے ہیں۔ اے میرے قاتل تو اپنی بُرّشِ تیغ جفا پر اتنا نازاں نہ ہو۔ یہ تو میں جانتا ہوں کہ تیرے ستم کی تلوار مجھے بار بار قتل کر رہی ہے۔ مگر وہ کیا میرے دریائے بیتابی کی ایک ہلکی سی موج ہی تو ہے۔ مطلب یہ کہ اگر میرے دریائے بیتابی میں یہ طوفان برپا نہ ہوتا تو تیغ جفا مجھ پر کوئی اثر نہ کر سکتی ۔ (معنی بُرّش۔ کاٹ، بُرّشِ تیغ۔ تلوار کی کاٹ)

مئے عشرت کی خواہش ساقیِ گردوں سے کیا کیجیے

لئے بیٹھا ہے اک، دو چار جامِ واژگوں وہ بھی

معنی۔ واژگوں۔ خالی یا اُلٹے جام

فرماتے ہیں۔ ساقیِ گردوں سے عیش و عشرت کے جام کی خواہش کیا کریں۔ اس کے پاس بھی ایک دو،

جام اُلٹے پڑے ہیں یعنی خالی۔ ایک دو چار مل کر سات آسمانوں کی طرف اشارہ ہے۔

مرے دل میں ہے غالبؔ شوقِ وصل و شکوۂ ہجراں
خدا وہ دن کرے جو اُس سے میں یہ بھی کہوں وہ بھی

یہاں تخلص غالبؔ پُر لطف ہے۔ فرماتے ہیں خدا وہ دن بھی دکھائے جب میرا شوقِ وصل کامیاب ہو اور میں پھر اس سے ہجر کا شکوہ بھی کروں۔

غزل ۱۳۱

ہے بزمِ بتاں میں سُخن آزردہ لبوں سے
تنگ آئے ہیں ہم ایسے خوشامد طلبوں سے

فرماتے ہیں۔ اُس کی محفل ناز میں بات کرنی محال ہے اس لئے جو ہم کہنا چاہتے ہیں وہ خوشامد طلب یعنی محبوب سُننا نہیں چاہتا۔ وہ بتِ ناز چاہتا ہے۔ ہم چکنی چپڑی باتیں کریں لہٰذا ہمارا سخن بایں وجہ ہم سے آزردہ یعنی ناراض ہو گیا ہے ادھر ہم بھی ان خوشامد طلب محبوبوں سے تنگ آچکے ہیں۔

ہے دورِ قدح وجہِ پریشانیٔ صہبا
یک بار لگا دو خُمِ مے میرے لبوں سے

فرماتے ہیں۔ صہبا دورِ قدح کی وجہ سے پریشان رہتی ہے اور یہ کوئی اچھی بات نہیں ہے یہ ہماری تشنگی کو ستاتی ہے لہٰذا تھوڑی تھوڑی شراب کے بجائے ایک دفعہ ہی میرے منہ سے شراب کا

مٹکا لنگا دو صہبا کی زحمت اور میری تشنگی دونوں مٹ جائیں گی مطلب کی بات کس لطیف انداز سے بیان کی ہے۔

رندانِ درِ مے کدہ گستاخ ہیں زاہد
زنہار نہ ہونا طرف ان بے اُدبوں سے

معنی۔ طرف۔ مقابل

فرماتے ہیں۔ میخانہ کے آس پاس جو رندوں کا جمگھٹا رہتا ہے۔ اے زاہد ان بے ادبوں کے منہ نہ لگنا یہ بڑے گستاخ لوگ ہوتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ان کے سامنے شراب کی بُرائی نہ کرنا ورنہ یہ آپ کی شان میں گستاخی کے مرتکب ہو جائیں گے۔

زاہد نہ چھیڑ اِن کو مستانے آدمی ہیں ؎ تجھ کو لپیٹ پڑیں گے دیوانے آدمی ہیں (داغ دہلوی)

بے دادِ وفا دیکھ! کہ جاتی رہی آخر
ہر چند مری جان کو تھا ربط لبوں سے

فرماتے ہیں۔ اے بیدادِ وفا دیکھو آخر میری جان میرے لبوں سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہو گئی۔ حالانکہ ان دونوں میں بڑا اُنس تھا۔ دونوں میں باہم ربط تھا مگر اے بیوفا تیری بے وفائی نے آج اس کو خاک میں ملا دیا۔

غزل ۱۳۲

تا ہم کو شکایت کی بھی باقی نہ رہے جا
سُن لیتے ہیں گو ذکر ہمارا نہیں کرتے

فرماتے ہیں۔ ہمارے محبوب کا یہ طریقہ ہے کہ اگر کوئی ان کی محفل میں ہمارا ذکر کرے تو وہ اس کو روکتے

نہیں سُن لیتے ہیں مگر اپنے آپ سے کبھی ہمارا ذکر کسی سے نہیں کرتے۔ منع اس لئے نہیں کرتے کہ ہمیں شکایت کا موقع نہ ملے۔

غالبؔ ترا احوال سُنا دیں گے ہم اُن کو
وہ سُن کے بُلا لیں، یہ اجارا نہیں کرتے

فرماتے ہیں۔ کیا خوب مقطع ہے۔ اے غالبؔ ہم کوئی موزوں وقت پا کر تیرا سب احوال تیرے محبوب کو سنا دیں گے مگر یہ ٹھیکہ نہیں لیتے کہ وہ ضرور تجھے بلالیں گے۔ اس پر ہمارا کوئی اختیار نہیں ہے

غزل ۱۳۳

گھر میں تھا کیا کہ ترا غم اُسے غارت کرتا
وہ جو رکھتے تھے ہم اِک حسرتِ تعمیر سو ہے

فرماتے ہیں۔ ہمارے گھر میں حسرتِ تعمیر کے علاوہ کوئی اثاثہ ہی نہ تھا۔ جسے تیرا غم برباد کرتا۔ ایک حسرتِ تعمیر تھی جو اُس کے دست بُرد سے محفوظ رہی۔ جیسا کہ دوسری جگہ فرماتے ہیں۔

ہوا ہوں عشق کی غارت گری سے شرمندہ
سوائے حسرتِ تعمیر گھر میں خاک نہیں (غالبؔ)

غزل ۱۳۴

غمِ دُنیا سے گر پائی بھی فرصت سر اُٹھانے کی
فلک کو دیکھنا، تقریب تیرے یاد آنے کی

فرماتے ہیں۔ غمِ دُنیا سے سر اُٹھانے کی فرصت جب کبھی ملی ہے۔ تو سر اُٹھاتے ہی فلک پر نظر پڑتی ہے۔ اور چونکہ فلک ہمیشہ سے جفا پیشہ مشہور ہے اس لئے فوراً ہی تیری جفائیں یاد آ کر نئے غم میں مبتلا کر دیتی ہیں۔ غرض یہ کہ ہمیں کسی حالت میں بھی چین نہیں ہے۔ کوئی نہ کوئی غم ہمیشہ دامنگیر رہتا ہے۔

کھُلے گا کس طرح مضموں مرے مکتوب کا یارب!
قسم کھائی ہے اُس کافر نے کاغذ کے جلانے کی

فرماتے ہیں۔ اے خدا میرے خط کا مضمون میرے محبوب پر کس طرح ظاہر ہو گا۔ کہ وہ میرے خط کو پڑھے مگر وہ کافر یہ کہاں کرنے والا ہے۔ دوسری صورت یہ ہو سکتی ہے کہ خط دیکھتے ہی اُس کو غصّہ آتا ہے اور وہ میرے خط کو آگ کی نذر کر دیتا ہے تو جلتے وقت خط کا مضمون نمایاں ہو جاتا تا میرے سوزِ عشق اور آتشِ فراق کا اُسے پتہ چل جاتا۔ مگر اس نے کاغذ کے جلانے کی قسم کھا رکھی ہے کہ کہیں اِن میں میرا مکتوب تو نہیں۔

لپٹنا پرنیاں میں شعلۂ آتش کا آساں ہے
ولے مشکل ہے حکمت دل میں سوزِ غم چھپانے کی

معنی: پرنیاں۔ ریشم کا کپڑا

فرماتے ہیں ۔ ریشم کے کپڑے میں شعلۂ آتش کا چھپانا ممکن ہوسکتا ہے لیکن سوزِ غم کو اپنے سینہ میں چھپائے رکھنا بہت مشکل ہے ۔ ایسی کوئی حکمت ہمیں معلوم نہیں کیونکہ سوزِ غم شعلۂ آتش کے مقابلہ میں بہت باغی و سرکش ہوتا ہے ۔ اور عاشق تو ریشم کے کپڑے سے بھی نازک ہے !

اُنہیں منظور اپنے زخمیوں کا دیکھ آنا تھا
اُٹھے تھے سیرِ گُل کو، دیکھنا شوخی بہانے کی

فرماتے ہیں ۔ کہ انہیں یعنی محبوب کو دلفگار، تیرِ نظر سے گھائل شدہ عشاق کو دیکھنا منظور تھا ۔ جو کہیں راہوں میں پڑے ہائے ہائے کرتے ہوں گے ۔ وہ اپنے اس شوق کا اظہار کھلم کھلا تو غیروں کے سامنے کیسے کرتے ۔ یہ کہہ دیا کہ ہم ذرا باغ کی سیر کو جاتے ہیں تاکہ وہاں گل ولالہ کا تماشا دیکھیں ۔ ان کے خیال میں دونوں یکساں درجہ رکھتے تھے اور یہ اُن کے بہانے کی شوخی ہے جسے حضرت غالب بھانپ گئے ۔

ہماری سادگی تھی التفاتِ ناز پر مرنا
ترا آنا نہ تھا ظالم مگر تمہید جانے کی

فرماتے ہیں ۔ ذرا ہماری سادگی یعنی بیوقوفی ملاحظہ کیجئے کہ ہم تیرے التفاتِ ناز پر خوشی سے جانثار کر رہے تھے اور تیرے التفات پر فریفتہ ہو رہے تھے ۔ مگر ظالم ترا آنا ، آنا نہ تھا بلکہ تو نے جانے کی تمہید باندھی تھی ۔ اسی وجہ سے آتے ہی چلا گیا تاہم اس کے فراق میں تڑپ تڑپ کر اپنے آپ کو گھلاتے رہیں ۔

لگد کوبِ حوادث کا تحمّل کر نہیں سکتی
مری طاقت کہ ضامن تھی بتوں کے ناز اُٹھانے کی

معنی ۔ نکد ۔ ٹھوکر ۔ دولتی ۔ حوادث ،حالات

فرماتے ہیں ۔ اب ہم ایسے نحیف و ناتواں ہو چکے ہیں کہ کسی بارِ حوادث کے اٹھانے کی نہ ہمت ہے نہ طاقت ۔ یا ایک وہ زمانہ تھا کہ ہم بُتوں کی ناز برداری میں ہمہ تن مصروف رہتے تھے اور ہمارے ذوق و شوق میں کوئی کمزوری واقع نہ ہوتی تھی ۔

کہوں کیا خُوبیٔ اوضاعِ ابنائے زماں غالبؔ
بدی کی اُس نے ، جس سے کی تھی ہم نے بارہا نیکی

فرماتے ہیں ۔ ابنائے زماں یعنی اس زمانے میں لوگوں کی وضع کچھ ایسی ہو گئی ہے کہ بیان کرتے ہوئے شرم آتی ہے ۔ آج کل یہ لوگ نیکی کا بدلہ بدی سے دیتے ہیں ۔ ہم نے جن لوگوں کے ساتھ بار بار نیکی کی اُن ہی لوگوں نے ہمارے ساتھ برائی کی ۔ خوبی کا لفظ طنزاً استعمال کیا ہے مطلب بُرائی ہے ۔

غزل ۱۳۵

حاصل سے ہاتھ دھو بیٹھ اے آرزو خرامی
دل جوشِ گریہ سے ہے ڈوبی ہوئی اسامی

معنی ۔ ڈوبی ہوئی اسامی ۔ وہ کاشتکار جو مال گزاری اور کسی کا قرض ادا نہ کر سکے ۔ اور وہ جواری جو ہمیشہ ہارتا ہو ۔ آرزو خرامی ۔ آرزومندانہ جستجو ۔ آرزو بمعنی ارمان

فرماتے ہیں ۔ اے آرزو خرامی تو اپنی دلی مراد سے ہاتھ دھولے اب تجھے دل سے کچھ حاصل نہ ہو گا لہٰذا تمام توقعات ترک کر دے وجہ اس کی یہ ہے کہ جوشِ گریہ گریہ کے اثر کو کھو بیٹھا ہے اور اب دل محض ایک ڈوبی ہوئی اسامی ہے جو اپنا قرض ادا کر سکتا ہے اور نہ مال گزاری ۔

اُس شمع کی طرح سے جس کو کوئی بجھا دے

میں بھی جلے ہوؤں میں ہوں داغِ ناتمامی

فرماتے ہیں ۔ میں اُس شمع کی مانند ہوں کہ جس کو کچھ جلنے کے بعد کوئی بجھا دے اور وہ محفل کو روشنی دینے میں ناکام رہ جائے ۔ میرا شمار بھی اُن جلے ہوؤں میں ہے کیونکہ میں بھی ایک داغِ ناتمام ہوں ۔ کاش میں پوری طرح بزم کو روشن کر سکتا ۔ یعنی جیسا دوسری جگہ فرماتے ہیں ۔
داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی ؛ اک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خموش ہے ۔

غزل ۱۳۶

کیا تنگ ہم ستم زدگاں کا جہان ہے — جس میں کہ ایک بیضۂ مور آسمان ہے

فرماتے ہیں ۔ کہ ہم ستم کے مارے ہوؤں کا جہان چیونٹی کے انڈے کے برابر ہے ۔ مطلب یہ ہے کہ مظلوم کی دُنیا سکڑ جاتی ہے ۔ سارا جہاں سمٹا ہوا نظر آتا ہے ۔ اس کا کوئی مددگار یا کوئی پوچھنے والا نہیں ہوتا اور سماج میں اُس کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی ۔

ہے کائنات کو حرکت تیرے ذوق سے — پرتو سے آفتاب کے ذرّے میں جان ہے

فرماتے ہیں ۔ چونکہ تو کائنات کا خالق ہے اور تو ہی اس کو قائم رکھے ہوئے ہے ۔ تیرا ہی ذوق اس کی حرکت یعنی زندگی ہے ۔ تیرے ہی سے کائنات کا کاروبار رواں دواں ہے ۔ تو اگر اپنا ذوق کم کر لے یا ایک گھڑی کے لئے ہٹا لے تو تمام کائنات ہست سے گزر کر نیستی میں چلی جائے ۔ جس طرح تیرے پیدا کیے ہوئے آفتاب کے پرتو سے زندگی کا ذرہ ذرہ روشنی پا رہا ہے ۔ اسی طرح اے میرے آفتاب ساری کائنات تیرا پرتو ہر وقت چاہتی ہے ۔

حالاں کہ ہے یہ سیلیِ خارا سے لالہ رنگ　　　غافل کو میرے شیشہ پہ مے کا گمان ہے

فرماتے ہیں۔ سنگِ خارا (زمانہ اہلِ زمانہ) سنگِ خارا کی تھپیڑوں یعنی زمانے کی گردش اور سختی نے میرے شیشہ کو لال کر دیا ہے مطلب خون ہو چکا ہے۔ غافل ناواقف یہ خیال کرتا ہے کہ شراب پی رکھی ہے۔ حالانکہ شیشہ خون کی شراب سے لبریز ہے اسی وجہ سے آنکھیں شراب سے نہیں خون کے آنسو بہانے سے سرخ ہیں۔ (شیشہ سے مراد یہاں آنکھیں ہیں)

کی اُس نے گرم سینۂ اہلِ ہوس میں جا　　　آوے نہ کیوں پسند کہ ٹھنڈا مکان ہے

فرماتے ہیں۔ اہلِ ہوس کے دلوں میں ہماری طرح آتشِ عشق نہیں بھڑکتی اسی وجہ سے محبوب نے اُن کے دلوں میں جگہ کر لی ہے کیونکہ ٹھنڈی جگہ رہنا ہر کوئی پسند کرتا ہے

کیا خوب تم نے غیر کو بوسہ نہیں دیا　　　بس چُپ رہو ہمارے بھی مُنہ میں زبان ہے

فرماتے ہیں۔ محبوب کے اس انکار پر کہ اُس نے غیر کو بوسہ نہیں دیا فرماتے ہیں کہ دیکھو ہمارا منہ نہ کھلواؤ ہمارے بھی منہ میں زبان ہے یعنی ہمارے پاس اس بات کا ثبوت موجود ہے کہ آپ نے غیر کو بوسہ دیا ہے۔

بیٹھا ہے جو کہ سایۂ دیوارِ یار میں　　　فرمانروائے کشورِ ہندوستان ہے

فرماتے ہیں۔ جس کو دیوارِ یار کا سایہ نصیب ہو جائے اس کا مرتبہ فرمانروائے ہندوستان سے کم نہیں۔ یعنی جو محبوبِ حقیقی کے سایہ عاطفت میں آ گیا اس کی نظر میں فرمانروائی کی کوئی حیثیت باقی نہیں رہتی

ہستی کا اعتبار بھی غم نے مٹا دیا　　　کس سے کہوں کہ داغ جگر کا نشان ہے

فرماتے ہیں۔ ہجومِ غم یعنی دنیا کے مصائب نے میرے جگر پر ایک زخم کاری لگا کر داغ ڈال دیا تھا اب جگر

ٹوٹ گیا صرف نشاں باقی رہ گیا ہے بتاؤ ایسی حالت میں زندگی کا اعتبار کیسے قائم رہ سکتا ہے

ہے بارے اعتمادِ وفاداری اس قدر   غالبؔ ہم اس میں خوش ہیں کہ نامہرباں ہے

فرماتے ہیں ۔ ہماری وفاداری پر ہمارے محبوب کو کامل یقین ہے اور وہ جانتا ہے کہ باوجود ہمارے نامہربان اور بے مہر ہونے کے وہ (یعنی غالب) ہماری محبت سے کبھی کنارہ کش نہیں ہوگا۔ بایں وجہ وہ دل کھول کر ہم پر ستم کر رہا ہے۔ ہمیں خوشی ہے کہ ہمارا محبوب ہم سے بالکل لاتعلق نہیں ہوگیا۔ پھر اُسی بے وفا پہ مرتے ہیں ؛ پھر وہی زندگی ہماری ہے (غالبؔ ؛

غزل ۱۳۷

دردسے میرے ہے تجھ کو بے قراری ہائے ہائے!

کیا ہوئی ظالم تری غفلت شعاری ہائے ہائے!

فرماتے ہیں یہ ساری غزل قطعہ بند ہے اور کسی محبوب کا مرثیہ معلوم ہوتی ہے. فرماتے ہیں (مرتے وقت دیکھ کر،) تیری حالتِ نزع دیکھ کر میں سخت دردمند رنجیدہ خاطر ہو رہا ہوں اور تو اس حالت میں بھی مجھے تڑپتا ہوا بے چین و بے قرار دیکھ کر اور بھی بے قرار ہو رہا ہے. تُو تُو غفلت شعار اور ستم شعار تھا یہ کیا ہوا. آج ایسی ہمدردی ۔ یہ تو مجھے تیرے بعد اور بھی ستائے گی ۔

تیرے دل میں گر نہ تھا آشوبِ غم کا حوصلہ

تو نے پھر کیوں کی تھی میری غم گساری ہائے ہائے

۔اے کاش تو نے میری غم خواری نہ کی ہوتی تجھے اس کا خیال نہ آیا ہوتا. تو نے میری غم خواری کر کے اپنے آپ کو رسوا کر لیا. مجھ سے محبت کی لیکن خود سے دشمنی مول لے لی. اب

رسوائی زمانہ کی وجہ سے اپنی جان دے رہا ہے ۔

عمر بھر کا تو نے پیمانِ وفا باندھا تو کیا
عمر کو بھی تو نہیں ہے پائیداری ہائے ہائے!

فرماتے ہیں ۔ تو نے ساری عمر وفاداری سے ملتے رہنے کا عہد باندھا تو کیا فائدہ اب تیری عمر نے ہی تجھ سے وفا نہ کی، عمر کس کی پائیدار ہوئی ہے تو مجھے چھوڑ کر بے قرار تڑپتا ہوا اس دنیائے فانی سے جا رہا ہے۔ افسوس صد افسوس ۔

زہر لگتی ہے مجھے آب و ہوائے زندگی
یعنی تجھ سے تھی اسے ناسازگاری ہائے ہائے!

فرماتے ہیں۔ مجھے اب یہ زندگی بہت بری لگتی ہے کیونکہ یہ تیرے لئے سازگار نہیں تھی ۔ میں تو ایسی زندگی سے موت کو بہتر خیال کرتا ہوں ۔ یہ بہت بے وفا ہے

گل فشانی ہائے نازِ جلوہ کو کیا ہو گیا
خاک پر ہوتی ہے تیری لالہ کاری ہائے ہائے!

فرماتے ہیں ۔ تیرے ناز و انداز کے جلوے کیا ہوئے جن سے پھول جھڑا کرتے تھے اور اب یہ وقت آیا ہے کہ ہم تیری قبر پہ پھول رکھ کر لالہ کاری کر رہے ہیں ۔

شرمِ رسوائی سے جا چھپنا نقابِ خاک میں

ختم ہے الفت کی تجھ پر پردہ داری ہائے ہائے!

فرماتے ہیں۔ رسوا ہو جانے کی شرم سے تو نے اپنے آپ کو زمین کا پیوند بنا لیا اور اپنے چہرے پر خاک کی نقاب ڈال لی۔ تجھ سے زیادہ عشق و محبت کی پردہ داری کرنے والا اور کون ہو سکتا ہے۔ تجھ پر یہ بات ختم ہو گئی۔

خاک میں ناموسِ پیمانِ محبّت مِل گئی

اُٹھ گئی دُنیا سے راہ و رسمِ یاری ہائے ہائے!

فرماتے ہیں۔ تیرے اس دارِ فانی سے چلے جانے سے پیمانِ محبت کی عزّت وآبرو بھی مر گئی۔ اب تیرے جیسا محبوب کبھی دنیا میں نہیں آئے گا۔ راہ و رسمِ یاری بھی تیرے ساتھ ہی رخصت ہو گئی۔

ہاتھ ہی تیغ آزما کا کام سے جاتا رہا

دل پہ اک لگنے نہ پایا زخمِ کاری ہائے ہائے!

فرماتے ہیں۔ ہائے افسوس کہ دستِ قاتل اپنا کام کرنے سے پہلے ہی ناکارہ ہو گیا میری تو خواہش تھی کہ حسبِ مراد تیری تلواروں کے خوب زخم اپنے دل جگر پر کھاؤں لیکن یہ میری تمنا اُدھوری ہی رہ گئی مطلب یہ کہ تیرے ناز و انداز سے جی بھر کے لطف اندوز نہ ہو پایا۔

کس طرح کاٹے کوئی شب ہائے تارِ برشگال

ہے نظر خُو کردہ اختر شماری ہائے ہائے!

فرماتے ہیں۔ ہم تو عادی ہو چکے تھے کہ برسات کی راتوں میں تیرے انتظار کی گھڑیاں اور فراق کی راتیں رو رو کر کاٹیں۔ اب ہم کس طرح آنے والی برسات کی راتیں کاٹیں گے۔ غم کو شب ہائے تار سے تشبیہ دی ہے اور برشگال رونے کا استعارہ استعمال کیا ہے۔ رو لینے تارے گننے کے ایک چارہ ہی کیا ہے۔

گوش مہجورِ پیام و چشم محرومِ جمال
ایک دل تس پر یہ نا اُمیدواری ہائے ہائے!

فرماتے ہیں۔ کان تو پیامِ یار سننے سے مہجور ہو گئے ہیں اور آنکھوں کو جمالِ یار کے نظارے سے محروم کر دیا گیا ہے۔ میرے ایک چھوٹے سے دل پر یہ دو زبردست بلائیں نازل کر دی گئی ہیں۔

عشق نے پکڑا نہ تھا غالبؔ ابھی وحشت کا رنگ
رہ گیا تھا دل میں جو کچھ ذوقِ خواری ہائے ہائے!

فرماتے ہیں۔ غالبؔ میرے عشق نے ابھی وحشت کا رنگ نہیں پکڑا تھا یعنی درجۂ کمال کو نہ پہنچا تھا اور نہ ہی، حالتِ جنون نے گھیرا تھا یعنی صحرا نوردی بھی شروع نہ ہوئی تھی کہ میرے محبوب نے رسوائی کے خوف سے اپنی جان دے دی۔ حالانکہ میرے دل میں، ذوقِ خواری پوری طرح موجزن ہونے نہ پایا تھا۔

غزل ۱۳۸

سرگشتگی میں عالمِ ہستی سے یاس ہے
تسکیں کو دے نوید کہ مرنے کی آس ہے

فرماتے ہیں۔ سرگشتگی کے سبب سے زندگی سے دل بھر گیا تھا اور میں نا اُمید ہو گیا تھا۔ اب تسکین کو

خوشخبری دینی چاہیئے کہ زندگی کا خاتمہ ہوتے ہی اپنی سرگردانی سے کلی طور پر نجات مِل جائے گی جس سے سکون حاصل ہو جائے گا ۔: معنی سرگشتگی جوشِ وحشت ، پریشانی ، سرگردانی ۔

لیتا نہیں مرے دلِ آوارہ کی خبر

اب تک وہ جانتا ہے کہ میرے ہی پاس ہے

فرماتے ہیں ۔ میرا محبوب میرے آوارہ دل کی خیر خبر نہیں لیتا حالانکہ اس آوارہ کو میں کب سے کھو چکا ہوں لیکن میرے محبوب کو یہی یقین ہے کہ وہ میرے ہی پاس ہے ۔

کیجے بیاں سرورِ تپِ غم کہاں تلک

ہر مُو مرے بدن پہ زبانِ سپاس ہے

فرماتے ہیں ۔ سرورِ تپِ غمِ عشق کا کہاں تک بیان کردں ۔ یہ خوشی ایسی ہے جو ختم نہیں ہوتی مطلب یہ ہے کہ میرے بدن کا رُواں رُواں سرورِ غم دینے والے کا شکریہ ادا کر رہا ہے

ہے وہ غرورِ حُسن سے بیگانۂ وفا

ہر چند اُس کے پاس دلِ حق شناس ہے

فرماتے ہیں ۔ میرا حق شناس دل کب کا اس کے پاس پہنچ چکا ہے جو ہر وقت اُسے وفاداری کا سبق پڑھاتا ہے ۔ مگر وہ اپنے غرورِ حسن کی وجہ سے اس قدر بے پرواہ ہے کہ سُنی اَن سُنی ایک کر دیتا ہے ۔ اسی وجہ سے وہ آج تک بیگانۂ وفا ہے اور جانتا ہی نہیں کہ وفا کس چڑیا کا نام ہے ۔

پی جس قدر ملی شبِ مہتاب میں شراب

اس بلغمی مزاج کو گرمی ہی راس ہے

فرماتے ہیں ۔ شبِ مہتاب میں جس قدر شراب مُیسّر آتی ہے بغرضِ علاج پی لیتا ہوں چونکہ میرا مزاج بلغمی ہے اور بلغم کی شدت میں شراب سے کمی آ جاتی ہے اور میرے لئے مفید ہے۔ شبِ مہتاب ٹھنڈی ہونے کی وجہ سے شراب کی حدت کم کرتی ہے اور شراب کے نقصانات سے بچاتی ہے ۔

ہر اک مکان کو ہے مکیں سے شرف اسدؔ
مجنوں جو مر گیا ہے تو جنگل اُداس ہے

فرماتے ہیں ۔ اے اسد ہر ایک مکان کو اس کے رہنے والوں کی نسبت سے شرف حاصل ہوتا ہے جب سے مجنوں مر گیا ہے جنگل بھی اُداسی کا شکار ہے مطلب یہ ہے حقیقی جنونِ عشق کسی کسی کو حاصل ہوتا ہے۔ صحرا کو بھی مجنوں کی موجودگی سے جو امتیاز حاصل تھا۔ اس کے مرنے کے بعد وہ اس امتیاز سے محروم ہو گیا۔

غزل ۱۲۹

گر خامشی سے فائدہ اخفائے حال ہے — خوش ہوں کہ میری بات سمجھنی محال ہے

فرماتے ہیں ۔ اگر خاموش رہنے سے یہ فائدہ ہوتا ہے کہ دل کا حال کسی پر ظاہر نہیں ہوتا تو یہ میرے لئے خوشی کی بات ہے۔ کہ میرا کہنا نہ کہنے کے برابر ہے۔ اکثر لوگ میرا کلام نہیں سمجھتے ۔

کس کو سناؤں حسرتِ اظہار کا گلہ ؛ — دل فردِ جمع و خرچِ زباں ہائے لال ہے

فرماتے ہیں ۔ بہت کچھ سنانے کے لئے تھا مگر لوگ سمجھتے نہیں ناچار زبان لال ہے یعنی کچھ کہتا نہیں اور

نہ کہنے سے حسرت اظہار کا گلہ ہے۔ مگر گلہ شکوہ بھی کس سے کروں۔ جانتا تو بہت کچھ ہوں یعنی آمد ہے خرچ نہیں اس تمام کا حساب دل رکھتا ہے جو فرد جمع و خرچ کا نعم البدل بنا ہوا ہے۔

کس پردے میں ہے آئنہ پرداز اے خدا ! رحمت کہ عذر خواہ لب بے سوال ہے

فرماتے ہیں اے خدا کس پردے میں چھپی ہوئی تیری رحمت آئینہ پرداز ہے یعنی آئینہ کو صیقل کر رہی ہے۔ اُسے تو ظاہر ہو جانا چاہیئے۔ میرا لب بے سوال عذر خواہ معصیت ہے یعنی شرم کی وجہ سے میرے لب سوال نہیں کرتے کہ تیری تجلی جلوہ گر ہو۔ (آئینہ پرداز۔ جلوہ گر۔ جلوہ فرما

ہے ہے خدانخواستہ وہ، اور دشمنی اے شوقِ منفعل ! یہ تجھے کیا خیال ہے

معنی۔ منفعل۔ شرمسار، اثر قبول کرنے والا۔

فرماتے ہیں۔ اے شوقِ منفعل تو جو اس خیال سے اثر لے رہا ہے کہ اُس شوخ نے تیرے ساتھ دشمنی کی ہے یا وہ آئندہ کرے گا۔ خدانخواستہ وہ ایسا جرم کیوں کرنے لگا ہے۔ یہ تیرا خیالِ خام ہے۔

مشکیں لباسِ کعبہ علیؓ کے قدم سے جان نافِ زمیں ہے نہ کہ نافِ غزال ہے

فرماتے ہیں۔ (یہ شعر حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی منقبت میں ہے) یہ غلافِ کعبہ جو کہ مشکیں یعنی سرمگیں رنگ کا ہے۔ اس کو نافِ غزال کی مشک نے سرمگیں نہیں کیا ہے بلکہ حضرت علی رضی اللہ تعالےٰ عنہ کے قدموں کے اثر سے ہوا ہے۔ اس شعر میں ان دونوں واقعات کی طرف اشارہ ہے کہ اوّل آپ خانہ کعبہ میں پیدا ہوئے۔ دوئم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم کے کاندھوں پر چڑھ کر خانہ کعبہ کو بتوں سے پاک کیا تھا۔

وحشت پہ میری عرصۂ آفاق تنگ تھا — دریا زمین کو عرقِ انفعال ہے

فرماتے ہیں ۔ میرے جنونِ عشق کے لئے دُنیا کا میدان بہت تنگ تھا ۔ یہی وجہ ہے کہ زمین اس کمزوری کی وجہ سے عرقِ انفعال میں ڈوبی رہتی ہے ۔ یعنی ندامت کے پسینہ میں

ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسدؔ — عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے

فرماتے ہیں ۔ دنیا محض ایک دھوکہ ہے ۔ اس کے فریب میں آنا نہیں چاہیے ۔ کیونکہ یہ دنیا ایک دن فنا ہونے والی ہے

غزل ۱۴۰

تم اپنے شکوے کی باتیں نہ کھود کھود کے پوچھو
حذر کرو مرے دل سے کہ اس میں آگ دبی ہے

فرماتے ہیں ۔ میرے دل میں شکایتیں بھری پڑی ہیں جس طرح چولہے میں آگ دبی پڑی رہتی ہے ۔ اگر اس کو کریدو گے تو آگ بھڑک اُٹھے گی ۔ لہٰذا تم مجھ سے اپنی شکایتیں کھود کھود کر نہ پوچھو ورنہ یہ آگ بھڑک اُٹھے گی ۔ اور دل کی باتیں دُشمنی کی آگ میں تبدیل ہو جائیں گی ۔

دلا یہ دردِ الم بھی تو مُغتنم ہے کہ آخر
نہ گریۂ سحری ہے نہ آہِ نیم شبی ہے

فرماتے ہیں ۔ اے میرے دل درد و غم کو بھی غنیمت جان کہ جب یہ نہ ہوگا تو زندگی بھی نہ ہوگی ۔ پھر نہ گریۂ سحری باقی رہے گا اور نہ آہِ نیم شبی ۔ (معنی مغتنم ، غنیمت ہے)

غزل ۱۴۱

ایک جا حرفِ وفا لکھا تھا وہ بھی مٹ گیا
ظاہرا کاغذ ترے خط کا غلط بردار ہے

معنی۔ غلط بردار۔ وہ کاغذ جس پر سے حروف مٹائے جا سکیں یا خود مٹ جائیں۔

فرماتے ہیں۔ آپ نے اپنے خط میں ایک جگہ حرفِ وفا لکھا تھا وہ بھی مٹ گیا۔ اس سے پتہ چلا کہ آپ کے خط کا کاغذ غلط بردار ہے۔ مطلب یہ ہے کہ آپ نے سچے دل سے حرفِ وفا نہیں لکھا تھا اس لئے وہ خود بخود ہی مٹ گیا۔

جی جلے ذوقِ فنا کی ناتمامی پر نہ کیوں
ہم نہیں جلتے نفس ہر چند آتش بار ہے

فرماتے ہیں۔ ہمارا ذوقِ فنا کیا ہے۔ فنا فی اللہ ہونا اور اس کی راہ میں اپنے آپ کو فنا کرنا۔ مگر باوجود اس ذوقِ فنا کے، ابھی تک یہ حاصل نہیں ہوا۔ اس ناتمامی اور ناکامی پر ہمارا دل ہر وقت جلتا رہتا ہے۔ یہ رنج و ملال ہمیں کھائے جاتا ہے۔ بعینہٖ یہی حالت ظاہر میں بھی ہے کہ ہم سانس لیتے ہیں جس میں آکسیجن ہے جو داخل ہو کر ہمارے جسم کے انجن کو چلاتی ہے۔ خوب آگ بھڑکاتی ہے مگر ہم جل نہیں جاتے۔ ہر چند کہ ہر سانس آتش بار ہے۔

آگ سے پانی میں بجھتے وقت اٹھتی ہے صدا
ہر کوئی درماندگی میں نالہ سے ناچار ہے

فرماتے ہیں۔ آگ شور و غوغا کرنے والی شے نہیں ہے مگر اس کو پانی میں ڈالیں تو ایک آواز اس کے بجھتے وقت نکلتی ہے اس سے پتہ چلا کہ زندگی سب کو پیاری ہے اور مصیبت کے وقت ہر کوئی مجبور ہو جاتا ہے کہ نالہ و فریاد کرے۔

ہے وہی بدمستی ہر ذرہ کا خود عذر خواہ
جس کے جلوے سے زمیں تا آسماں سرشار ہے

معنی۔ عذر خواہ۔ معافی چاہنے والا

فرماتے ہیں۔ ذرے ذرے کی بدمستی و غفلت کا معذرت چاہنے والا خود خالق مطلق ہے جس کے

جلوؤں کی تابانی سے زمین و آسمان سب سرشار ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اُس کی رحمت خود ہی تقاضا کرتی ہے کہ وہ اپنی مخلوق پر رجوع بہ رحمت ہو۔ اس کی رحمت ہر شے کو اپنے اندر لپیٹ لے گی۔

مجھ سے مت کہہ تو ہمیں کہتا تھا اپنی زندگی"

زندگی سے بھی مرا جی اِن دنوں بیزار ہے

فرماتے ہیں۔ تو مجھ سے یہ مت کہہ کہ تو تو شدتِ محبت میں ہم کو اپنی زندگی قرار دیتا تھا تو جان لے کہ وہ وقت گزر گیا مجھے اُس وقت اپنی زندگی بہت پیاری تھی۔ اب تو میں اپنی زندگی سے ہی بہت بیزار ہوں۔ مطلب یہ ہے کہ جب انسان خود اپنی زندگی سے ہی بیزار ہو جائے تو اُسے کوئی چیز اچھی نہیں لگتی چاہے وہ محبوب (مجازی) ہی کیوں نہ ہو۔ کیا خوب کسی نے کہا ہے۔ جان ہے تو جہان ہے۔

آنکھ کی تصویر سرنامہ پہ کھینچی ہے کہ تا

تجھ پہ کھُل جائے کہ اُس کو حسرتِ دیدار ہے

فرماتے ہیں۔ میں نے خط کے لفافہ پہ آنکھ کی تصویر بنا دی ہے تاکہ محبوب یہ بات سمجھ جائے کہ میری آنکھیں اس کی دید کی منتظر ہیں اور میں دل میں حسرتِ دیدار لئے بیٹھا ہوں۔

غزل ۱۴۲

پینس میں گزرتے ہیں جو کوچے سے وہ میرے

کندھا بھی کہاروں کو بدلنے نہیں دیتے

فرماتے ہیں۔ اگر کبھی میرا محبوب میری گلی سے گزر کر کہیں جاتا ہے تو کہاروں کو کندھا تک بدلنے کی

اجازت نہیں دیتا۔ مجھ سے نفرت سہی لیکن میری گلی نے اُن کا کیا بگاڑا ہے۔
دوسرے معنی یہ بھی ممکن ہیں کہ وہ اپنی دید کا ہمیں ذرا سا بھی موقعہ نہیں دینا چاہتے۔ کہ کہیں کہاروں کے کندھا بدلتے وقت ہم ان کی پالکی کا نظارہ نہ کرلیں۔

غزل ۱۴۲

مری ہستی فضائے حیرت آبادِ تمنّا ہے
جسے کہتے ہیں نالہ وہ اسی عالم کا عنقا ہے

فرماتے ہیں۔ میرا وجود میری ہستی (یعنی انسان کا) مقامِ حیرت کی تمنّا لئے ہوئے ہے۔ اور اسی لئے یہ نالہ و فریاد اسی ہستیِ عالم کا ایک موہوم پرندہ ہے جسے عنقا کہتے ہیں۔
مطالب شعر کا یہ ہے کہ ہر انسان کسی نہ کسی طرح اپنے خالق کو دیکھے اور مقامِ حیرت کو آباد کرنے والا بن جائے۔ اسی لئے وہ اپنی زبان سے اپنے حال سے نالہ و فریاد کر رہا ہے۔ مقام حیرت، وہ مقام ہے جہاں طالب کو مطلوب کی تجلّی ہوتی ہے۔

وفائے دلبراں ہے اتفاقی، ورنہ اے ہمدم
اثر فریادِ دل ہائے حزیں کا کس نے دیکھا ہے

فرماتے ہیں کسی معشوق کا وفادار ہونا ایک اتفاقی امر ہے۔ اے ہمدم بایں وجہ ہم نالہ و فریاد کے اثر کے قائل ہی نہیں ہیں۔ معشوق عاشق کی محبت اور نالہ و فریاد سے ہاتھ نہیں آتا۔

خزاں کیا، فصلِ گُل کہتے ہیں کس کو؟ کوئی موسم ہو
وہی ہم ہیں، قفس ہے اور ماتم بال و پَر کا ہے

زبانِ بُلبل سے فرماتے ہیں۔ کیسی خزاں کہاں کی فصلِ گل کوئی موسم ہو۔ ہم تو قفس میں اپنے بال و پر کا ماتم کر رہے ہیں۔ ہماری حالت میں کسی وقت کسی موسم میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔ ہمیں ایک ہی کام ہے کہ اپنے بال و پر کا ماتم کرتے رہیں۔

نہ لائی شوخیٔ اندیشہ تابِ رنجِ نومیدی
کفِ افسوس ملنا عہدِ تجدیدِ تمنّا ہے

فرماتے ہیں ۔ میرے غور و فکر کی شوخی ۔ ناامیدی کے رنج و ملال کی تاب نہ لاسکی ۔ اس لئے تجدیدِ تمنا کے لئے میں کفِ افسوس ملتا ہوں یعنی دوبارہ اپنی امید کو دل میں قائم کرتا ہوں مطلب یہ ہے کہ میں جو عالمِ یاس میں کفِ افسوس ملتا ہوں وہ میں اپنی تمنا کی تجدید کرتا ہوں جیسے کوئی بیعت کر کے اپنے ایمان کا اعادہ کرتا ہے ۔

نہ مجھے گل ہوں نہ رنگینیٔ بہار ہوں میں ؛ صبا کی طرح پریشان و بے قرار ہوں میں (سیماب)

غزل ۱۴۴

رحم کر ظالم، کہ کیا بودِ چراغِ کُشتہ ہے
نبضِ بیمارِ وفا دُودِ چراغِ کُشتہ ہے

معنی ۔ دودِ چراغِ کُشتہ (بیمارِ وفا) استعارہ ۔ بجھے ہوئے چراغ کا دھواں

فرماتے ہیں ۔ رحم کر ظالم بیمارِ وفا پر ۔ میری ہستی ہی کیا ہے ۔ میری تو نبض بھی دودی ہو چکی ہے مطلب یہ ہے کہ میری تو نبض بھی بجھے ہوئے چراغ کے دھوئے کی مانند ہو چکی ہے ۔

دل لگی کی آرزُو بے چین رکھتی ہے ہمیں
ورنہ یاں بے رونقی سودِ چراغِ کُشتہ ہے

فرماتے ہیں ۔ دل لگی کی آرزو ہمیں بے چین رکھتی ہے جس طرح چراغ کی رونق اُس کی روشنی جلنے سے ہے مگر جتنا وہ جلتا ہے اس کا تیل اور بتی جل کر دھواں بن جاتی ہے اور جب چراغ نہیں جلتا تو چراغ کی بے رونقی چراغ کے لئے مفید ہے ۔

غزل ۱۴۵

چشمِ خوباں خامشی میں بھی نوا پرداز ہے
سُرمہ تو کہوے کہ دُودِ شعلۂ آواز ہے

فرماتے ہیں حسینوں کی آنکھیں خاموشی میں بھی باتیں کرتی ہیں اور اپنے چاہنے والوں کو محبت بھرا پیام دیتی نظر آتی ہیں چونکہ جو سرمہ و کاجل اپنی آنکھوں میں وہ لگاتی ہیں وہ شعلۂ آواز کا دھواں ہے اور اس ذریعے سے وہ اپنے چاہنے والوں تک اپنا پیام خاموشی کے ساتھ پہنچا دیتی ہیں۔ اسی وجہ سے اُن کے سرمہ کو قوتِ گویائی نصیب ہوتی ہے۔

پیکرِ عشّاق، سازِ طالعِ ناساز ہے
نالہ گویا گردشِ سیّارہ کی آواز ہے

فرماتے ہیں۔ پیکرِ عشّاق یعنی عاشقوں کے بدن بدنصیبی کے ساز ہیں جس کی وجہ سے وہ نالہ و فریاد کرتے ہیں۔ اور اُن کے نالے بدبخت ستاروں کی آواز ہے۔

دستگاہِ دیدۂ خُونبارِ مجنوں دیکھنا
یک بیاباں جلوۂ گُل فرشِ پا انداز ہے

فرماتے ہیں۔ مجنوں کے دیدۂ خونبار کی دستگاہ ملاحظہ کیجئے کہ اس نے کس طرح بیاباں (جلوۂ گل) کو فرشِ پا انداز بنا دیا ہے کہ میلوں میل تک بیاباں جلوۂ گل کا نظارا پیش کر رہا ہے۔

صحرا میں بھی گُل کھلتے ہیں آتی ہیں بہاریں ؛ موسم کا اثر وقفِ گلستاں نہیں ہوتا
(آزردہ دہلوی)

غزل ۱۴۶

عشق مجھ کو نہیں وحشت ہی سہی　　میری وحشت تری شہرت ہی سہی

فرماتے ہیں۔ کہ تو میرے عشق کا قائل نہیں ہے اور بقول تیرے مجھے تجھ سے عشق نہیں ہے وحشت ہے مگر میرے اس دعوئ عشق سے تیرے حسن کی شہرت خوب ہو رہی ہے۔

قطع کیجیے نہ تعلق ہم سے　　کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی

فرماتے ہیں۔ تم ہم سے قطع تعلق نہ کرو کسی نہ کسی قسم کا تعلق تو رہنا چاہیئے۔ تم اگر اپنے دل میں ہمارے لئے لگاؤ، محبت نہیں پاتے نہ سہی، ہم تمھاری دشمنی کو بھی غنیمت خیال کریں گے بلکہ عزیز رکھیں گے۔

میرے ہونے میں ہے کیا رسوائی؛　　اے وہ مجلس نہیں خلوت ہی سہی

فرماتے ہیں کہ اگر آپ مجلس میں مجھ سے ملنا باعثِ رسوائی خیال کرتے ہیں تو کوئی مضائقہ نہیں: آپ ہم سے چھپ کر خلوت میں ملیں۔ یا اس کے برعکس آپ مجلس میں مجھ سے ملیں اگر خلوت میں اپنی رسوائی سمجھتے ہو۔

ہم بھی دشمن تو نہیں ہیں اپنے　　غیر کو تجھ سے محبت ہی سہی

فرماتے ہیں۔ آپ کو غیر کی محبت کا یقین ہے آپ اُسے سچا عاشق سمجھتے ہیں تو سمجھو پھر ہم اپنا وقت کیوں ضائع کریں۔ ہم اپنا نقصان کیوں کریں۔ آخر ہم اپنے دشمن تو نہیں۔

محبت ہے تو غم کھانا پڑے گا ؛ ہر اک طوفان سے ٹکرانا پڑے گا　(صادق دہلوی)

اپنی ہستی ہی سے ہو جو کچھ ہو آگہی گر نہیں غفلت ہی سہی

فرماتے ہیں ۔ اپنے آپ کو جاننا ضروری ہے اپنی صلاحیتوں کا محاسبہ کرنا عرفانِ الٰہی میں مددگار و معاون ہوگا۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔" من عرف نفسہٗ فقد عرف ربہٖ جس نے اپنے آپ کو اپنے نفس کو جان لیا اُس نے اپنے رب کو پہچان لیا۔ اور خود اپنی ہستی کو متعلقہ کاموں میں لگانے سے یا تو آگہی یعنی علم حاصل ہوگا یا کم از کم غفلت یعنی ناکامی کی وجہ سے تجربہ حاصل ہوگا اور ہم آئندہ احسن طریق سے وہ کام کر سکیں گے ۔

عمر ہر چند کہ ہے برقِ خرام دل کے خون کرنے کی فرصت ہی سہی

فرماتے ہیں ۔ عمر کی تیز رفتاری واقعی بجلی کی چمک کے مانند ہے۔ پھر بھی دل کے خون کرنے کی فرصت اگر مل جائے تو وہ بھی غنیمت ہے ۔

ہم کوئی ترکِ وفا کرتے ہیں نہ سہی عشق مصیبت ہی سہی

فرماتے ہیں ۔ ہم وہ عاشق نہیں ہیں کہ عشق کی تکلیفوں سے گھبرا کر ترکِ وفا کر بیٹھیں۔ عشق اگر مصیبت بھی بنے تو پھر بھی عشق ہے۔ جو لذتِ عشق کے دلدادہ ہیں وہی اُس کی قدر جانتے ہیں ۔

کچھ تو دے اے فلکِ ناانصاف آہ و فریاد کی رخصت ہی سہی

فرماتے ہیں ۔ اے فلکِ ناانصاف کچھ تو دے اگر میری امید بر نہیں آتی تو نہ سہی کم از کم فریاد کی مہلت تو دے ۔

ہم بھی تسلیم کی خو ڈالیں گے بے نیازی تری عادت ہی سہی

فرماتے ہیں ۔ ہم بھی کوشش کر کے اور اپنی طبیعت پر جبر کر کے رفتہ رفتہ تسلیم و رضا کی عادت پیدا کر لیں گے۔

یار سے چھیڑ چلی جائے اسدؔ   گر نہیں وصل تو حسرت ہی سہی

فرماتے ہیں ۔ تعلق رہنا ضروری ہے چاہے دل لگی کی خاطر سے ہی ہو اگر وصل نصیب نہ ہو نہ سہی حسرتِ اظہارِ وصل میں بھی ایک لذت ہے ۔

غزل ۱۴۷

ہے آرمیدگی میں نکوہش بجا مجھے
صبحِ وطن ہے خندۂ دنداں نما مجھے

معنی ۔ آرمیدگی ، بحالتِ آرام ، نکوہش ، ملامت ، سرزنش

فرماتے ہیں ۔ آرام سے پڑے رہنے کی وجہ سے میں سرزنش کا سزاوار ہوں ۔ اسی لیے ہر صبحِ وطن مجھے ایک ہی حالت میں پا کر میرا تمسخر اڑاتی ہے (صبح وطن یعنی ایک ہی حالت پر قیام) مطلب یہ ہے مجھے عبادت کرنی چاہیے ۔ اس شاہدِ حقیقی کی طلب میں جستجو کرنی چاہیئے تا مقصدِ حیات پورا ہو۔

ڈھونڈے ہے اُس مُغنّیِ آتش نفس کو جی
جس کی صدا ہو جلوۂ برقِ فنا مجھے

فرماتے ہیں ۔ میرا دل ایسے مُغنّی کو ڈھونڈتا رہتا ہے جس کا آتشیں نغمہ میری ساری خواہشات کو بجلی بن

کر آنا فنا یا جلا کر راکھ کر دے اور اس فنا کے بعد مجھے ایک نئی زندگی نصیب ہو یعنی وہ ایک کامل فنا فی اللہ ہو۔

مستانہ طے کروں ہوں رہِ وادیِ خیال

تا بازگشت سے نہ رہے مُدّعا مجھے

فرماتے ہیں ۔ اپنے خیالوں کی وادی میں مستانہ وار راستہ طے کر رہا ہوں ۔ تاکہ مجھے پلٹ کر واپس آنے سے کوئی مطلب کوئی غرض نہ رہے ۔ (بازگشت لوٹنا۔ پلٹنا)

کرتا ہے بس کہ باغ میں تو بے حجابیاں

آنے لگی ہے نکہتِ گُل سے حیا مجھے

فرماتے ہیں ۔ باغِ دُنیا میں تو نے اپنے آپ کو بے حجاب کر رکھا ہے یعنی یہاں کی ہر اک شے میں تیرا جلوہ بڑی شان و شوکت سے ظاہر ہو رہا ہے ۔ یہ سب کچھ دیکھ کر مجھے بھی نکہتِ گُل سے حیا آنے لگی ہے ۔ مطلب یہ ہے کہ میرا دل بھی ان جلووں کو محسوس کرنے لگا ہے ۔

کھُلتا کسی پہ کیوں مرے دل کا معاملہ

شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے

فرماتے ہیں ۔ میرے دل کا معاملہ یعنی رازِ عشق کسی پہ کیوں ظاہر ہوتا مگر شعروں کے انتخاب نے سارے زمانہ کو میرے خیالات سے آگاہ کر دیا ۔ اور اس طرح میری شہرت رسوائی کی حد تک پہنچ گئی ۔

ہم طالبِ شہرت ہیں ہمیں ننگ سے کیا کام ؛ بدنام اگر ہوں گے تو کیا نام نہ ہوگا

(شیفتہ)

غزل ۱۴۸

زندگی اپنی جب اس شکل سے گذری غالب
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

فرماتے ہیں ۔ اے غالب اگر زندگی ایسے ہی مصائب اور تکلیفوں کے ساتھ گزرتی رہی تو ہم کسی سے کس طرح کہہ سکیں گے کہ ہمارا خدا بہت رحیم و کریم ہے بڑے افضال کرنے والا ہے خداتعالی کے رحم کو جذب کرنے کے لیے یہ انداز بیان اختیار کیا ہے نہ کہ بطورِ شکایت ۔

غزل ۱۴۹

اس بزم میں مجھے نہیں بنتی حیا کیے
بیٹھا رہا اگرچہ اشارے ہوا کیے

فرماتے ہیں ۔ اُس کی بزمِ ناز میں حیا ہوتے ہوئے کچھ بس نہیں چلا باوجودیکہ غیر سے اُن کے اشارے متواتر ہوتے رہے۔ مطلب یہ ہے کہ میں غیرت کے ساتھ چپ بیٹھا رہا ۔ جیسے کچھ ہوا ہی نہیں ۔

دل ہی تو ہے سیاستِ درباں سے ڈر گیا
میں، اور جاؤں در سے ترے بن صدا کیے

فرماتے ہیں ۔ میرا دل درباں کی سیاست سے خوفزدہ ہوگیا ۔ ورنہ یہ کہاں ممکن ہے کہ میں تیرے در سے

بغیر صدا کیے گزر جاؤں ۔ مطلب یہ ہے کہ کمزور دل والے بعض وقعہ صاحبِ اقتدار حکومت کے جابر حکمران کے ڈر سے اپنی آواز بلند نہیں کرتے ۔ اگر سیاسی دربانوں کا ڈر نہ ہو تو حق گو انسان ہر بات آزادی سے کرسکتا ہے ۔

رکھتا پھروں ہوں خرقہ و سجادہ رہنِ مے

مدت ہوئی ہے دعوتِ آب و ہوا کیے

فرماتے ہیں ۔ شراب کے بدلے اپنا خرقہ اور سجادہ گروی رکھتا پھرتا ہوں کیونکہ ایک عرصہ سے موسمِ بہار کی دعوت نہیں کی یعنی شراب نوشی نہیں کی ہے ۔

بے صرفہ ہی گزرتی ہے، ہو گرچہ عمرِ خضر

حضرت بھی کل کہیں گے کہ ہم کیا کیا کیے ؟

فرماتے ہیں ۔ انسان دُنیا کے دھندوں میں اس قدر پھنس جاتا ہے کہ جان چھڑائے نہیں چھوٹتی ۔ مقصدِ پیدائش جو خدا نے بتایا " وما خلقت الجن والانس الا لیعبدون " اس سے غفلت ہی رہتی ہے ۔ اور عمر کا یہ حال ہے کہ بے مصرف ہی گزرتی چلی جاتی ہے ۔ اگرچہ وہ حضرتِ خضر کی ہی عمر کیوں نہ ہو ۔ ان کی عمر کا بھی کچھ نہ کچھ حصّہ بیکار ضرور گزرے گا ۔ حضرتِ خضر بھی کل کہیں گے کہ ہم دُنیا میں کیا کرتے رہے ۔

مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ اے لئیم !

تو نے وہ گنج ہائے گرانمایہ کیا کیے ؟

فرماتے ہیں ۔ اگر مجھے ایسی قدرت ہو کہ میں خاک کی زبان میں بات کرسکتا ۔ تو میں ضرور ہی اس سے یہ پوچھتا کہ تو نے اُن قیمتی خزانوں کا کیا کیا ۔ مطلب یہ ہے کہ جو بڑے بڑے انسان تیری آغوش

میں آئے تو تُو نے اُن سب کو خاک میں ملا دیا۔ حتیٰ کہ اُن کا نشان بھی باقی نہ رہا۔

کس روز تہمتیں نہ تراشا کیے عدو

کس دن ہمارے سر پہ نہ آرے چلا کیے؟

فرماتے ہیں۔ وہ کون سا دن تھا کہ ہمارے دشمنوں نے ہم پر تہمتیں نہ باندھی ہوں اور تم نے اُن جھوٹی باتوں کو سچا سمجھ کر ہمارے سر پر ظلم وستم کے آرے نہ چلائے ہوں۔

صحبت میں غیر کی نہ پڑی ہو کہیں یہ خُو

دینے لگا ہے بوسہ بغیر التجا کیے

فرماتے ہیں۔ غیر کی صحبت میں تو کہیں اُس کو یہ عادت نہیں پڑی ہے کہ وہ بغیر مانگے بوسہ دینے لگا ہے اس وہم نے وصل کی خوشی کو غم میں بدل دیا اور ہم وصل سے لطف اندوز نہ ہو سکے۔ وائے قسمت۔

ضد کی ہے اور بات مگر خُو بُری نہیں

بھُولے سے اُس نے سینکڑوں وعدے وفا کیے

فرماتے ہیں۔ ضد کی اور بات ہے کہ وہ ہمارے ساتھ کوئی ناروا سلوک کرے۔ جب وہ اپنی ضد کو بھُول گیا تو سینکڑوں مرتبہ اُس نے اپنے وعدوں کو پورا کیا جس سے اس کی فطرت کا پتہ چلتا ہے کہ وہ بُری نہیں۔

غالبؔ تمہیں کہو کہ ملے گا جواب کیا؟

مانا کہ تم کہا کیے اور وہ سُنا کیے

فرماتے ہیں۔ اے غالبؔ ہم تسلیم کرتے ہیں کہ تم محبوب کو اپنی پریشان حالی سے آگاہ بھی کرتے رہو

گے اور وہ سنتا بھی رہے گا لیکن اُس کا جواب کیا ہوگا؛ صرف خاموشی ؎

یاں لب پہ سو ہزار سخن اضطراب میں
واں ایک خامشی مرے سب کے جواب میں

غزل ۱۵۰

رفتارِ عمر قطعِ رہِ اضطراب ہے — اس سال کے حساب کو برق آفتاب ہے

فرماتے ہیں۔ حالتِ اضطراب میں جو عمر گزرتی ہے اُس کا حساب شمسی کیلنڈر سے نہیں بلکہ برقی کلینڈر سے چاہیے کیونکہ ایک تو عمر کی رفتار بہت تیز ہے اور اُس پر طرّہ یہ ہے کہ حالتِ اضطراب میں ہے۔

مینائے مے ہے سروِ نشاطِ بہار سے — بالِ تدرو جلوۂ موجِ شراب ہے

معنی۔ تدرو۔ ایک قسم کا پرندہ

فرماتے ہیں۔ مینائے مے نشاطِ بہار کے سبب سے سرو یعنی محبوب کا مدِ مقابل ہوگیا ہے اور موجِ شراب کی لہریں تدرو پرندہ کے بال و پر کا منظر پیش کر رہی ہے۔

زخمی ہوا ہے پاشنہ پائے ثبات کا — نے بھاگنے کی گوں نہ اقامت کی تاب ہے

معنی۔ پاشنہ۔ ایڑی — گوں۔ مطلب، غرض، خواہش

فرماتے ہیں۔ عشق میں پائے ثبات کی ایڑی زخمی ہوگئی ہے نہ میں بھاگنے کے قابل ہوں اور نہ ہی کھڑا رہنے کی طاقت پاتا ہوں مطلب یہ ہے کہ میدانِ عشق میں جو بہت سے مصائب جھیلنے پڑتے

ہیں۔ اُن سے گھبرا کر انسان چاہتا ہے چھوڑ دے مگر ساتھ ہی اس کی دل کشی ایسی ہے کہ چھوڑنے کو دل بھی نہیں چاہتا۔

جادادِ بادہ نوشیٔ رنداں ہے شش جہت غافل گماں کرے ہے کہ گیتی خراب ہے

معنی۔ بادہ۔ شرابِ عرفان ، رنداں۔ عارف لوگ

فرماتے ہیں۔ (یہ شعر کھُلا کھُلا تصوف میں ہے) عارفوں کو بوجہ معرفت کے شش جہت یعنی ساری دنیا اپنی ہی جادۂ نظر آتی ہے۔ وہ رات دن صبح و شام شرابِ عرفان پیتے رہتے ہیں۔ اور خدا کی خدائی کے جلووں سے مسحور ہوتے رہتے ہیں اور وہ لوگ جو ذاتِ خداوندی سے غافل ہیں۔ یہ خیال کرتے ہیں کہ دُنیا خراب ہے مگر شرابِ عرفان نوش کرنے والے ہر بات میں ہر منظر میں تجلیاتِ الٰہی کے نظارے کرتے ہیں۔

نظّارہ کیا حریف ہو اُس برقِ حُسن کا جوشِ بہار جلوے کو جس کے نقاب ہے

معنی۔ حریف = ہم پیشہ، دشمن، مدِمقابل جوشِ بہار = نمودِ حسن، ظہورِ عالم

فرماتے ہیں۔ ظہورِ عالم ایک طرف شاہدِ حقیقی کے حُسن کی نمائش کر رہی مگر ساتھ ہی اس کو دیکھنے سے روک بھی رہی ہے اور وہ محبوبِ حقیقی کو چھپائے ہوئے بھی ہے یعنی اس کے لئے نقاب بنی ہوئی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ نظّارہ اُس برقِ حسن کا دشمن نہیں ہے بلکہ خود جوشِ بہار جلوہ ہی نقاب بنی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مخلوق پیدا کی اور خود پردے میں چھپ گیا۔ یہ مضمون بڑی شان کے ساتھ بیان کیا ہے۔

مَیں نامراد دل کی تسلّی کو کیا کروں مانا کہ تیرے رُخ سے نگہ کامیاب ہے

فرماتے ہیں۔ مَیں اپنے نامراد دل کی تسلی کس طرح کروں۔ مَیں یہ مانتا ہوں کہ تیرے رُخ کی کچھ جھلکیاں

دیکھ کر دل خوش ہے۔ مگر میرے دل کو تسلی جب ہی ہو سکتی ہے جب مجھے تیرا وصال حاصل ہو۔ دُور سے دیکھ لینا دل کی تسلّی کے لئے کافی نہیں۔

گزرا اسدؔ مسرتِ پیغامِ یار سے
قاصد پہ مجھ کو رشکِ سوال و جواب ہے

فرماتے ہیں۔ اے اسدؔ میں پیغامِ یار کی خوشی سے باز آیا چونکہ میں اگر قاصد کو پیغام دے کر بھیجوں گا وہ اُس سے شرفِ ہمکلامی پائے گا۔ مجھے یہ رشک مار ڈالے گا۔ لہٰذا یہی بہتر ہے کہ قاصد کا وسیلہ ہی نہ ہو۔

غزل ۱۵۱

دیکھنا قسمت کہ آپ اپنے پہ رشک آجائے ہے
مَیں اُسے دیکھوں، بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ہے

فرماتے ہیں۔ مَیں اپنی بدنصیبی کا کیا کہوں کہ مجھے اپنے آپ پر رشک آتا ہے۔ اور میں حالتِ رشک میں اُسے کس طرح دیکھ سکتا ہوں۔ (کہتے ہیں کہ انتہائے محبت میں بدگمانی ہوتی ہے اور بڑی کامیابی میں خود اپنے پر رشک آتا ہے)

ہاتھ دھو دل سے یہی گرمی گر اندیشہ میں ہے
آبگینہ تندیِ صہبا سے پگھلا جائے ہے

فرماتے ہیں۔ اگر تیرے غور و فکر میں ایسی ہی گرمی ہے تو اپنے دل کی فاتحہ پڑھ لے۔ کیونکہ آبگینہ شراب کی تیزی سے پگھل جاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ آتشِ فکر اچھی ہے بہت کاموں کو سُلجھا دیتی ہے۔

مگر حد سے زیادہ اگر دل پر بوجھ ڈالا جائے تو دل کو لے بیٹھتی ہے کیونکہ دل کو خون کی زیادہ مقدار دماغ کو دینی پڑتی ہے اور اکثر لوگوں کا دل اس زور کو سنبھال نہیں سکتا۔

غیر کو یارب، وہ کیونکر منعِ گستاخی کرے
گر حیا بھی اس کو آتی ہے تو شرما جائے ہے

فرماتے ہیں۔ غیر کو یارب گستاخی کرنے سے وہ کس طرح روکے۔ اگر اس کو غیر کی گستاخی سے حیا بھی آتی ہے تو وہ شرم کی وجہ سے اسے روک بھی نہیں سکتا۔

شوق کو یہ لت کہ ہر دم نالہ کھینچے جائیے
دل کی وہ حالت کہ دم لینے سے گھبرا جائے ہے

فرماتے ہیں۔ شوق کو نالہ و فغاں، آہ و فریاد کا چسکا پڑ گیا ہے۔ رات دن اُس کا یہی وظیفہ ہے۔ مگر ہمارے دل کی یہ حالت ہے کہ سانس بھی لیتا ہے تو اُسے ناگوار گزرتا ہے۔

دُور چشمِ بد! تری بزمِ طرب سے واہ وا!
نغمہ ہو جاتا ہے واں گر نالہ میرا جائے ہے

فرماتے ہیں۔ چشمِ بد دور، تیری بزمِ طرب کی کیا بات ہے خوشی ہی خوشی ہے وہاں غم کی بات کی کیا مجال۔ اگر میرا نالہ وہاں پہنچ جائے تو وہ بھی نغمہ بن جاتا ہے۔ اس سے زیادہ اور بزمِ طرب کیا ہوگی۔

رنج و راحت زندگی کے ساتھ ہیں ⁂ صبح کو گریہ تو نغمے شام کو (شارح)

گرچہ ہے طرزِ تغافل پردہ دارِ رازِ عشق

پر ہم ایسے کھوئے جاتے ہیں کہ وہ پا جائے ہے

فرماتے ہیں۔ اگرچہ اُس کا طرزِ تغافل یعنی چشم پوشی سے کام لینا رازِ عشق کی پردہ داری کرتا ہے۔ لیکن ہم اس کی بزم میں اس کے سامنے خود اپنے تو اُس کھو بیٹھتے ہیں اور اس طرح سے وہ ہمارے دل کی حالت، ہمارا مدعا پا لیتا ہے۔ کھونا اور پانا میں صفتِ تضاد ہے۔

اس کی بزم آرائیاں سُن کر دلِ رنجور یاں

مثلِ نقشِ مُدعائے غیر بیٹھا جائے ہے

فرماتے ہیں۔ اُس کی محفلِ ناز کا حال سُن کر میں بہت غمگین ہوتا ہوں۔ اور میرا دل اس غم کی تاب نہ لا کر اس طرح بیٹھا ہوا نظر آتا ہے۔ جیسے غیر کے دل میں ناپاک عزائم نقش ہو گئے ہیں۔

ہو کے عاشق وہ پری رُخ اور نازک بن گیا

رنگ کھلتا جائے ہے جتنا کہ اُڑتا جائے ہے

فرماتے ہیں۔ وہ پری چہرہ غیر پر عاشق ہونے کی وجہ سے اور بھی نازک بنتا جا رہا ہے۔ کیونکہ عشق کے صدمات اُسے بھی جھیلنے پڑ رہے ہیں۔ اور محبت کے صدمات سے اس کا رنگ اڑنے لگا ہے مگر ساتھ ہی ساتھ کھلتا بھی جا رہا ہے۔

نقش کو اُس کے مصور پر بھی کیا کیا ناز ہیں

کھینچتا ہے جس قدر اتنا ہی کھنچتا جائے ہے

فرماتے ہیں۔ اس کی تصویر بھی مصور سے کیا کیا ناز و انداز کا مظاہرہ کر رہی ہے وہ جس قدر اس کو

بنانا ہے۔ اُسی قدر اُس کے لئے مشکل ہوتی جا رہی ہے ۔

سایہ میرا مجھ سے مثلِ دُود بھاگے ہے اسدؔ
پاس مجھ آتش بجاں کے کس سے ٹھہرا جائے ہے !

فرماتے ہیں ۔ اے اسدؔ غمِ عشق نے اس حالت کو پہنچا دیا اور نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ میرا سایہ بھی مجھ سے مانند دھوئیں کے دُور بھاگتا ہے ۔ یعنی میرا سوزِ جگر کیا ہے شعلۂ آتش ہے جس سے رات دن دھواں ہی دھواں نکل رہا ہے ۔

غزل ۱۵۲

گرمِ فریاد رکھا شکلِ نہالی نے مجھے ۔ تب اماں ہجر میں دی بَردِ لیالی نے مجھے

معنی ۔ نہالی = قالین ۔ بردیالی ۔ سردی

فرماتے ہیں ۔ میں قالین پر نقش و نگار دیکھ کر سرگرم نالہ و فریاد ہو گیا کہ ہائے میرے پاس اتنا عمدہ قالین تو ہے مگر میرے پہلو میں میرا محبوب نہیں ہے ۔ تب مجھے ہجر کی سرد رات کاٹنے میں اماں ملی اور میری جان بچ گئی ورنہ ایک تو ہجر اور اس پر طرّہ یہ تھا کہ موسم سرما کا تھا ۔

نسیہ و نقدِ دو عالم کی حقیقت معلوم ! ۔ لے لیا مجھ سے مری ہمّتِ عالی نے مجھے

فرماتے ہیں ۔ نسیۂ عقبیٰ اور نقدِ دُنیا کی حقیقت ہمیں معلوم ہے ۔ ان دونوں میں سے کسی کو توفیق نہ تھی کہ لے لیتے مگر میری ہمّتِ عالی ۔ لے مجھے لے کر ان دونوں سے بے نیاز کر دیا ۔ مطلب یہ کہ میرا مطلوب نہ دنیا تھی نہ آخرت بلکہ میری ہمّتِ عالی کی پہنچ شاہدِ حقیقی تھی جس نے مجھے کھا کر ان

ان دونوں میں کوئی تیرے مطلب کی چیز نہیں چل آگے قدم بڑھا۔

کثرت آرائی وحدت ہے پرستاریٔ وہم   کر دیا کافر ان اصنامِ خیالی نے مجھے

فرماتے ہیں۔ کثرت میں وحدت سمجھنا اور وحدت کو کثرت سے سجانا محض وہم پرستی اور انسانی ڈھکوسلے ہیں ان میں کچھ حقیقت نہیں۔ صنم پرست اپنے بت کو اللہ تعالیٰ کا شریک ٹھہراتا ہے۔ اسی طرح وہ بھی بے خبر ہیں جو وجود کثرت میں وحدت کے قائل ہیں۔ کثرت کو اللہ تعالےٰ کا شریک قرار دینا بھی کفر ہے

ہوسِ گُل کا تصور میں بھی کھٹکا نہ رہا   عجب آرام دیا بے پروبالی نے مجھے

فرماتے ہیں۔ اب میرے تصور میں بھی سیرِ گُل کا خیال نہیں آتا۔ مجھے اس کے تصور سے نجات مل گئی۔ ہے اور یہ سب کچھ راحت وآرام میری بے طاقتی یعنی بے پَروبالی نے مجھے بخشا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جب تک طاقت تھی میں اُڑ کر باغ میں چلا جاتا تھا اور تماشائے گُل میں مصروف ہوجاتا تھا۔ لیکن اگر گُل کو گُلِ دُنیا تصور کریں تو معنی یوں ہوں گے کہ دُنیا کی خواہش اب دل کے کسی کونے میں نہیں اور اس کی وجہ میری بے پَروبالی ہے۔ یعنی بے طاقتی

غزل ۱۵۳

کارگاہِ ہستی میں لالہ داغ ساماں ہے   برقِ خرمنِ راحت خونِ گرمِ دہقاں ہے

فرماتے ہیں۔ ہستی کے کارخانہ پر نظر ڈالیں تو وہاں لالہ کے دل پر بھی سیاہ داغ نظر آتا ہے۔ یعنی یہاں کی کوئی خوبصورت چیز بھی داغ دھبّے سے خالی نہیں۔ یہاں جب کسان محنت کر کے اپنا خون گردش میں لاتا ہے یعنی سخت محنت کرتا ہے جس کے نتیجہ میں خرمن تیار ہوجاتا ہے تو بجلی

اُس کو جلانے کے لئے پَر تول رہی ہوتی ہے۔ یعنی جب تک خدا کا فضل شامل حال نہ ہو انسان اپنی محنت کا پھل نہیں پا سکتا۔

غنچہ تا شگفتن ہا برگِ عافیت معلُوم باوجودِ دلجمعی خوابِ گُل پریشاں ہے

فرماتے ہیں۔ غنچہ کے کھلنے تک اس کو اپنی پنکھڑیوں کی حفاظت کا یقین ہے لیکن باوجود اس دلجمعی کے اُسے اپنے انجام پر نظر ہے۔ کیونکہ اس کا انجام بکھرنا اور پریشان ہونا ہے۔

ہم سے رنجِ بے تابی کس طرح اٹھایا جائے داغِ پشتِ دستِ عجز، شعلہ خس بدنداں ہے

فرماتے ہیں۔ کہ اس رنج کی برداشت ہم سے نہ ہو سکے گی اور یہ ہماری ہلاکت کا باعث بن جائے گا۔ یہاں دستِ عجز سے مراد وہ ہاتھ ہے جو صدمہ کی برداشت نہ رکھنے کی طرف اشارا کرتا ہے اور عاجزی کی وجہ سے خس و خاشاک کی حیثیت رکھتا ہے۔

غزل ۱۵۴

اُگ رہا ہے در و دیوار پہ سبزہ غالب
ہم بیاباں میں ہیں اور گھر میں بہار آئی ہے

فرماتے ہیں۔ ہم تو وحشتِ دل کی وجہ سے گھر چھوڑ کر جنگل میں آ بسے اور یہاں مارے مارے پھر رہے ہیں اور اُدھر ویرانی کی وجہ سے ہمارے گھر کے در و دیوار پر سبزہ اُگ رہا ہے جو باغ کا منظر پیش کر رہا ہے۔

دل و نگاہ میں تصویرِ یار رہتی ہے ؛ مرے چمن میں ہمیشہ بہار رہتی ہے

صادق دہلوی

غزل ۱۵۵

سادگی پر اُس کی مر جانے کی حسرت دل میں ہے
بس نہیں چلتا کہ پھر خنجر کفِ قاتل میں ہے

معنی ۔ سادگی محبوب سے مطلب' بناؤ سنگار کے بغیر
فرماتے ہیں ۔ اُس نے سادگی اختیار کر لی ہے ۔ اِس کے باوجود وہ ایسا صاحبِ جمال ہے کہ اس پر مرتے رہنے کی حسرت ہمارے دل میں موجزن تھی، اب پھر نہ معلوم کس وجہ سے اُس نے اپنے ہاتھ میں خنجر لے لیا ہے جس کی وجہ سے سادگی جاتی رہی اور ہماری حسرت کا خون ہو گیا ۔ "پھر" کا لفظ بتاتا ہے کہ ایسا واقعہ پہلے بھی ہو چکا ہے ۔

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اُس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

فرماتے ہیں ۔ اس سے بہتر کسی کے حسنِ بیان کی کیا تعریف ہو سکتی ہے کہ جو کچھ کہنے والا کہے وہ سُننے والا اپنا ہی خیال سمجھے کہ بات تو پہلے ہی سے میرے دل میں تھی گویا کہنے والے کا یہ کمال ہے کہ وہ لوگوں کے دلوں میں چھپی ہوئی باتوں کو بھی عیاں کر دیتا ہے ۔

گرچہ ہے کس کس بُرائی سے ولے بایں ہمہ
ذکر میرا مجھ سے بہتر ہے کہ اس محفل میں ہے

فرماتے ہیں ۔ غیر میرا ذکر ان کی محفل میں صد ہا برائیوں کے ساتھ کرتے ہیں ۔ مگر بہر حال وہاں میرا ذکر

پہنچ تو جاتا ہے اور وہ سنتے بھی ہیں۔ مجھے تو یہ موقع حاصل نہیں ہے کہ میں ان کی محفل میں جا سکوں مگر میرا ذکر مجھ سے بازی لے گیا۔

بس ہجومِ نا اُمیدی خاک میں مل جائے گی

یہ جو اک لذت ہماری سعیِ بے حاصل میں ہے

فرماتے ہیں۔ اے ہجومِ نا امیدی، رُک جا۔ ہماری لذت کو خاک میں نہ ملا۔ اگر کوری کوشش لاحاصل ہو گی تو ہو۔ ہمیں اپنی کوشش لاحاصل میں بھی ایک لذت حاصل ہے جو ہمارے لئے کافی ہے۔

رنجِ رہ کیوں کھینچیے؟ واماندگی سے عشق ہے　　اُٹھ نہیں سکتا ہمارا جو قدم منزل میں ہے

فرماتے ہیں۔ ناکامی و نامرادی کو ہم سے عشق ہو گیا ہے۔ اب رہِ عشق کی تکالیف کیوں اور کس لئے اٹھائی جائیں۔ ہم واماندگی کی وجہ سے کبھی اپنی منزلِ مقصود پر نہ پہنچ سکیں گے۔ کیونکہ ہمارے پیروں میں، چلنے کی طاقت بھی نہ رہی۔ اور اب ہمارا منزل تک نہ پہنچنا ہمارے لئے رنج کا باعث نہیں رہا۔

جلوہ زارِ آتشِ دوزخ ہمارا دل سہی

فتنۂ شورِ قیامت کس کے آب و گل میں ہے

فرماتے ہیں۔ یہ سچ ہے کہ ہمارے دل میں آتشِ دوزخ بھڑک رہی ہے۔ لیکن فتنۂ شورِ قیامت کس کے آب و گل میں ہے تم تو سراپا فتنۂ قیامت ہو۔ تمہاری ہر اُدا سے دلوں میں ایک قیامت برپا ہو جاتی ہے

ہے دلِ شوریدۂ غالبؔ طلسمِ پیچ و تاب

رحم کر اپنی تمنا پر، کہ کس مشکل میں ہے

فرماتے ہیں ۔ غالب کا دل بہت سے پیچ تاب اپنے اندر رکھتا ہے۔ تم اپنی تمنا کو اس سے وابستہ نہ کرو۔ ورنہ یہ بھی اس میں پھنس جائے گی اور تمہیں بہت مشکل کا سامنا کرنا پڑے گا۔ لہٰذا اپنی تمنا پر رحم کرو۔

غزل ۱۵۶

دل سے تری نگاہ جگر تک اُتر گئی ۔۔۔ دونوں کو اک ادا میں رضامند کر گئی

فرماتے ہیں ۔ تیری نگاہ تیر کی طرح میرے دل کو چیرتی ہوئی جگر تک پہنچ گئی ۔ اور دونوں کو ایک ہی ادا سے اپنا گرویدہ اور ایک ہی وار سے گھائل کر گئی ۔

رحمت خدا کی جب کسی پر اُتر گئی ۔ وہ پاک صاف ہو گیا قسمت سنور گئی (شارح)

شق ہو گیا ہے سینہ خوشا لذتِ فراق ۔۔۔ تکلیف پردہ داریٔ زخمِ جگر گئی

فرماتے ہیں ۔ میرا سینہ لذتِ فراق سے شق ہو گیا۔ اور جو تکلیف زخمِ جگر کو چھپانے سے تھی اس سے مجھے نجات مل گئی ہے۔

وہ بادۂ شبانہ کی سرمستیاں کہاں ؟ ۔۔۔ اُٹھیے بس اب کہ لذتِ خوابِ سحر گئی

فرماتے ہیں۔ وہ شراب نوشی کی راتیں اور سرمستیاں ختم ہو گئیں۔ اب بیدار ہونے کا وقت آ گیا یعنی غفلت کی نیند کا مزہ بھی چلا گیا۔ مطلب یہ ہے کہ شباب کا زمانہ گزر گیا اور جوانی کی غفلت کا زمانہ نہ رہا۔ عہد پیری میں نفس کو غفلت میں نہیں رہنا چاہیئے بلکہ تلافیٔ مافات کی کوشش میں لگ جانا چاہیئے ۔

حاصل ہوئی ہیں ہم کو یہ شب زندہ داریاں ۔ شکرِ خدا کہ غفلتِ خوابِ سحر گئی (شارح)

اُڑتی پھرے ہے خاک مری کوئے یار میں   بارے اب اے ہوا ہوس بال و پر گئی

فرماتے ہیں ۔ زندگی کی یہی تمنا یہی آرزو تھی کہ اگر مجھے طاقتِ پرواز حاصل ہو یعنی محبوب کے پاس پہنچ جانے کے ذرائع حاصل ہوں ۔ خدا کا شکر ہے کہ میری مراد بر آئی لیکن بعد مرگ ۔ اب میری خاک کو ہوا اڑا کر کوچۂ یار میں پہنچا رہی ہے ۔

دیکھو تو دل فریبیٔ اندازِ نقشِ پا   موجِ خرامِ یار بھی کیا گل کتر گئی

فرماتے ہیں ۔ اس اندازِ نقشِ پا کی دل فریبیاں ملاحظہ ہوں کہ موجِ خرامِ یار کیسے گل کترتی چلی گئی ہے دوسرے معنی گل کترنے کے فتنہ و فساد برپا کرنا ہے تو اس کی رُو سے یہ معنی ہوں گے کہ ہزاروں دل لاکھوں کو قتل کیا ہے یعنی اپنے خرامِ ناز سے ہزاروں کے دل موہ لئے ہیں ۔

ہر بوالہوس نے حُسن پرستی شعار کی   اب آبروئے شیوۂ اہلِ نظر گئی

فرماتے ہیں ۔ ہوس پرستوں کی عادت حُسن پرستی نہ تھی اب انہوں نے بھی عشاق کے کوچہ میں قدم رکھنا شروع کر دیا ہے لہٰذا اہلِ نظر کے عشقِ صادق کی قدر جاتی رہی ۔
ٹکڑے ہوئے رقیبوں کے دل ایک ضرب سے   ناصر ہماری آہ بھی کیا کام کر گئی

نظارے نے بھی کام کیا واں نقاب کا   مستی سے ہر نگہ ترے رُخ پر بکھر گئی

۔ تیرا جلوۂ رخ اتنا پُرنور تھا کہ نظارہ نے خود دیکھنے والوں کے لیے نقاب کا کام کیا اور وہ تجھے دیکھ نہ سکے ۔ تیرے حُسن و جمال کی وجہ سے تارِ نظر ٹوٹ گئے اور سب محروم و نامراد ہی رہے ۔ اور تیرے حسن و جمال کو پورے طور پر کوئی نہ دیکھ سکا ۔

فردا و دی کا تفرقہ یک بار مٹ گیا   کل تم گئے کہ ہم پہ قیامت گزر گئی

فرماتے ہیں ۔ آج کل کا جھگڑا ہی مٹ گیا ۔ ان دونوں میں مطلق تمیز نہ رہی کہ آج کیا ہے اور کل کیا ہے

ہم پر تو کل تمہارے جانے سے ایک قیامت آگئی۔ اور ہم اب سب کچھ بھول گئے۔ خود رفتگی و خود فراموشی کا عالم رہتا ہے۔

اللہ رے ثباتِ قدم وقتِ ابتلا ٭ ٹوٹے پہاڑ ہم پہ قیامت گزر گئی (شارح)

مارا زمانے نے اسد اللہ خاں تمہیں   وہ ولولے کہاں، وہ جوانی کدھر گئی

فرماتے ہیں۔ اے اسد اللہ خاں تم کو تو زمانہ کی گردشوں نے مار ڈالا۔ نہ وہ عشق کے ولولے ہیں۔ نہ وہ جوانی کا دیوانہ پن۔

غزل ۵۷

تسکین کو ہم نہ روئیں جو ذوقِ نظر ملے

حورانِ خلد میں تری صورت مگر ملے

فرماتے ہیں۔ سکونِ قلب ذوقِ نظر کے ملنے سے حاصل ہو سکتا ہے۔ اگر دنیا میں نہیں ملا تو نہ سہی۔ جنت میں ہی مل جائے مگر اس کی بھی یہی صورت ہے کہ ہمیں وہاں ہمارا ذوقِ نظر ملے۔ یعنی ہمارا مطلوب تو ہے اگر تو نہ ملے تو ہم حوروں کو لے کر کیا کریں گے۔ مطلب شعر کا یہ ہے کہ ہمارا ذوقِ نظر تو دیدارِ الٰہی ہے جس سے ہمیں تسکین حاصل ہو گی۔ لہٰذا ہمیں تو ایسی جنت چاہیئے جہاں تیرا دیدار ہو سکے۔ غالبؔ کے مزاج کو نہ سمجھنے کی وجہ سے اس شعر کے جو معنی کئے جاتے ہیں وہ معتبر نہیں۔ وہ خود کہہ چکے ہیں سے

ہر چند ہو مشاہدہ حق کی گفتگو

بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

غلمان و حور بادۂ کوثر ہیں لطفِ عام ٭ ہے فضلِ خاص آپ کا جلوہ ملے اگر (شارح)

اپنی گلی میں مجھ کو نہ کر دفن بعدِ قتل

میرے پتے سے خلق کو کیوں تیرا گھر ملے

فرماتے ہیں ۔ مجھے قتل کرکے اپنی گلی میں دفن نہ کرنا۔ اس سے دوسری مشکلات پیدا ہوں گی۔ تیری گلی قاتل کی گلی کہلائے گی۔ یا قبر والی کہلائے گی۔ لوگ تجھے میرا قاتل کہیں گے اور تیرے لئے یہ اچھا نہیں کہ تو میری وجہ سے بدنام ہو۔ دوسری بات یہ ہے کہ میرے یار دوست میری قبر پہ فاتحہ پڑھنے آئیں گے اور وہ سب تجھے دو طرح سے دیکھیں گے بعض الزام دیں گے اور بعض تیرے دست و بازو کی تعریف کریں گے۔ لیکن مجھے تیری رسوائی گوارا ہے اور نہ ہی رشک ۔

ساقی گری کی شرم کرو آج ورنہ ہم

ہر شب پیا ہی کرتے ہیں مے جس قدر ملے

فرماتے ہیں ۔ آج تم ساقیِ مے ہو۔ ساقی گری کی لاج رکھنی ضروری ہے۔ آج جی بھر کے پلاؤ تا ہماری طبیعت جو مدتوں سے سیر نہیں ہوئی آج ہو جائے۔ تھوڑی بہت تو ہم ہر روز رات کو پیتے ہی ہیں جس سے تشفی نہیں ہوتی ۔

تجھ سے تو کچھ کلام نہیں لیکن اے ندیم

میرا سلام کہیو اگر نامہ بر ملے

فرماتے ہیں ۔ اے میرے دوست تجھ سے تو کوئی شکوہ شکایت نہیں ہے مگر اتنی درخواست ہے کہ اگر کہیں نامہ بر تجھے مل جائے تو میرا سلام کہہ دینا۔ چونکہ وہ بڑی شیخی بگھارتا تھا کہ میں ضرور خط کا جواب لے کر آؤں گا۔ اس نے اب تک شرم کے مارے ہمیں شکل نہیں دکھائی ۔

تم کو بھی ہم دکھائیں کہ مجنوں نے کیا کیا

فرصت کشاکشِ غمِ پنہاں سے گر ملے

فرماتے ہیں ۔ ہم بھی تمہیں وہ سب کچھ دکھاتے جو مجنوں نے کیا ہے اور شاید اُس کو بھی پیچھے چھوڑ دیتے مگر کیا کریں کہ غمِ پنہاں ہی پیچھا نہیں چھوڑتا ۔ پردہ داریِ عشق اور تمہاری رسوائی کے خیال نے ہمیں صحرانوردی کے جنون سے روک رکھا ہے ۔

لازم نہیں کہ خضر کی ہم پیروی کریں

مانا کہ اک بزرگ ہمیں ہم سفر ملے

فرماتے ہیں ۔ ہم پر یہ فرض نہیں ہے کہ راہِ زندگی میں جو بھی بزرگ ملے اُس کی پیروی کرنی شروع کر دیں ۔ راہِ سلوک میں ہمارے لئے ایک اُسوۂ حسنہ موجود ہے ۔ اُس کی پیروی کیوں نہ کریں ۔

اے ساکنانِ کوچۂ دلدار دیکھنا

تم کو کہیں جو غالبؔ آشفتہ سر ملے

فرماتے ہیں ۔ اے ساکنانِ کوچۂ راہِ طریقت و سلوک تم کو کہیں کسی جگہ کسی مقام پر بھی اگر غالبِ آشفتہ سر مل جائے تو اس مردِ خدا سے ضرور شرفِ ملاقات حاصل کرنا

جس کے اخلاق سے تعمیرِ جہاں ہوتی ہے

ایسی ہستی کہیں بے نام و نشاں ہوتی ہے

مخمور دہلوی

غزل ۱۵۸

کوئی دن گر زندگانی اور ہے　　　اپنے جی میں ہم نے ٹھانی اور ہے

فرماتے ہیں۔ عمر کافی گزر گئی دُنیا کے دھندوں میں پھنسے رہے۔ عشقِ بتاں اور جوانی کی غفلت میں رہے کچھ بھی حاصل نہ ہوا۔ مگر اب ہم نے اپنے جی پر ٹھان لی ہے کہ ہم ان سب علائق سے ترکِ تعلق کرکے اللہ سے لَو لگائیں گے۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے۔ ؎

عمر بگذشت و نماند است جز ایامے چند
بہ کہ در یاد کسے صبح کنم شامے چند

آتشِ دوزخ میں، یہ گرمی کہاں!　　　سوزِ غم ہائے نہانی اَور ہے

فرماتے ہیں ۔ ہم نے اپنے دل میں دنیا داری کے جو غم پال رکھے ہیں، اور جن کا دوسروں کو علم بھی نہیں، وہ ہمارے لیے آتشِ دوزخ سے کچھ زیادہ ہیں۔ اس شعر میں یہ اشارہ ہے کہ جب تک دنیا داری کی محبت دل میں سرد نہ ہوگی آتشِ دوزخ سے بچنا محال ہے

ضبطِ غم کا حوصلہ ممکن نہیں ۔ ہاں وہ امدادِ نہانی اور ہے (شارح)

بار ہا دیکھی ہیں اُن کی رنجشیں　　　پر کچھ اب کے سرگرانی اور ہے

فرماتے ہیں ۔ بار بار وہ روٹھے اور بار ہا ہم نے انہیں منا لیا لیکن اب کی بار ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہم انہیں منا نہ سکیں گے۔ اور نہ اُن سے صلح صفائی ہوتی نظر نہیں آتی ۔

ظُلم کے ماروں سے پوچھو تو کبھی ؛ داستاں ان کی زبانی اور ہے (شارح)

دے کے خط منہ دیکھتا ہے نامہ بر　　　کچھ تو پیغامِ زبانی اور ہے

فرماتے ہیں ۔ نامہ بر نے اُن کا خط ہمیں دے دیا اور پھر ہمارا منہ تک رہا ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ کچھ اور بھی پیغامِ زبانی بھی دیا۔ نامہ بر کی خاموشی سے ظاہر ہے کہ خط کے ساتھ دو چار گالیاں بھی ہیں۔

قاطعِ اعمار ہیں اکثر نجوم　　　وہ بلائے آسمانی اور ہے

معنی اعمار۔ عمر کی جمع ۔ قاطع کاٹنے والا

فرماتے ہیں ۔ یوں تو بہت سے ستارے ایسے ہیں جو عمریں کاٹتے رہتے ہیں لیکن جس بلائے آسمانی سے ہمارا واسطہ پڑا ہوا ہے وہ ان منحوس ستاروں کے مقابلہ میں قضائے مبرم ہے۔

ہو چکیں غالبؔ بلائیں سب تمام　　　ایک مرگِ ناگہانی اور ہے

فرماتے ہیں ۔ اس شعر میں غالبؔ نے مرگ کو بھی منجملہ از آفات تصوّر کیا ہے جبکہ موت بلا نہیں بلکہ بلاؤں سے نجات دلانے والی ہے۔ میرؔ سوز نے بھی فرمایا ہے ؎

جب تلک آنکھیں کھلی ہیں دُکھ پہ دُکھ دیکھیں کے لوگ
مند گئیں جب انکھڑیاں تب سوزؔ سب آنند ہیں

یا اکبرؔ الہ آبادی کا شعر ہے ؎

اپنے غم خانہ کا دروازہ کر دو بند اکبرؔ
اب سوا موت کے کوئی نہیں آنے والا

لیکن موت کا جو فلسفہ حضرت امیرؔ مینائی ؒ نے پیش کیا ہے ۔ وہ حقیقت کا آئینہ دار ہے ۔ فرماتے ہیں ؎

مدت سے امیرؔ اس کے ملنے کی تمنا تھی
آج اس نے بلایا ہے لینے کو قضا آئی

سچ ہے فکر ہر کس بقدر ہمت اوست۔

غزل ۱۵۹

کوئی اُمید بر نہیں آتی کوئی صورت نظر نہیں آتی

حصولِ اُمید کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ ناکامی و نامرادی نے گھیرا ڈال رکھا ہے اور ہم اس میں قید ہیں۔ ؎

شکل عشرت نظر نہیں آتی ⁂ بھُول کر بھی اِدھر نہیں آتی (شارح)

موت کا ایک دن معیّن ہے نیند کیوں رات بھر نہیں آتی

فرماتے ہیں۔ موت کا ایک وقت مقرر ہو چکا ہے نہ اُس سے پہلے کوئی لا سکتا ہے نہ اس کے آنے پر اسے لوٹایا جا سکتا ہے مگر شبِ فرقت میں تو نیند کو آنا چاہیئے۔ وہ تو نہیں آتی لیکن ہمیں شبِ فراق میں ہر شب موت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

آگے آتی تھی حالِ دل پہ ہنسی اب کسی بات پر نہیں آتی

فرماتے ہیں۔ پہلے تو مجھے دل کی مصیبتوں پر ہنسی آ جایا کرتی تھی مگر اب دن رات ہی اس قدر تکلیفیں دل کے لئے ہیں کہ مصیبت تو کیا اگر خوشی بھی ہوتی ہے تو ہنسی نہیں آتی۔ مطلب یہ ہے کہ دل ہر وقت بجھا بجھا سا رہتا ہے۔

جانتا ہوں ثوابِ طاعت و زہد پر طبیعت اِدھر نہیں آتی

فرماتے ہیں۔ میں جانتا ہوں اور اطاعت اور عبادت کی افادیت اور ثواب سے بھی آگاہ ہوں مگر طبیعت

کا کیا کروں۔ اس طرف رجوع ہی نہیں کرتی۔ دنیاوی علائق نے اس قدر گھیر رکھا ہے کہ آخرت کا خیال ہی دل سے محو ہو گیا ہے۔

عرش تک گر دُعا پہنچ جائے ÷ بے اثر لوٹ کر نہیں آتی (شارح)

ہے کچھ ایسی ہی بات جو چپ ہوں ورنہ کیا بات کر نہیں آتی

فرماتے ہیں۔ میرا چپ رہنا ہی تمہارے لئے اچھا ہے۔ میرا منہ نہ کھلواؤ ورنہ تمہاری ہی رسوائی ہو گی مطلب یہ ہے کہ مجھے وہ راز کی باتیں معلوم ہو گئی ہیں جن کے بیان سے رسوائی ہو گی۔ یہ بات ہرگز نہیں ہے کہ ہمیں محفل میں بات کرنی نہیں آتی۔ ہم آدابِ مجلس سے خوب واقف ہیں۔

داغِ دل گر نظر نہیں آتا بُو بھی اے چارہ گر نہیں آتی

فرماتے ہیں۔ اے چارہ گر تجھے داغ دل کا نظر نہیں آتا میں مانتا ہوں۔ مگر کیا میرے داغ دل سے تجھے بدبو بھی نہیں آرہی۔ مطلب یہ ہے چارہ گر کو اگر دل کے اندر دیکھنے کی طاقت نہیں مگر اس کو میرے طور واطوار سے پتہ ہونا چاہیئے تھا کہ میں بیمارِ محبت ہوں میرا علاج ناممکن ہے مگر وہ اتنی عقل کا بھی مالک نہیں۔

نارِ حسرت سے دل جلا ایسا ÷ راکھ بھی اب نظر نہیں آتی (شارح)

کیوں نہ چیخوں کہ یاد کرتے ہیں میری آواز گر نہیں آتی

فرماتے ہیں۔ میری نالہ کشی سے میرے محبوب کو بہت لگاؤ پیدا ہو گیا ہے۔ ایک تو اس کی شہرت دوسرے اپنے معشوقانہ ناز و ادا پر کُلی اطمینان کہ وہ اس قابل ہیں کہ میں جہاں بھی ہوں گا عاشقوں میں کمی نہ ہو گی۔ لہٰذا جب وہ میری آواز نہیں سنتے تو یاد کرتے ہیں اور ہاں شاید سوچتے ہوں کہ کہیں مر تو نہیں گیا۔ وغیرہ وغیرہ۔

ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی کچھ ہماری خبر نہیں آتی

فرماتے ہیں ۔ جنونِ عشق اور ستم ہائے روزگار کا اتنا اثر اور صدمہ لاحق ہوا ہے جس سے از خود رفتگی و خود فراموشی اُس قدر بڑھ گئی ہے کہ ہمیں اپنے حال کی بھی خبر نہیں ۔

مرتے ہیں آرزو میں مرنے کی　　　موت آتی ہے پر نہیں آتی

فرماتے ہیں ۔ ہمارے مصائب ہمارے لئے موت سے کم نہیں اور ہم ان سے نجات پانے کے لئے مرجانا پسند کرتے ہیں لیکن یہ ہمارے بس میں نہیں کیونکہ موت کا ایک دن معیّن ہے ۔ وعدہ کم نہ زیادہ ۔ سہ موت برحق اور یقینی ہے و یاد اُس کی مگر نہیں آتی (شارح)

کعبہ کس منہ سے جاؤ گے غالبؔ　　　شرم تم کو مگر نہیں آتی

فرماتے ہیں ۔ ساری عمر بادہ نوشی اور عشق بتاں میں گزاری ۔ اب کیا منہ لے کر حج کو جاؤ گے تمہاری شرم کو کیا ہو گیا ۔ اللہ اللہ کس قدر ندامت ہے ۔

غزل ۱۶۰

دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے ؟　　　آخر اس درد کی دوا کیا ہے ؟

فرماتے ہیں ۔ اے میرے نادان دل تجھ کو کیا ہو گیا ہے تو کس طرح باز آئے گا ۔ آخر اس درد یعنی تیرے دردِ عشق کا کیا علاج کریں ۔ کون سی دوا تیرے لئے لائیں تو خود بھی بے چین ہے اور ہمارا بھی سکون خاک میں ملا دیا ہے ۔

دیکھ لی عشق ابتدا تیری ؛ اب جنوں جانے انتہا کیا ہے (شارح)

ہم ہیں مشتاق اور وہ بیزار　　　یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے ؟

فرماتے ہیں ۔ یاالہٰی ہم تو محبوب کے قرب کے لئے ہر دم مشتاق و بے قرار ہیں اور وہ ہے کہ ہماری شکل دیکھنا بھی گوارا نہیں کرتا۔ یہ کیا ماجرا ہے ہم سُنتے آئے ہیں کہ "دل سے دل کو راہ ہوتی ہے۔ مگر ہمارے ساتھ تو معاملہ بالکل اس کے برعکس ہے ۔

اس قدر بے رُخی ہوا کیا ہے ؛ ہم سے ایسی ہوئی خطا کیا ہے (شارح)

میں بھی منہ میں زبان رکھتا ہوں کاش پوچھو کہ مدّعا کیا ہے ؛

فرماتے ہیں ۔ تم غیروں سے پوچھتے ہو ان کی حالت سے باخبر رہتے ہو۔ مجھ سے بھی کبھی پوچھا کہ تیرا کیا مدّعا ہے تو کیا چاہتا ہے۔ میرے پاس بھی زبان ہے میں بھی عرضِ حال کر سکتا ہوں۔

دلربائی ہے حسن کا شیوہ ؛ دلبروں سے ہمیں گلہ کیا ہے (شارح)

جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے ؛

فرماتے ہیں ۔ جبکہ تیرے سوا کوئی اور خالق نہیں۔ اس جہان کا دوسرا اور کوئی مالک نہیں پھر لوگ تیرے ساتھ شریک ٹھہرا کر بُت پرستی کا ہنگامہ کیوں بپا کر رہے ہیں۔ یہ سب جو تیری مرضی کے خلاف ہے کیوں ہو رہا ہے ۔

تو ہے اپنی صفات میں یکتا ؛ اس سے بڑھ کر تیری ثنا کیا ہے (شارح)

یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں ؛ غمزہ و عشوہ و ادا کیا ہے ؛

فرماتے ہیں ۔ جب تیرے سوا کوئی دوسرا اس عالم میں نہیں ہے تو پھر یہ حسین چہرے والے اپنے غمزہ و عشوہ و ادا لے کر کہاں سے آ ٹپکے ہیں ۔

شکنِ زلفِ عنبریں کیوں ہے ؛ نگہِ چشمِ سُرمہ سا کیا ہے ؛

فرماتے ہیں۔ یہ خوشبودار گھونگر والی زلفیں کیوں ہیں اور یہ نگہِ سرما سا کیا کر رہی ہے۔

سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں ابر کیا چیز ہے ہوا کیا ہے ؛

فرماتے ہیں ۔ یہ سبزہ زار اور یہ پھول یہ خوشبو سب کہاں سے آئے ہیں آخر یہ اپنے آپ تو پیدا نہیں ہو گئے ۔ یہ ابر کیا چیز ہے اور ہوا کیا ہے ۔ ضرورت مند کھیتوں کو پانی دیتا ہے ۔ ان سب کی حقیقت کیا ہے ۔ مندرجہ بالا اشعار میں اس حقیقت کی طرف توجہ دلائی ہے کہ زمین پر اللہ تعالیٰ نے انسان کو اپنا خلیفہ بنایا ہے ۔ زمین آسمان ، چاند سورج ، دریا پہاڑ ، سبزہ زار انسان کی خدمات انجام دے رہے ہیں اور حسین اور خوبصورت نازک اندام عورتیں اُس کی تسکین کے لیئے پیدا کی گئیں تاکہ وہ خدا کی نیابت کا حق پوری دلجمعی سے ادا کر سکے اور اس کا عبادت گزار بندہ بن کر اللہ تعالیٰ کے رنگ میں رنگین ہو جائے

ہم کو اُن سے وفا کی ہے امید ۔۔۔ جو نہیں جانتے وفا کیا ہے ؛

فرماتے ہیں ۔ ہم حسینوں سے وفا کی امید باندھتے ہیں وہ اپنے حسن کے غرور میں وفا کو جانتے ہی نہیں اور نہ جاننا چاہتے ہیں ۔

جس کو ہے عشوؤں نے گھیر لیا ؛ اُس کے آگے رہ ہی کیا ہے (شارح)

ہاں بھلا کر تیرا بھلا ہو گا ۔۔۔ اور درویش کی صدا کیا ہے ؛

فرماتے ہیں ۔ جو کسی کو فائدہ پہنچائے گا دونوں جہان میں اس کا اجر اس کو ملے گا ۔ یہی درویش کی صدا ہے مگر اس بھلائی میں غرض کی ملونی نہ ہونی چاہیئے جیسا کہ کسی نے کہا ہے کہ " نیکی کر اور دریا میں ڈال ۔"

تجھ کو ہی مانگتا ہوں میں تجھ سے ؛ اس سے بہتر تیری عطا کیا ہے (شارح)

جان تم پر نثار کرتا ہوں ۔۔۔ میں نہیں جانتا وفا کیا ہے

فرماتے ہیں ۔ جان سے بڑھ کر میرے پاس کوئی تحفہ نہیں جو میں تم پر قربان کرتا ہوں ۔ اس کے سوا وفا کا اور کیا مفہوم ہو گا ۔ کیا جان کا نذرانہ پیش کرنا وفا نہیں ۔

میں نے مانا کہ کچھ نہیں غالبؔ ۔۔۔ مفت ہاتھ آئے تو بُرا کیا ہے

فرماتے ہیں ۔ میں اپنی جان کو زیادہ قیمتی نہیں سمجھتا ۔ میں اپنی نظر میں، ایک حقیر انسان ہوں لیکن تم کو تو مفت غلام مل رہا ہے ۔ کوئی قیمت دینی نہیں پڑ رہی ۔ اس میں کیا بُرائی ہے ۔

غزل ۱۶۱

کہتے تو ہو تُم سب کہ بُتِ غالیہ مُو آئے
اک مرتبہ گھبرا کے کہو کوئی کہ وہ آئے

فرماتے ہیں ۔ اے میرے دوستو، تم میرے لئے یہ دُعا کر رہے ہو کہ میرا حسین اور خوشبودار زُلفوں والا محبوب آئے ۔ میں اس کے لئے تمہارا شکر گزار ہوں ۔ لیکن میری خواہش ہے کہ کبھی وہ اچانک آ جائے اور تم بول پڑو کہ لو جن کا انتظار تھا وہ آ گئے ۔ (بُتِ غالیہ ۔ خوشبودار زلفوں والا معشوق)

ہوں کشمکشِ نزع میں ہاں جذبِ محبت
کچھ کہہ نہ سکوں، پر وہ مرے پُوچھنے کو آئے

فرماتے ہیں ۔ کہ میں اس وقت حالتِ نزع میں ہوں ۔ مگر جذبِ محبت تو اُسے اپنی کشش سے میرے پاس لے آ ۔ یہ تو ظاہر ہے کہ بات نہیں کر سکتا ۔ مگر وہ پرسشِ حال کے لئے آ تو جائے تاکہ دمِ آخر اُس کا دیدار کر لوں ۔

ہے صاعقہ و شعلہ و سیماب کا عالم
آنا ہی سمجھ میں مری آتا نہیں، گو آئے

فرماتے ہیں ۔ وہ میرے گھر آ تو گئے مگر جانے کی اس قدر جلدی ہے کہ میں ان کی اس گھبراہٹ کو بجلی سے

شعلہ سے یا پارہ سے تشبیہ دوں تو غلط نہ ہوگا۔ اِدھر آئے اور اُدھر جانے کی پڑ گئی۔ ایسے آنے
کو آنا کیسے کہہ سکتا ہوں ۔

ظاہر ہے کہ گھبرا کے نہ بھاگیں گے نکیرین
ہاں مُنہ سے مگر بادۂ دوشینہ کی بُو آئے

فرماتے ہیں ۔ یہ تو ظاہر ہے کہ نکیرین گھبرا کر میری قبر سے نہیں بھاگیں گے وہ اپنا کام کرنا چاہیں گے مگر
میری رات کی پی ہوئی شراب کی بد بو انہیں زیادہ سوال و جواب کرنے سے روک دے گی اور وہ جلد
چلے جائیں گے۔ اس طرح میری جلد ہی جان چھوٹ جائے گی ۔

جلّاد سے ڈرتے ہیں نہ واعظ سے جھگڑتے
ہم سمجھے ہوئے ہیں اُسے جس بھیس میں جو آئے

فرماتے ہیں ۔ ہم اللہ تعالیٰ کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے خواہ وہ جلّاد کی صورت میں آئے یا واعظ اور
ناصح کی صورت میں۔ اُس کے بہت سے روپ ہیں۔ ہم اچھی طرح جانتے ہیں ۔

ہاں اہلِ طلب کون سنے طعنۂ نایافت
دیکھا کہ وہ ملتا نہیں اپنے ہی کو کھو آئے

فرماتے ہیں ۔ یہ طعنہ کہ اس کو برسوں تلاش کیا مگر اس کا کھوج کہیں نہیں ملا۔ ہم ناکام و نامراد ہی رہے
جب ہم نے دیکھا کہ معرفتِ الٰہی کے سارے راز ہم نہیں پا سکتے ہیں اور نہ پوری طرح اس کی
کنہ کو ہی جان سکتے ہیں تو ہم اپنے ہوش و حواس ہی کھو بیٹھے۔ سچ ہے ؎

آں راکہ خبر شد خبرش باز نیاید

اپنا نہیں وہ شیوہ کہ آرام سے بیٹھیں
اِس در پہ نہیں بار تو کعبے ہی کو ہو آئے

فرماتے ہیں ۔ ہماری یہ عادت نہیں کہ کوشش کو ترک کر کے آرام سے بیٹھ جائیں۔ جب وہ ہمیں یہاں نہیں ملا تو ہم کعبہ میں اُس کی خاطر گئے کہ شاید وہاں وہ ہمیں مل جائے ۔

کی ہم نفسوں نے اثرِ گریہ میں تقریر
اچھے رہے آپ اُس سے مگر مجھ کو ڈبو آئے

فرماتے ہیں ۔ میرے ہم نفسوں نے گریہ کے پُر اثر ہونے میں میرے محبوب کے روبرو لمبی چوڑی تقریریں کیں اور دلیلوں سے گریہ کا پُر اثر ہونا ثابت کیا مگر محبوب گریہ کے اثر کا قائل نہ ہوا جس کی وجہ اُس نے اُن کو یہ بتائی کہ اگر بقول تمھارے گریہ میں اثر ہے تو مجھے اُس یعنی غالب کے نالہ و فغاں نے اپنے پاس کیوں نہیں کھینچ لیا۔ اگر نالوں میں اثر ہوتا ہے تو کیوں غالب کے گریہ میں کوئی اثر نہیں ۔ لہٰذا دوست احباب خود تو اُس کی نظر میں عقلمند ٹھہرے مگر مجھے ڈبو آئے یعنی میری تحقیر ثابت کر آئے ۔

اُس انجمنِ ناز کی کیا بات ہے غالبؔ
ہم بھی گئے واں اور تری تقدیر کو رو آئے

۔ اُس انجمنِ ناز یعنی تیرے محبوب کی محفل کی کیا بات ہے یعنی بہت ہی اعلیٰ و ارفع ہے ۔ ہر کس و ناکس امیر غریب چھوٹا بڑا بادشاہ فقیر سب ہی جانتے ہیں حتیٰ کہ دوست دشمن سب جمع ہو جاتے ہیں اور لطفِ صحبت حاصل کرتے ہیں مگر غالبؔ تو ایسا بدنصیب ہے کہ تو وہاں گیا بھی اور محبوب کے قرب سے محروم رہا ۔

غزل ۱۶۲

پھر کچھ اک دل کو بے قراری ہے   سینہ جویائے زخم کاری ہے

فرماتے ہیں ۔ میرا دل بے چین ہے ۔ شاید اسے عشق کا زخم کاری کھانے کی پھر خواہش ہے ۔

پھر جگر کھودنے لگا ناخن   آمدِ فصلِ لالہ کاری ہے

فرماتے ہیں ۔ ناخن نے پھر ہمارا جگر کریدنا شروع کر دیا ہے ۔ معلوم ہوتا ہے کہ موسمِ بہار آنے والا ہے ۔ باغ میں لالہ و گل کھلیں گے اور جنونِ عشق کا زخم پھر تازہ ہو جائے گا ۔

قبلۂ مقصدِ نگاہِ نیاز   پھر وہی پردۂ عماری ہے

فرماتے ہیں ۔ نگاہِ نیاز کا قبلۂ مقصد پردۂ محمل بن گیا ہے ۔ شاید اس میں وہ سوار ہوتے وقت ہی نظر آجائے اور ہم اُس کی ایک جھلک ہی دیکھ لیں ۔

چشمِ دلّالِ جنسِ رسوائی   دل خریدارِ ذوقِ خواری ہے

فرماتے ہیں ۔ آنکھ جنسِ رسوائی کی دلّال بن گئی اور دل ذوقِ ذلّت و خواری کا خریدار ہو گیا ہے ۔ عشق کے یہی مراحل ہیں

وہی صد رنگ نالہ فرسائی   وہی صد گونہ اشکباری ہے

فرماتے ہیں ۔ دل سو سو طرح سے نالہ و فریاد کرتا ہے اور آنکھیں سینکڑوں طرح سے اشکباری کرتی ہیں جو میری بدنامی اور رسوائی کا موجب ہے ۔

دل ہوائے خرامِ ناز سے پھر　　محشرستانِ بیقراری ہے

فرماتے ہیں ۔ ہمارا دل خرامِ نازِ یار کے شوق میں میدانِ حشر بنا رہتا ہے ۔

جلوہ پھر عرضِ ناز کرتا ہے　　روزِ بازارِ جاں سپاری ہے

فرماتے ہیں ۔ جلوۂ یار متاعِ ناز کو روزِ بازار میں پیش کر رہا ہے کہ ہے کوئی عاشقِ جانباز جو اس متاعِ ناز کا خریدار بنے ۔ گویا بازارِ جاں سپاری کی ہر روز گرمیِ بازار ہے ۔

پھر اُسی بے وفا پہ مرتے ہیں　　پھر وہی زندگی ہماری ہے

فرماتے ہیں ۔ پھر اسی بے وفا کا عشق دامن گیر ہے جس پر ہم پہلے بھی مرتے تھے ۔ اور آج بھی زندگی کا وہی طور و طریق ہے ہم اپنی وفاداری کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑ سکتے اور یہی عاشقِ صادق کی پہچان ہے ۔

پھر کھلا ہے درِ عدالتِ ناز　　گرم بازارِ فوجداری ہے

فرماتے ہیں ۔ تعطیل ختم ہوگئی ۔ پھر عدالتِ ناز کا دروازہ کھل گیا ہے ۔ پھر فوجداری کے مقدمات شروع ہو گئے ۔ مطلب یہ ہے کہ موسمِ فصلِ گل آگیا ہے اور عشق و جنوں کا جوش دلوں میں ظاہر ہونے لگا ہے ۔

ہو رہا ہے جہان میں اندھیر　　زُلف کی پھر سرشتہ داری ہے

فرماتے ہیں ۔ جہان میں اندھیر یعنی ناانصافی اور ظلم کا دور آگیا ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ محبوب کی سیاہ زلفوں کو سرشتہ داری یعنی حکمرانی کا موقعہ مل گیا ہے ۔

پھر کیا پارۂ جگر نے سوال　　　ایک فریاد و آہ و زاری ہے

فرماتے ہیں ۔ پارۂ جگر نے عدالتِ ناز میں دعویٰ دائر کر دیا ہے۔ اور ہر طرف سے فریادی آرہے ہیں ۔

پھر ہوئے ہیں گواہِ عشق طلب　　　اشکباری کا حکم جاری ہے

فرماتے ہیں ۔ پھر عدالت کے روبرو عشق کے گواہ پیش ہو رہے ہیں۔ اشکباری کا حکم جاری ہے۔ اور عشق خونِ دل لختِ جگر کو اپنی طرفداری میں بطور گواہ پیش کر رہا ہے ۔

دل و مژگاں کا جو مقدمہ تھا　　　آج پھر اُس کی روبکاری ہے

فرماتے ہیں ۔ دلِ عاشق اور مژگانِ یار کے درمیان جو مقدمہ چل رہا تھا آج دونوں فریق ثبوتِ دعویٰ اور جوابِ دعویٰ پیش کر رہے ہیں ۔

بے خودی بے سبب نہیں غالبؔ　　　کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے

فرماتے ہیں ۔ اے غالبؔ یہ تیری بے خودی بے سبب تو نہیں معلوم ہوتی۔ کوئی نہ کوئی بات ضرور ہے جس کے لئے تو نے بے خودی کو اختیار کر رکھا ہے اور جس کو چھپانے کی تو کوشش کر رہا ہے ۔

چشمِ مستِ ناز نے بے خود کیا　　　ہوش میں آنا خودی کی ہار ہے
بیخودی میں کہہ گئے ناطق جو رازِ بیخودی　　　آزمائش بن گئے ہیں اہلِ عرفاں کے لئے

(شارح)

غزل ۱۶۳

جنون تہمت کشِ تسکیں نہ ہو گر شادمانی کی

نمک پاشِ خراشِ دل ہے لذّت زندگانی کی

فرماتے ہیں ۔ اے جنوں تجھ پر تسکین کی تہمت ہرگز نہیں ہے ۔ تھوڑی بہت جو مجھے کبھی شادمانی نصیب ہوتی ہے وہ تو زخمِ دل پر نمک پاشی کے باعث ہے ۔ مطلب یہ ہے کہ ہمارا اس طرح سے زندگی بسر کرنا ۔ زخمِ دل پر نمک چھڑکنے کے مترادف ہے ۔ جو ہماری زندگی کی لذّت کا باعث ہے ۔

کشاکش ہائے ہستی سے کرے کیا سعیِ آزادی

ہوئی زنجیر موجِ آب کو فرصت روانی کی

فرماتے ہیں ۔ زندگی کی کشمکش سے آزادی کی کوشش کوئی کیا کرے ۔ کیونکہ ممکن ہی نہیں ۔ ذرا موجِ آب کو دیکھو ۔ کہ وہ جس قدر آزاد ہونے کی کوشش کرتی ہے ۔ اسی قدر اس کی زنجیرِ قید لمبی ہوتی چلی جاتی ہے ۔ مطلب یہ ہے کہ علائق زندگی سے آزاد ہونا ممکن ہی نہیں ۔ جس قدر کوشش کریں گے اسی قدر اس میں جکڑتے چلے جائیں گے ۔

پس از مردن بھی دیوانہ زیارت گاہِ طفلاں ہے

شرارِ سنگ نے تربت پہ میرے گُل فشانی کی

فرماتے ہیں ۔ تیرے دیوانہ کی قبر کو مرنے کے بعد لڑکوں نے زیارت گاہ بنا لیا ہے اور وہ اب تک میری قبر پر آکر پتھر مارتے ہیں اور پتھر سے جو چنگاریاں نکلتی ہیں وہ پھول بن کر میری قبر پر گُل پاشی کا فریضہ ادا کرتی ہیں ۔

غزل ۱۶۴

نکوہش ہے سزا فریادیٔ بیدادِ دلبر کی
مبادا خندۂ دنداں نما ہو صبحِ محشر کی

فرماتے ہیں محبوب کے ظلم و ستم کی فریاد کرنے والا مجرم ہے اس کو سزا ملنی چاہیئے ۔ اور سزا ملامت کے سوا کیا ہو سکتی ہے بلکہ میں تو ڈرتا ہوں کہ کہیں صبحِ محشر بھی محبوب کا خندۂ دنداں نما ہو کر نمودار نہ ہو ۔ یعنی وہی محبوب وہاں بھی ہو ۔ (خندۂ دنداں نما = ایسی ہنسی جس میں دانت نظر آئیں) ۔

رگِ لیلیٰ کو خاکِ دشتِ مجنوں ریشگی بخشے
اگر بو وے بجائے دانہ دہقاں، نوک نشتر کی

فرماتے ہیں دشتِ مجنوں کی خاک رگِ لیلیٰ کو زخمی کر دے اگر دہقاں دانہ بونے کی بجائے نوکِ نشتر زمین میں بوئے مطلب یہ ہے کہ جذبۂ عشق نے عاشق و معشوق اور رگ و نشتر میں باہمی رابطہ پیدا کر دیا ہے ۔ اس لیئے بجائے کھیتی کے نوکِ نشتر اُگا کریں گے ۔

پرِ پروانہ شاید بادبانِ کشتیٔ مے تھا
ہوئی مجلس کی گرمی سے روانی دورِ ساغر کی

فرماتے ہیں ۔ پروانہ کا پر شاید شراب کی کشتی کا بادبان ہے کہ جونہی مجلس گرم ہوئی ۔ دورِ ساغر شروع ہو گیا ۔ مطلب یہ ہے کہ جہاں بزم آرائی کی جاتی ہے شمع جلائی جاتی ہے اور اس روشنی پر پروانوں کا ہجوم ہو جاتا ہے ۔ اور شمع روشن ہونے ہی دورِ ساغر شروع ہو جاتا ہے اور شراب کی کشتی رواں دواں

ہو جاتی ہے لہٰذا پروانے کے پَر اس کشتی مے کے بادبان بن جاتے ہیں۔

کروں بیدادِ ذوقِ پرفشانی عرض کیا قدرت!

کہ طاقت اُڑ گئی اُڑنے سے پہلے میرے شہپر کی

فرماتے ہیں۔ میری کیا مجال ہے کہ میں ذوقِ پرفشانی کے ظلم وستم کو عرض کروں۔ اُڑنے سے پہلے ہی میرے شہپر نے جواب دے دیا۔

کہاں تک روؤں اُسکے خیمے کے پیچھے قیامت ہے!

مری قسمت میں یارب کیا نہ تھی دیوار پتھر کی

فرماتے ہیں۔ میں اس کے خیمے کے پیچھے رو رو کر تھک گیا مگر خیمے کو اپنے آنسوؤں سے بہا نہ سکا اگر اگر ایسا ہوتا تو یار کا دیدار نصیب ہو جاتا۔ یارب اگر قناتوں کی جگہ پتھر کی دیوار ہوتی تو اس ناامیدی و ناکامی کے وقت میں اپنا سر پھوڑ کر مر جاتا۔

غزل ۱۶۵

بے اعتدالیوں سے سبک سب میں ہم ہوئے

جتنے زیادہ ہو گئے اُتنے ہی کم ہوئے

فرماتے ہیں۔ جس قدر ہم نے اپنی حد سے تجاوز کیا۔ اُسی قدر ہمیں لوگوں کی نظر میں شرمندگی اٹھانی پڑی۔ اعتدال ہر حالت میں برقرار رکھنا اچھا ہے۔ حتیٰ کہ عبادت میں بھی، یہی ہمارے آقا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم اور سنت ہے

پنہاں تھا دامِ سخت قریب آشیان کے
اُڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہُوئے

فرماتے ہیں۔ آشیانہ کے پاس ہی بہت بڑا جال بچھا ہوا تھا ہم اُڑنے بھی نہ پائے تھے کہ جال میں پھنس گئے انسان ہوش سنبھالتے ہی دُنیا کے بکھیڑوں کے جال میں پھنس جاتا ہے اور پھر ساری عمر اس جال سے نہیں نکلتا۔

ہستی ہماری اپنی فنا پر دلیل ہے
یاں تک مٹے کہ آپ ہی اپنی قسم ہُوئے

فرماتے ہیں۔ ہمارا وجود ہی ہمارے مٹنے کی دلیل ہے۔ ہم ایسے مٹے کہ گویا ہمارا وجود کبھی تھا ہی نہیں۔ پیدائش سے ہی تبدیلی شروع ہو گئی۔ اور جس شے میں تبدیلی ہو گی یقیناً وہ فنا ہو گی۔ صرف اور صرف ایک ہی ذات ہے جس میں کوئی تبدیلی نہیں اور وہ اللہ کی ذات ہے۔

سختی کشانِ عشق کی پوچھے ہے کیا خبر؟
وہ لوگ رفتہ رفتہ سراپا الم ہُوئے

فرماتے ہیں۔ عشق کی سختیاں اور مصیبتیں اٹھانے والوں کا کیا حال پوچھتے ہو وہ تو چُپ چاپ آہستگی سے غموں کو برداشت کرتے کرتے گھُل کر سراپا رنج والم کی تصویر بن گئے۔

تیری وفا سے کیا ہو تلافی کہ دھر میں
تیرے سوا بھی ہم پہ بہت سے ستم ہُوئے

فرماتے ہیں۔ اگر تو جفا کے بدلے اب وفا کرنے لگے تو تیرے جور و ستم کی تلافی تو شاید ہو جائے مگر اُن ہزاروں ستم کا کیا ہوگا جو زمانہ ہم پہ کرتا رہا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر اب تجھے ہم پر رحم آ بھی جائے اور تو اپنی جفاؤں کی تلافی کر بھی دے۔ پھر بھی زمانہ کے ظلم و ستم کی تلافی کون کرنے والا ہے۔ وہ

تو جاری رہیں گے۔

لکھتے رہے جنوں کی حکایاتِ خوں چکاں

ہر چند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہُوئے

فرماتے ہیں ، ہم عشق کی خونیں داستانیں اشعار کی صورت میں لکھتے رہے۔ باوجودیکہ محبوب نے ہمارے ہاتھ بھی قلم کئے۔ یعنی طرح طرح کی رکاوٹیں پیدا کیں۔ دوسرے معنی یہ بھی ہیں کہ خوں چکاں حکایات اس کثرت سے لکھیں کہ ہمارے ہاتھ ہی زخمی ہو گئے۔

اللہ رے تیری تندیٔ خُوجس کے بیم سے

اجزائے نالہ دل میں مرے رزقِ ہم ہُوئے

فرماتے ہیں۔ تیری بدمزاجی کے خوف سے مرے نالے لب پر نہ آئے بلکہ دل ہی دل میں ایک دوسرے کا رزق بنتے رہے اور آخر کار خون کی مانند میرے بدن میں تحلیل ہو کر رزقِ جاں بن گئے۔

اہلِ ہوس کی فتح ہے ترکِ نبردِ عشق

جو پاؤں اُٹھ گئے وہی اُن کے علم ہُوے

فرماتے ہیں۔ اہلِ ہوس کی اسی میں خیر ہے اور یہی اُن کی جیت ہے کہ میدانِ عشق سے باہر نکل جائیں۔ اس کارزار میں وہ جیت نہ سکیں گے۔ لہٰذا جو قدم وہ پیچھے ہٹائیں گے وہی اُن کی فتح کا علم ہوگا۔

نالے عدم میں چند ہمارے سپرد تھے

جو واں نہ کھچ سکے سو وہ یاں آکے دم ہوئے

فرماتے ہیں۔ نالہ کشی کا منصب ہمیں عدم سے تفویض ہوا ہے جو نالہ کشی وہاں کرنے سے رہ گئی تھی وہ ہم

نے یہاں بخوبی و کمال تکمیل تک پہنچائی ۔

چھوڑی اسدؔ نہ ہم نے گدائی میں دل لگی
سائل ہوئے تو عاشقِ اہلِ کرم ہوئے

فرماتے ہیں ۔ اے اسدؔ ہم نے فقیری میں بھی عاشقی نہ چھوڑی ، جس نے ہم پر کوئی کرم کیا ہم اُس کے گرویدہ و عاشق ہو گئے ۔ ؎ لطف و کرم تھا ساقی کا دیتا چلا گیا
میں تھا گدائے میکدہ لیتا چلا گیا (شارح)

غزل ۱۶۶

جو نہ نقدِ داغِ دل کی کرے شعلہ پاسبانی
تو فسردگی نہاں ہے بہ کمینِ بے زبانی

فرماتے ہیں ۔ اگر شعلۂ عشق میرے نقدِ داغِ دل کی حفاظت نہ کرے گا ، تو افسردگی گھات لگائے بیٹھی ہے کہ ذرا موقعہ ملے تو میں نقدِ داغِ دل کو اڑا لوں ۔ مطلب ہے کہ ناکامی و نامرادی سے جو غم بڑھے گا کہیں وہ میرے داغِ دل کو مٹا نہ دے ۔

مجھے اُس سے کیا توقع ؟ بہ زمانۂ جوانی
کبھی کودکی میں جس نے نہ سُنی مری کہانی

فرماتے ہیں ۔ بچپن میں کہانیاں سُننے کا ہر بچے کو شوق ہوتا ہے لیکن میرے محبوب نے اس وقت بھی میری کہانی نہیں سُنی اب جبکہ ہم دونوں جوان ہو گئے ہیں تو کیسے توقع کروں کہ وہ میرا حالِ دل سننا پسند کرے گا ۔

یونہی دکھ کسی کو دینا نہیں خوب ۔ ورنہ کہتا

کہ مرے عُدو کو یارب ملے میری زندگانی

فرماتے ہیں ۔ بلاوجہ کسی کو دکھ دینا یا اُس کے لئے اپنے دل میں مصائب کی خواہش رکھنا اچھی بات نہیں ہے ۔ اگر ایسا ہوتا تو میں یقیناً اپنے دشمن کے لئے یہ دعا کرتا کہ یا الٰہی میری زندگی جو دکھوں سے بھری ہوئی ہے وہ میرے دشمن کو عطا کر دے کیونکہ وہ مجھ کو مصیبت میں دیکھ کر خوش ہوتا ہے ۔

غزل ۱۶۷

ظُلمت کدے میں میرے شبِ غم کا جوش ہے

اک شمع ہے دلیلِ سحر سو خموش ہے

فرماتے ہیں ۔ میرے ظلمت کدے میں شبِ غم کا جوش ہے یعنی بلا کا اندھیرا ہے اور اس شبِ غم میں امکان نہیں کہ کبھی صبح اپنا منہ دکھائے کیونکہ شمع جلائی ہی نہیں گئی جو صبح کے وقت بجھ کر نمودِ سحر کا پیغام دے ۔

نے مژدۂ وصال نہ نظارہ جمال

مُدت ہوئی کہ آشتیِ چشم و گوش ہے

فرماتے ہیں نہ وصل کا مژدہ کانوں کو نصیب ہوتا ہے نہ آنکھوں کو جمالِ یار کا کبھی نظارہ ہوتا ہے ۔ عرصہ سے ان دونوں میں صلح و آشتی کا دور دورہ ہے ۔ پہلے کبھی ایک کو کچھ حاصل ہوتا تھا وہ دوسرے پر

فخر یہ اپنی فوقیت جتایا کرتا تھا۔ اگر کانوں کو مژدہ ملتا تو وہ آنکھوں کو اپنے سے کمتر بنانے کی غرض سے کہتا کہ دیکھا تیرے ایسے بھاگ نہیں ہیں کہ تو جمال یار کو دیکھے ہمیں خوشخبری مل گئی ہے اور آنکھ جمالِ یار کا نظارہ پاتی وہ کانوں پر اپنی فوقیت کا سکہ جماتی مگر اب یہ دونوں آپس میں صلح کر بیٹھے ہیں۔ کیونکہ نہ کانوں کو مژدۂ وصال ملتا ہے نہ آنکھوں کو نظارۂ جمال ہوتا ہے۔

مے نے کیا ہے حسنِ خُود آرا کو بے حجاب
اے شوق یاں اجازتِ تسلیم و ہوش ہے

فرماتے ہیں ۔ شراب نے حسنِ خود آرا کو بے حجاب کر دیا ہے اے شوقِ دل اب تجھ کو اجازت ہے کہ اپنے ہوش، و حواس حسنِ بے حجاب کی نذر کر دے ۔

گوہر کو عقدِ گردنِ خوباں میں دیکھنا
کیا اوج پر ستارۂ گوہر فروش ہے

فرماتے ہیں ۔ گوہر فروش کا نصیبہ بہت اوج پر ہے کہ اس کے موتیوں کے ہار گردنِ خوباں میں جاکر اتنے اچھے لگ رہے ہیں ۔ ورنہ اِن کی حیثیت ہی کیا تھی ۔

دیدار بادہ۔ حوصلہ ساقی۔ نگاہ مست
بزمِ خیال مے کدۂ بے خروش ہے

فرماتے ہیں ۔ دیدار شراب ہے حوصلہ ساقی ہے اور نگاہ مست و میخوار ہے۔ خیالی مجلس ایسا میکدہ ہے جہاں کوئی شور و غل نہیں ہوتا۔

قطعہ

اے تازہ واردانِ بساطِ ہوائے دل
زنہار! اگر تمہیں ہوسِ ناؤ نوش ہے

فرماتے ہیں ۔اے نوجوانو تم اگر نئے نئے عشق و محبت کے اسیر ہوئے ہو تو خبردار دو چیز دل ہے دل نہ لگانا۔ ایک موسیقی اور دوسری شراب یہ دونوں انسان کی زندگی کے لئے روگ ہیں ۔

دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو
میری سنو جو گوشِ نصیحت نیوش ہے

فرماتے ہیں ۔میرے حال پر نظر ڈالو اور عبرت حاصل کرو اور میری نصیحت دل کے کانوں سے سنو اور وہ نصیحت یہ ہے کہ

ساقی بہ جلوہ ، دشمنِ ایمان و آگہی
مطرب بہ نغمہ رہزنِ تمکین و ہوش ہے

فرماتے ہیں ساقی اپنی جلوہ گری سے تمہارے ایمان و آگہی کا دشمن ہے اور مطرب اپنی خوش گلوئی سے تمہاری طاقت و ہوش پر ڈاکہ زنی کرنے والا ہے ۔

یا شب کو دیکھتے تھے کہ ہر گوشۂ بساط
دامانِ باغبان و کفِ گُل فروش ہے

یا تو رات کو یہ حالت تھی کہ فرش کا ایک ایک کونہ پھولوں سے آراستہ و پیراستہ تھا اور باغبان کا دامن دستِ گل کا ہاتھ بنا ہوا تھا اور دل بستگی اور دل فریبی کے ہر طرح کے سامان مہیا تھے یعنی۔

لطفِ خرامِ ساقی و ذوقِ صدائے چنگ
یہ جنّتِ نگاہ وہ فردوسِ گوش ہے

ساقی کی مستانہ چال دل کو پامال کرتی تھی اور چنگ و رباب کی موسیقی دل کو لبھانے والی اور اپنی جانب کھینچنے والی تھی۔ یعنی ایک طرف تو جنّت کا نظارہ پیش تھا اور دوسری طرف کانوں کے لئے نغمہ سرائی کے لطف حاصل تھے۔

یا صبح دم جو دیکھیئے آکر تو بزم میں
نے وہ سرور و سوز نہ جوش و خروش ہے

یا صبح کے وقت آکر جو دیکھا تو بزم میں اُداسی اور بے رونقی چھائی ہوئی تھی نہ موسیقی تھی نہ اُس کا سوز و گداز اور نہ آنکھوں کے لئے جنتِ نگاہ کا کوئی سامان۔

داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی
اک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خموش ہے

داغِ فراق سے افسردہ اور ساری رات کی جلی بجھی ہوئی دلِ عاشق کی طرح پژمردہ ایک شمع نظر آرہی ہے مگر وہ بھی خموش ہے یعنی بجھ چکی ہے۔

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں
غالبؔ صریرِ خامہ نوائے سروش ہے

فرماتے ہیں میرے خیال میں ایسے مضامین کا آنا اللہ تعالیٰ کی خاص عطا ہے۔ اے غالبؔ میرے قلم سے نکلے ہوئے الفاظ کی آواز نہیں بلکہ غیبی آواز ہے۔ (نوائے سروش، غیبی آواز)

غزل ۱۶۸

نہ ہوئی گر مرے مرنے سے تسلّی نہ سہی
امتحاں اور بھی باقی ہو تو یہ بھی نہ سہی

فرماتے ہیں۔ میں نے حقِ وفا پورا کر دکھایا۔ اپنی جان آپ کے عشق میں دے دی۔ اگر آپ کی تسلّی اس پر بھی نہیں ہوئی اور آپ میرا عشق صادق اور مجھے عاشقِ صادق نہیں خیال کرتے تو پھر اور جو کوئی امتحان باقی ہے وہ بھی میری نعش پر کر لیجئے۔ آپ چاہیں تو میری نعش قیامت تک آپ کے پاس رہے۔ بے مثل مطلع ہے جس قدر تعریف کریں کم ہے۔

خار خارِ المِ حسرتِ دیدار تو ہے
شوق، گُل چینِ گلستانِ تسلّی، نہ سہی

فرماتے ہیں۔ اگر میرا شوقِ گلستان تسلّی کا گُل چین نہ بنا نہ سہی۔ میرے شوق کے لئے حسرتِ دیدار کے لئے کانٹے ہی کافی ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اگر شوقِ تسلّی نہ حاصل کر سکا تو کم از کم حسرتِ دیدار تو ساتھ رہی۔

مَے پرستاں خُمِ مَے منہ سے لگائے ہی بنے
ایک دن گر نہ ہُوا بزم میں ساقی۔ نہ سہی

فرماتے ہیں۔ اے مے پرستوں، ساقی کے انتظار کے بعد اگر خُم کا خُم تم نے مُنہ لگا کر پی لیا تو کوئی مضائقہ نہیں۔ ایک دن وہ بزم میں نہیں تھا تو نہ سہی۔ اگر وہ ہوتا تو ساقی خرامِ ناز کے ساتھ ہمیں ساغر میں صراحی سے ڈال کر تھوڑی تھوڑی شراب دیتا۔ اب اگر اس کے ناز و ادا نہیں ہیں نہ سہی۔ خُم مے کو مُنہ لگا کر اد جی بھر کر پینے کا تو موقعہ مل گیا۔

نفسِ قیس کہ ہے چشم و چراغِ صحرا　　　گر نہیں شمعِ سیہ خانۂ لیلیٰ ۔ نہ سہی

فرماتے ہیں ۔ قیس کا دم صحرا کے لئے چشم و چراغ کا حکم رکھتا ہے ۔ صحرا کی ساری رونق قیس کے دم قدم سے تھی ۔ اگر قیس کو لیلیٰ کے دربار میں داخلہ نہ ملا نہ سہی ۔ لیلیٰ کے گھر کو سیہ خانہ اس وجہ سے کہا کہ لیلیٰ کا خیمہ کالے رنگ کا تھا اور اس کا رنگ بھی کالا تھا ۔

ایک ہنگامے پہ موقوف ہے گھر کی رونق　　　نوحۂ غم ہی سہی نغمۂ شادی نہ سہی

فرماتے ہیں ۔ گھر کی رونق (یا کسی جگہ کی) کے لئے لوگوں کا جمع ہونا یعنی انجمن آرائی کرنا باعثِ نشاط ہے ، چاہے وہ بزمِ ماتم ہو یا خوشی کی محفل ۔ ویسے عارف باللہ کی نظر میں دونوں چیزیں برابر کا درجہ رکھتی ہیں ۔ کیونکہ راضی برضائے مولا رہنا ہی اس کا شعار اور مقصودِ اصلی ہے ۔

نہ ستائش کی تمنّا نہ صلے کی پروا　　　گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی ، نہ سہی

فرماتے ہیں ۔ جو لوگ میرے کلام کو بے معنی سمجھتے ہیں وہ سمجھتے رہیں ۔ مجھے اُن سے کسی تعریف یا داد پانے کی تمنّا نہیں ہے ۔ نہ میں اُن سے کوئی صِلہ چاہتا ہوں ۔ اگر میرے کلام کی قدر نہ کی جائے تو مجھے کیا پروا میں نے شاعری اپنے ذوق کا تقاضا پورا کرنے کے لئے کی ہے ۔ کوئی سمجھے یا نہ سمجھے ۔

عشرتِ صحبتِ خوباں ہی غنیمت سمجھو　　　نہ ہوئی غالبؔ اگر عمرِ طبیعی نہ سہی

فرماتے ہیں ۔ حسینوں کی صحبت میں جو تھوڑی سی خوشی مل جاتی ہے ۔ اے غالبؔ اُسی کو غنیمت جانو اگر ساری عمر کے لئے نہیں ہے تو نہ سہی ۔

بادشاہت مل گئی جس کو غنی دل مل گیا ٭ اُس پہ آئی پھر بہار ایسی جو گلشن میں نہیں (شارح)

غزل ۱۶۹

عجب نشاط سے جلّاد کے چلے ہیں ہم آگے

کہ اپنے سائے سے سر پاؤں سے ہے دو قدم آگے

فرماتے ہیں۔ تعجب کا مقام ہے کہ ہم کس خوشی سے قتل ہونے کے لئے جلّاد کے آگے آگے مقتل کی جانب جارہے ہیں۔ حالت یہ ہے کہ ہمارے پاؤں شوقِ قتل میں جلد جلد بڑھ رہے ہیں اور ہمارے سر کا سایہ بھی دو قدم آگے ہی نظر آرہا ہے۔

قضا نے تھا مجھے چاہا خرابِ بادۂ الفت

فقط "خراب" لکھا بس نہ چل سکا قلم آگے

فرماتے ہیں۔ قضا چاہتی تھی کہ مجھے خراب بادۂ الفت لکھے مگر قلم مست و مدہوش ہو کر رک گیا اور آگے نہ لکھ سکا۔ اسی وجہ سے میں خراب ہو کر رہ گیا۔ خراب بادۂ الفت کا جملہ پورا نہ ہوا۔ اور اس وجہ سے جملہ کی ناتمامی نے عجب لطف پیدا کر دیا۔

غمِ زمانہ نے جھاڑی نشاطِ عشق کی مستی

وگرنہ ہم بھی اٹھاتے تھے لذتِ الم آگے

فرماتے ہیں۔ دنیا کے رنج و غم نے سارے نشے ہرن کر دیئے ورنہ ہم بھی عشق میں مبتلا غم عشق کی لذتوں سے مالا مال تھے۔ ہماری نشاطِ عشق کی مستی کو مٹانے والا غم زمانہ ہے۔

خدا کے واسطے داد اس جنونِ شوق کی دینا

کہ اس کے در پہ پہنچتے ہیں نامہ بر سے ہم آگے

فرماتے ہیں۔ اپنے محبوب کو خط لکھ کر جواب کے لئے ایسے بیتاب ہوئے کہ محبوب کے دروازے پر نامہ بر سے پہلے ہی پہنچ گئے۔

یہ عمر بھر جو پریشانیاں اٹھائی ہیں ہم نے
تمہارے آئیو اے طرۂ ہائے خم بہ خم آگے

فرماتے ہیں۔ اے طرۂ ہائے پُرخم محبوب تو نے ہمیں اس قدر پریشان کیا ہے کہ اب ہم یہی کہتے کہ تیرے آگے آئے۔ مطلب یہ ہے کہ خدا ہی تجھے سمجھے اور وہی تجھے اس کا بدلہ دینے والا ہے۔

دل و جگر میں پرافشاں جو ایک موجۂ خوں ہے
ہم اپنے زعم میں سمجھے ہوئے تھے اس کو دم آگے

فرماتے ہیں۔ ہم جس کو سانس یا دم خم سمجھ رہے تھے وہ دراصل موجِ خون کی پُرافشانی ہے۔ یہ بھی مطلب نکلتا ہے کہ ساری قوت دل و جگر میں خون کی روانی سے ہے۔

قسم جنازے پہ آنے کی میرے کھاتے ہیں غالبؔ
ہمیشہ کھاتے تھے جو میری جان کی قسم آگے

فرماتے ہیں۔ یا تو ایسی محبت ہم سے تھی کہ میری جان کی ہمیشہ قسم کھایا کرتے تھے یا اب یہ حالت ہے کہ جنازے پر آنے سے بھی انکار ہے۔

صحنِ گلشن سے میں کیوں اشک بداماں نکلا
پھول سمجھا تھا جسے خارِ مغیلاں نکلا
(شارح)

غزل ۱۷۰

شکوے کے نام سے بے مہر خفا ہوتا ہے

یہ بھی مت کہہ کہ "جو کہیئے تو گلہ ہوتا ہے"

فرماتے ہیں۔ اس کو شکوہ کے نام سے بھی نفرت ہے اگر یہ بھی کہیں کہ وہ لفظ شکوہ کو پسند نہیں کرتا تو بے مہر محبوب اس کو بھی شکوہ ہی خیال کرتا ہے۔ لہٰذا ہم شکوہ کا نام بھی نہیں لیتے۔

پُر ہوں میں شکوے سے یوں، راگ سے جیسے باجا

اک ذرا چھیڑیئے پھر دیکھئے کیا ہوتا ہے

فرماتے ہیں۔ گلے شکوے میرے دل میں بھرے ہوئے ہیں وہ اگر چھیڑیں تو دیکھئے گا کہ جیسے باجے کے سُروں پر انگلیاں رکھتے ہی سینکڑوں راگ فوراً نکلنے شروع ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح میں سارے گلے شکوے تمہارے سامنے بیان کرنے شروع کر دوں گا۔ صرف تمہارا چھیڑنا ہی کافی ہے۔ اسی مفہوم کا ایک اور شعر ہے۔ دیکھا آخر نہ کہ پھوڑے کی طرح پھوٹ بہے ہم بھرے بیٹھے تھے کیوں آپ نے چھیڑا ہم کو

گو سمجھتا نہیں پر حُسنِ تلافی دیکھو

شکوۂ جور سے سرگرم جفا ہوتا ہے

فرماتے ہیں۔ جب بھی ہم محبوب سے شکوۂ جور و ستم کرتے ہیں وہ کم سن ہونے کے سبب پوری طرح سمجھتا نہیں۔ مگر حسنِ تلافی دیکھئے کہ وہ پہلے سے زیادہ ستم کرنے لگتا ہے۔

عشق کی راہ میں ہے چرخِ مکوکب کی وہ چال
سست رو جیسے کوئی آبلہ پا ہوتا ہے

فرماتے ہیں ۔ اس ستارے والے آسمان کو ضرور کسی سے عشق ہے تب ہی تو یہ بھی آہستہ آہستہ چل رہا ہے جیسے کوئی عاشق صحرا میں آبلہ پا ہونے پر چلتا ہے ۔

کیوں نہ ٹھہریں ہدفِ ناوکِ بیداد کہ ہم
آپ اُٹھا لاتے ہیں گر تیر خطا ہوتا ہے

فرماتے ہیں ۔ ہمیں تیر کھانے کا اس قدر شوق ہے کہ اگر ان کا کوئی تیر خطا ہو جاتا ہے تو ہم دوڑ کر اُسے اُٹھا لاتے ہیں اور ناوکِ بیداد کی نذر کر دیتے ہیں اور کہتے ہیں لیجئے آپ ہمیں اپنے تیرِ ستم کا نشانہ بنا ڈالیئے ۔

خوب تھا پہلے سے ہوتے جو ہم اپنے بد خواہ
کہ بھلا چاہتے ہیں اور بُرا ہوتا ہے

فرماتے ہیں ۔ کیا ہی اچھا ہوتا اگر ہم پہلے سے ہی اپنے بد خواہ یعنی بُرا چاہنے والے ہوتے کیونکہ ہمارا ہر کام ہمارے مقصد کے برعکس ہوتا ہے ہم بھلا چاہتے ہیں بُرا ہو جاتا ہے ۔ کاش یہ راز ہم پر پہلے سے کھل جاتا تو ہم ہمیشہ بُرے کی خواہش کرتے اور ہمارا بھلا ہو جایا کرتا ۔

نالہ جاتا تھا پرے عرش سے میرا اور اب
لب تک آتا ہے جو ایسا ہی رسا ہوتا ہے

فرماتے ہیں ۔ یا تو وہ حالت و کیفیت تھی کہ میرا نالہ و فریاد آسمانوں کو عبور کر کے بابِ اجابت تک

پہنچ جاتا تھا اور میرے لئے بابِ رحمت کھل جاتا تھا۔ یا اب زیادہ سے زیادہ میرے ہونٹوں تک بمشکل پہنچتا ہے۔

قطعہ

خامہ میرا کہ وہ ہے باربدِ بزمِ سخن — شاہ کی مدح میں یوں نغمہ سرا ہوتا ہے

معنی۔ باربد = ایک گویئے کا نام ہے۔
فرماتے ہیں۔ میرا قلم بادشاہ کی مدح میں باربد گویئے کی طرح نغمہ سرا رہتا ہے۔

اے شہنشاہِ کواکب سپہ و مہرِ علم! — تیرے اکرام کا حق کس سے ادا ہوتا ہے

فرماتے ہیں۔ اے شہنشاہِ ہندوستان ستارے بھی تیری سپاہ یعنی فوج اور مہر تیرا علم ہے۔ تیرے انعام و اکرام کا حق کسی سے ادا نہیں ہو سکتا۔

سات اقلیم کا حاصل جو فراہم کیجے — تو وہ لشکر کا ترے نعل بہا ہوتا ہے

معنی۔ نعل بہا = نذرانہ کا ٹیکس
فرماتے ہیں۔ اگر سات بادشاہت کے محاصل اکٹھا کئے جائیں تو پھر کہیں تیرے لشکر کا نعل بہا مہیا ہوگا۔

ہر مہینے میں جو یہ بدر سے ہوتا ہے ہلال — آستانہ پہ ترے مہ ناصیہ سا ہوتا ہے

فرماتے ہیں۔ ہر مہینے چاند جو بدر بننے کے بعد ہلال ہو جاتا ہے یہ تیرے در پہ ماتھا رگڑتا ہے۔

مَیں جو گستاخ ہوں آئینِ غزل خوانی میں　　یہ بھی تیرا ہی کرم ذوقِ فزا ہوتا ہے

فرماتے ہیں ۔ میں جو دستورِ غزل کی خلاف ورزی کر رہا ہوں اور غزل کے درمیان تیری مدح سرائی کرنے لگتا ہوں ۔ یہ بھی تیرے کرم کی وجہ سے ہے ۔ کیونکہ تیرا کرم ذوقِ مدح سرائی کو بڑھاتا رہتا ہے ۔

رکھیو غالبؔ مجھے اس تلخ نوائی میں معاف　　آج کچھ درد مرے دل میں سوا ہوتا ہے

فرماتے ہیں ۔ اے غالبؔ میری تلخ نوائی کو سن کر بدمزہ مت ہونا ۔ میں معذرت کے ساتھ کہتا ہوں کہ میرے دل میں آج درد پہلے سے کچھ زیادہ ہو رہا ہے ۔

غزل ۱۷۱

ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کہ "تو کیا ہے"　　تم ہی کہو کہ یہ اندازِ گفتگو کیا ہے؟

فرماتے ہیں ۔ میری ہر بات کو سن کر یعنی میری ہر غزل کو سن کر آپ کا یہی ارشاد ہوتا ہے کہ تو کیا ہے تیرے کلام کی حقیقت کیا ہے ۔ مجھے بہت ہی حقیر و ذلیل سمجھتے ہو ۔ میں آپ ہی سے پوچھتا ہوں کہ یہ اندازِ گفتگو کس حد تک مناسب ہے اور یہ کونسی تہذیب ہے ۔ کونسا طرزِ گفتگو ہے ۔ یہ غزل غالبؔ کی چند سہلِ ممتنع غزلوں میں سے ایک ہے ۔ ـــ حقیر جان کے کہنا کسی سے "تو کیا ہے" ۔ گناہ ہے یہ تکبر کی گفتگو کیا ہے (شارح)

نہ شعلے میں یہ کرشمہ نہ برق میں یہ ادا　　کوئی بتاؤ کہ وہ شوخِ تُند خُو کیا ہے؟

فرماتے ہیں ۔ اُس کی تند خوئی کی نہ کسی شعلے سے تشبیہ دی جا سکتی ہے اور نہ بجلی سے یعنی یہ کرشمہ و ناز کہیں نہیں پایا جاتا جو اُس شوخِ تند خُو میں ہے ۔ مجھے نہیں معلوم ۔ اگر کوئی بتا سکتا ہے تو مجھے ضرور بتلائے کہ آخر وہ شوخِ تُند خو ہے کیا بلا ۔

یہ رشک ہے کہ وہ ہوتا ہے ہم سخن تم سے ۔۔۔۔۔ وگرنہ خوفِ بدآموزیٔ عدو کیا ہے؟

فرماتے ہیں ۔ مجھے تو یہ رشک مارے ڈالتا ہے کہ وہ تم سے ہم کلامی کا شرف رکھتا ہے۔ اس بات کی قطعی پروا نہیں کہ وہ میری بدگوئی میں آپ کے کان بھرتا ہے ۔ تم کا لفظ غمازی کرتا ہے کہ روئے سخن بادشاہ کی طرف نہیں ہے ۔

چپک رہا ہے بدن پر لہو سے پیراہن ۔۔۔۔۔ ہماری جیب کو اب حاجتِ رفو کیا ہے؟

فرماتے ہیں ۔ ہمارے بدن پر جو زخم لگے ہیں اُن سے خون مسلسل بہہ رہا ہے اور اس کے سبب سارا جامہ ہمارے جسم سے چپک کر رہ گیا ہے ۔ ایسی حالت میں کیا ضرورت ہے کہ ہم اپنے گریبان کی مرمت کریں اور سیئیں ۔ مطلب یہ ہے کہ جب مصائب نے سب کچھ ہی تباہ و برباد کر دیا ۔ تو پھر کسی ایک چیز کا کیا رونا روئیں ۔

جلا ہے جسم جہاں، دل بھی جل گیا ہوگا ۔۔۔۔۔ کریدتے ہو جواب راکھ جستجو کیا ہے؟

فرماتے ہیں ۔ جہاں جسم جل گیا وہاں ساتھ دل بھی جل گیا ہوگا ۔ اب آپ جو راکھ کرید رہے ہو تمہارا کیا مطلب ہے، مطلب یہ ہے کہ جب سب کچھ تباہ و برباد ہو گیا تو باقی کیا رہا اب تم جو ایک ایک چیز کا جائزہ لینا چاہتے ہو اس سے تم کو کیا فائدہ ہوگا ۔ کیا ہماری تباہی میں تمہیں شک ہے ۔

رگوں میں دوڑتے پھرنے کے ہم نہیں قائل ۔۔۔۔۔ جب آنکھ ہی سے نہ ٹپکا تو پھر لہو کیا ہے؟

فرماتے ہیں ۔ ہماری نظر میں لہو کی قدر و قیمت یہ ہی نہیں کہ وہ انسان کی رگوں میں دوڑتا رہے اور باعثِ زندگی ہو بلکہ ہم تو لہو اُس کو سمجھتے ہیں کہ انسان عشق میں مبتلا ہو اور پھر کسی کی یاد میں اس کی آنکھوں سے خون ٹپکے ۔ مطلب یہ ہے کہ زندگی اللہ تعالیٰ نے عبادت کرنے کے لئے عطا کی ہے

اگر کوئی آنکھ اس کی یاد میں خون کے آنسو نہیں بہاتی تو خون کی کیا قیمت دوسرے یہ معنی بھی نکلتے ہیں اور سمجھے جا سکتے ہیں کہ دوست احباب، رشتہ دار جو زبانی جمع خرچ کرتے رہتے ہیں اور اپنی محبت اور ہمدردی جتاتے رہتے ہیں وہ وقت آنے پر اگر کچھ نہ کریں تو اُن کی محبت کے کیا معنی ہیں۔

وہ چیز جس کے لئے ہم کو ہو بہشت عزیز　　سوائے بادۂ گلفام مُشک بُو کیا ہے؛

فرماتے ہیں۔ بہشت کی نعمتوں میں سے ایک شراب طہور بھی ہے جو گلفام بھی ہے اور مُشک بُو بھی اس کے لئے ہمیں جنت پیاری ہے۔

ملا ہو شربتِ دیدار جس کو جنت میں　:　پھر اس کے واسطے صہبائے مشکبو کیا ہے

(شارح)

پیوں شراب اگر خُم بھی دیکھ لوں دوچار　　یہ شیشہ و قدح و کوزہ و سبُو کیا ہے؛

فرماتے ہیں۔ شراب پینے میں مَیں بہت عالی ظرف ہوں۔ شیشہ و قدح کوزہ و سبو میرے لئے کچھ نہیں اور نہ اس قدر تھوڑی شراب سے مجھے حسبِ خواہش سرور حاصل ہوگا۔ ہاں اگر دوچار مٹکے شراب کے ہوں تو پھر کوئی بات بنے۔

نہ ہو جو اُلفتِ جاناں تو ظرفِ دل بیکار　:　نہ ہو جو بادہ تو پھر ساغر و سبو کیا ہے (شارح)

رہی نہ طاقتِ گفتار اور اگر ہو بھی　　تو کس امید پہ کہئے کہ آرزو کیا ہے؛

فرماتے ہیں۔ ہم نے اس قدر ضبط سے کام لیا کہ ضبطِ آرزو میں اپنی جان دے بیٹھے اور کبھی حرفِ آرزو اپنے لب پر نہ لائے۔ ایک تو اب طاقتِ گفتار نہیں اور اگر ہوتی بھی تو ہم کس امید پر اپنی آرزو کا اظہار کریں۔ مطلب یہ ہے کہ محبوب سے ہم بالکل مایوس ہو چکے ہیں۔

ہُوا ہے شہ کا مصاحب پھرے ہے اتراتا　　دگرنہ شہر میں غالبؔ کی آبرو کیا ہے

فرماتے ہیں۔ بادشاہ کی مصاحبت نے غالبؔ کو مغرور کر دیا ہے۔ بہت تھوڑے ظرف کا انسان ہے۔

شہر میں سب کو بتاتا اور اتراتا پھرتا ہے کہ میں بادشاہ کے مصاحبوں میں سے ہوں۔ ورنہ اس سے پیشتر تو اس کو کوئی گھاس بھی نہ ڈالتا تھا۔ مقطع اپنا جواب نہیں رکھتا اور غزل بھی۔

؎ جو ہو فریب سے حاصل وہ مال و زر لعنت ؛ اساس جس کی ہو باطل وہ آبرو کیا ہے۔ (شارح)

غزل ۱۷۲

مَیں انہیں چھیڑوں، اور کچھ نہ کہیں ۔۔۔ چل نکلتے جو مے پیئے ہوتے

فرماتے ہیں۔ اُن سے یہ بات بعید از قیاس معلوم ہوتی ہے کہ چھیڑنے پر مجھے بُرا بھلا نہ کہیں اگر وہ شراب پیئے ہوئے ہوتے تو مجھے کچھ نہ کہتے اور میری چھیڑ کا بُرا نہ مانتے۔ یہ معنی بھی ممکن ہیں کہ اگر شراب پیئے ہوتے۔ تو میری خوب خبر لیتے۔ خیر ہی ہوتی۔

قہر ہو یا بلا ہو جو کچھ ہو ۔۔۔ کاشکے کہ تم مرے لئے ہوتے

فرماتے ہیں۔ محبوب سے مخاطب ہیں اور کہتے ہیں کہ تم بھی شوخی و شرارت میں کسی قہر و بلا سے کم نہیں ہو لیکن میں پھر بھی یہی کہتا ہوں کہ کاش میری قسمت میں بجائے دوسری بلاؤں کے تمہیں ہی لکھ دیا جاتا۔ محبوب کی شوخی اور بد مزاجی کی تصویر کھینچی، ساتھ ہی تعریف بھی کی، ہے ایسی کہ تعریف نہیں ہو سکتی۔

میری قسمت میں غم گر اتنا تھا ۔۔۔ دل بھی یارب کئی دیئے ہوتے

فرماتے ہیں۔ اگر مجھے میری زندگی میں اس کثرت سے غم دینے تھے تو اے میرے خالق دعا ہے کہ مجھے کئی دل بھی دینے تھے۔ ایک دل کے لئے تو اتنے سارے غم بہت ہیں۔ اندازِ شکوہ و دُعا قابلِ داد ہے۔

آ ہی جاتا وہ راہ پر غالبؔ ۔۔۔ کوئی دن اور بھی جیئے ہوتے

فرماتے ہیں۔ اے غالبؔ انجام کار وہ اس راہ پر چلنے لگتا جس کے تم خواہش مند ہو یعنی تمہاری ڈگر

پر چلنے لگتا۔ لیکن تم نے جلدی سے کام لیا۔ کچھ دن اور جیتے ہوتے ۔

غزل ۱۷۳

آکہ مری جان کو قرار نہیں ہے　　　طاقتِ بے دادِ انتظار نہیں ہے

فرماتے ہیں ۔ جلدی سے آجا اور آنے میں تاخیر سے کام نہ لے ۔ میری جانِ زار میں اب صبر و قرار کی طاقت بالکل نہیں ہے اور ۔ بے داد سہنے کی طاقت بھی ختم ہو چکی ہے ۔

دیتے ہیں جنّت ۔ حیاتِ دہر کے بدلے　　　نشّہ بہ اندازۂ خمار نہیں ہے

فرماتے ہیں ۔ اللہ تعالیٰ وعدہ فرماتا ہے کہ دنیاوی زندگی کے عوض میں جنّت اور حیاتِ ابدی عطا فرماؤں گا ۔ مگر مرزا صاحب فرماتے ہیں کہ دنیاوی تکلیف اور مصائب جو اس کی راہ میں برداشت کرتا ہے اور انجام کار اپنی جان دے دیتا ہے وہ کافی نہیں ۔ خمار کے وقت شرابی کو تھوڑی شراب دینے پر اس کا خمار نہیں اترتا یعنی اس کا دردِ سر یا بدن کا ٹوٹنا ختم نہیں ہوتا ۔ اس مثال سے بہت کمزور معنی بنتے ہیں جو میرے دل کو نہیں بھاتے ۔ میں مصرعہ ثانی سے یہ سمجھتا ہوں کہ نشہ کے معنی یہاں مرزا غالبؔ اُمیدوں اور آرزوؤں کے لیتے ہیں ۔ ہمیں فلاں چیز کا نشہ ہے کہ یا تو وہ ہمارے پاس ہے یا ہمیں ملنے کی امید ہے ۔ معنی یہ بنے گے ۔ کہ جو اللہ تعالیٰ دے گا ہماری امیدیں اُس سے کہیں زیادہ ہیں ۔ صرف جنّت سے ہماری تسلّی نہ ہوگی بلکہ ہمیں تو اپنے محبوب کا دیدار بھی چاہیئے ۔

گریہ نکالے ہے تری بزم سے مجھ کو　　　ہائے کہ رونے پہ اختیار نہیں ہے

فرماتے ہیں ۔ تیری بزم میں بیٹھ کر رونا اور گریہ وزاری کرنا باعثِ بدنامی ہے لہٰذا میں بزم میں ٹھہر نہیں سکتا۔ افسوس کہ میرا رونا مجھے تیری بزم کی صحبت سے محروم کرتا ہے اور رونے پر مجھے اختیار نہیں ہے ۔

ہم سے عبث ہے، گمانِ رنجشِ خاطر　　　خاک میں عشّاق کی غبار نہیں ہے

فرماتے ہیں ۔ ہم لوگوں پر رنجشِ خاطر کا گمان بے فائدہ ہے ۔ عشاق تو ایک مشتِ خاک سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے مرنے کے بعد غبارِ خاطر کہاں سے آئے گا ۔

دل سے اُٹھا لطفِ جلوہ ہائے معانی　　　غیرِ گل آئینہ بہار نہیں ہے

فرماتے ہیں۔ جلوۂ معانی دل میں اسی طرح نظر آتا ہے جس طرح آئینۂ گل میں بہار کا حسن وجمال دکھائی دیتا ہے لہٰذا تو لے غالبؔ جلوہ ہائے معانی سے لطف اندوز ہو۔

قتل کا میرے کیا ہے عہد تو بارے　　　وائے ! اگر عہد استوار نہیں ہے

فرماتے ہیں ۔ محبوب نے انجام کار میرے قتل کرنے کا عہد تو کر لیا ہے ۔ خدا کا شکر ہے مگر خطرہ یہ ہے کہ اگر اس کا عہد پختہ نہیں ہے تو کیا بنے گا ۔

تو نے قسم مے کشی کی کھائی ہے غالبؔ　　　تیری قسم کا کچھ اعتبار نہیں ہے

فرماتے ہیں ۔ اے غالبؔ تو نے قسم مے کشی کی کھائی ہے ۔ مگر پتہ نہیں کہ تیرا مطلب ترکِ مے کشی ہے یا مے کشی کرتے رہنے کی ۔ اور یہ دونوں تیری قسم سے پوری طرح واضح نہیں ہیں تو ہم تیری قسم کا اعتبار کیسے کریں ۔ کیا سمجھیں ۔

غزل ۱۷۵

ہجومِ غم سے یاں تک سرنگونی مجھ کو حاصل ہے
کہ تارِ دامن و تارِ نظر میں فرق مشکل ہے

فرماتے ہیں۔ میرے لئے اس قدر ہجومِ غم ہے کہ میں اپنا سر اپنی زانو پہ دھرے بیٹھا رہتا ہوں اور اس لئے تارِ دامن یا تارِ نظر میں فرق کرنا مشکل امر ہے۔

رفوئے زخم سے مطلب ہے لذّت زخمِ سوزن کی
سمجھیو مت کہ پاسِ درد سے دیوانہ غافل ہے

فرماتے ہیں۔ زخم کے سلوانے میں جو بار بار سوئی سے زخم لگتے ہیں مجھ کو وہ لذّتِ سوزن درکار ہے اس لذّت سے میں مسرور و مدہوش رہتا ہوں اور پھر تڑپتا ہوں لہٰذا یہ نہ سمجھنا کہ درد سے دیوانہ غافل ہے بلکہ مجھے ہر دم پاسِ درد ہے۔

وہ گُل جس گُلستاں میں جلوہ فرمائی کرے غالبؔ
چٹکنا غنچۂ گُل کا صدائے خندۂ دل ہے

فرماتے ہیں۔ وہ گُل اندام جس باغ میں جلوہ افروزی کرتا ہے اس کے حُسن و جمال سے شرمندہ ہو کر کلیاں چٹکنے لگتی ہیں اور اُن غنچوں کے چٹکنے پر جو صدا نکلتی ہے وہ خندۂ دل ہے یعنی باغ کا دل بھی باغ باغ ہو جاتا ہے۔

غزل ۱۷۶

پا بہ دامن ہو رہا ہوں، بس کہ میں صحرا نورد

خارِ پا ہیں جوہرِ آئینۂ زانو مجھے

فرماتے ہیں ۔ میں تو جنونِ عشق کے باعث دشت وصحرا کی خاک چھاننا پسند کرتا تھا اب جو میں پاؤں سکیڑ کر پا بہ دامن نظر آتا ہوں اسکی وجہ یہ ہے کہ زمانہ صحرانوردی میں جو کانٹے لگے تھے ان سے پیر بُری طرح زخمی ہو گئے ہیں۔ زانو کو آئینہ سے اور جوہرِ آئینہ کو کانٹوں سے تشبیہ دی ہے ۔

دیکھنا حالت مرے دل کی ہم آغوشی کے بعد

ہے نگاہِ آشنا تیرا سرِ ہر مُو مجھے

فرماتے ہیں۔ ہم آغوشی کے بعد میرے دل کی مسرت قابلِ دید ہو گی ۔ چونکہ یہ دل تیری زلفوں کا اسیر ہے اور یہ اِک اِک بال سے آشنا ہے ۔جب دو دوست دو آشنا ملتے ہیں اُن کی خوشی کا عالم دیدنی ہوتا ہے ۔

ہُوں سراپا سازِ آہنگِ شکایت کچُھ نہ پُوچھ

ہے یہی بہتر کہ لوگوں میں نہ چھیڑے تو مجُھے

فرماتے ہیں ۔ میں تو سر سے پیر تک سازِ آہنگِ شکایت ہوں ۔ میرے اندر شکایتوں کے راگ بھرے پڑے ہیں ۔ غیروں کے سامنے مجھے کبھی نہ چھیڑنا اس میں تیری ہی بدنامی کا خطرہ ہے

غزل ۱۷۷

جس بزم میں تُو ناز سے گفتار میں آوے

جاں کالبدِ صُورتِ دیوار میں آوے

فرماتے ہیں ۔ جس بزم میں تو ناز و ادا کے ساتھ باتیں کرے وہاں پر ٹنگی ہوئی تصویروں میں بھی جان پڑ جاتی ہے ۔ (کالبد ۔ جسم ، پیکر ، تصویر)

سایہ کی طرح ساتھ پھریں سرو و صنوبر

تو اِس قدِ دلکش سے جو گلزار میں آوے

فرماتے ہیں ۔ سایہ کی طرح سرو و صنوبر چمن میں تیرے ساتھ ہولیں گے اگر تو کبھی اپنے اس قدِ دلکش کے ساتھ گلزار میں چلا جائے ۔ یہ محبوب کے قدِ موزوں کی طرف اشارہ ہے ۔

تب نازِ گراں مائگیِ اشک بجا ہے

جب لختِ جگر دیدۂ خونبار میں آوے

فرماتے ہیں ۔ ہم اپنے آنسوؤں کو اس وقت انمول موتی سمجھیں گے جب ہمارے جگر کے ٹکڑے بھی دیدۂ خونبار کے راستے آنسوؤں کے ساتھ آئیں اور ہمارے دامن پر لالہ کاری کریں ۔ اسی مفہوم کا حامل غالب کا یہ شعر بھی ہے ۔

رگوں میں دوڑتے پھرنے کے ہم نہیں قائل

جب آنکھ ہی سے نہ ٹپکا تو پھر لہو کیا ہے

دے مجھ کو شکایت کی اجازت کہ ستم گر!

کچھ تجھ کو مزا بھی مرے آزار میں آوے

فرماتے ہیں۔ اے ستم گر اگر چاہتا ہے کہ تجھے پتہ چلے کہ تیرے ظلم وستم نے میرے ساتھ کیا سلوک کیا اور کیا قیامت برپا کی ہے۔ تو مجھے شکایت کی اجازت دے تا میں تجھے بتاؤں اور اپنی داستانِ الم بیان کروں اور تو مزے لے لے کر سُنے۔

اُس چشمِ فسوں گر کا اگر پائے اشارہ

طوطی کی طرح آئنہ گفتار میں آوے

فرماتے ہیں۔ اگر اس چشمِ فسوں گر کا اشارہ پائے تو طوطی کی طرح آئینہ بھی باتیں کرنے لگے۔

کانٹوں کی زباں سوکھ گئی پیاس سے یارب

اک آبلہ پا وادیٔ پُرخار میں آوے

فرماتے ہیں۔ کانٹوں کی زبان بھی پیاس کی وجہ سے خشک ہو چکی ہے۔ اے خدا تو صحرا میں کسی ایسے دیوانے کو بھیج دے صحرانوردی کی وجہ سے جس کے پاؤں میں آبلے پڑ گئے ہوں تا صحرا کے کانٹے اپنی پیاس بجھا سکیں حقیقی طور پر اسکے معنی یوں ہونگے کہ اے خدا تو کسی فنافی اللہ کو مامور فرمادے تا یہ دنیا جو ایک صحرا بن چکی ہے وہ اگر اسکی آبیاری کرے اور دُنیا پھر سے سرسبز شاداب ہو جائے، اور روحانی پیاسوں کی پیاس بجھ سکے۔

مر جاؤں نہ کیوں رشک سے؟ جب وہ تنِ نازک

آغوشِ خمِ حلقۂ زنّار میں آوے

فرماتے ہیں۔ میرا محبوب زنّار پہننے والا ہندو ہے جس کے دوش پر زنّار دیکھ کر میں رشک سے مرا جاتا ہوں کہ وہ نازک بدن میری آغوش میں تو نہ ہو لیکن حلقۂ زنّار ہر وقت اُس کو اپنی آغوش میں لئے رہے

غارت گرِ ناموس نہ ہو گر ہوسِ زر
کیوں شاہدِ گُل باغ سے بازار میں آوے

فرماتے ہیں ۔ اگر گُل کو ہوسِ زر نہ ہو تو وہ بازار میں آکر غارت گرِ ناموس کیوں بنے۔ مطلب یہ ہے کہ ہوسِ زر بھی انسان کو اکثر ذلیل اور بے عزت کرتی ہے ۔ (ہوسِ زر ، زر کی ہوس)

تب، چاکِ گریباں کا مزا ہے دلِ نالاں
جب اِک نفس اُلجھا ہُوا ہر تار میں آوے

فرماتے ہیں ۔ اے میرے دلِ نالاں گریباں کو چاک کرنے کا مزا تب ہے جب تارِ نفس بھی گریبان کے چاک ہوتے وقت ٹوٹ کر باہر نکل آئے ۔

آتش کدہ ہے سینہ مرا رازِ نہاں سے
اے وائے ! اگر معرضِ اظہار میں آوے

فرماتے ہیں ۔ میرا سینہ رازِ نہاں کی گرمی سے آتش کدہ بنا ہوا ہے اگر وہ راز ظاہر ہو جائے تو نہ جانے کہاں کہاں آگ لگے گی اور اس کی چنگاریاں کس کس تک پہنچیں گی ۔

گنجینۂ معنی کا طلسم اُس کو سمجھئے
جو لفظ کہ غالبؔ مرے اشعار میں آوے

فرماتے ہیں ۔ اے غالبؔ میرے اشعار کا ایک ایک لفظ گنجینۂ معنی اور طلسمِ معنی سمجھنا چاہیئے۔ یعنی ہر لفظ میں معنی کے خزانے بھرے ہوئے ہیں اور طلسمِ معنی کو کھولنے کے لئے طلسم کُشا کی ضرورت ہے اور ہر کس و ناکس کی پہنچ میرے مطالب و معانی تک نہیں ہے ۔ بعرض حال میں میں نے [illegible] یا ہے ۔

غزل ۱۷۸

حسنِ مہ گرچہ بہ ہنگامِ کمال اچھا ہے
اُس سے میرا مہِ خورشید جمال اچھا ہے

فرماتے ہیں ۔ اگرچہ بدرِ کامل کا حُسن بھی اچھا ہے مگر میرا محبوب جو مہ خورشید جمال ہے وہ اس سے کہیں بہتر ہے ۔ حُسنِ انسان بھی بڑی چیز ہے نامر لیکن خُلق سے جب ہو مزین تو جمال اچھا ہے
(شارح)

بوسہ دیتے نہیں اور دل پہ ہے ہر لحظہ نگاہ
جی میں کہتے ہیں کہ مُفت آئے تو مال اچھا ہے

فرماتے ہیں ۔ میرے محبوب کی نظر بار بار میرے دل پہ پڑتی ہے کہ یہ مل جائے مگر بوسہ دینے سے صاف انکاری ہے ۔ چاہتا ہے کہ دل مفت میں مل جائے تو اچھا ہے ۔

اور بازار سے لے آئے اگر ٹوٹ گیا
جامِ جم سے یہ مرا جامِ سفال اچھا ہے

فرماتے ہیں ۔ جو کچھ بآسانی میسر آ جائے وہ اس شے سے کہیں بہتر ہے جو مشکل سے ملے یا کوشش کے باوجود بھی نہ ملے ۔ یہ نظریہ ہے جو غالب صاحب نے اس شعر میں پیش کیا ہے اور جامِ سفال کو جامِ جم پر ترجیح دی ہے ۔ فرماتے ہیں کہ جامِ جم اور مٹی کا آبخورہ ایک ہی مصرف میں آتے ہیں ۔ لیکن اگر جامِ جم ٹوٹ جائے تو اس کا بدل ملنا محال ہے لیکن مٹی کا آب خورہ تو بازار میں بآسانی مل جاتا ہے ۔

بے طلب دیں تو مزا اس میں سوا ملتا ہے

وہ گدا جس کو نہ ہو خوئے سوال اچھا ہے

فرماتے ہیں وہ شے جو بے مانگے اور بے طلب مل جائے اس کی لذت کا کیا کہنا ہے۔ اس کا لطف ہی زیادہ ہے کیونکہ سوال کرنے میں تلخی، ہے شرم ہے اگر نہ ملے تو احساس محرومی ہے اور وہ گدا جس کو ازلی بن کر مانگنے کی عادت نہ ہو وہ بھی اچھا ہے اس کو دینے کے لئے خود بخود دل میں خواہش پیدا ہوتی ہے۔ اس شعر کی انسان تعریف کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

اُن کے دیکھے سے جو آجاتی ہے مُنہ پر رونق

وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے

فرماتے ہیں۔ دُنیا جانتی ہے کہ جب دو دوست آپس میں ملتے ہیں تو خوشی و انبساط کے جذبات چہرے پر نمایاں ہو جاتے ہیں۔ مگر عاشق کو ہمیشہ یہ فکر لاحق رہتی ہے کہ کسی طرح میرے محبوب کو میری حالتِ زار کا زیادہ سے زیادہ علم ہو جائے تو میری محبّت میرے عشق پر یقین کرے گا۔ اب مشکل یہ ہے کہ محبوب پر نظر پڑتے ہی عاشق کی طبیعت جو بگڑی ہوئی تھی بحال ہو جاتی ہے اور محبوب سمجھتا ہے کہ اس کی حالت تو ٹھیک ہے۔

دیکھئے پاتے ہیں عشّاق بتوں سے کیا فیض

اک برہمن نے کہا ہے کہ یہ سال اچھا ہے

فرماتے ہیں۔ ایک نجومی پنڈت نے جو اس سال کو اچھا بتایا ہے تو ضرور ہے کہ عشّاق کو اپنے محبوبوں سے فیض پہنچے گا۔ مطلب یہ ہے کہ عاشق کو اپنے محبوب اور اس سے تعلق رکھنے والی چیزوں کے سوا اور کسی سے کچھ غرض نہیں ہے۔ وہ تو صرف اس بات کا آرزومند ہے کہ عشّاق اپنے محبوبوں کے التفات سے کس قدر فیض پاتے ہیں۔

ہم سُخن تیشے نے فرہاد کو شیریں سے کیا
جس طرح کا بھی کسی میں ہو کمال اچھا ہے

فرماتے ہیں ۔ فرہاد ایک مزدور پیشہ انسان اور شیریں خسرو پرویز کی ملکہ، فرہاد کی محبوبہ تھی ۔ ان دونوں کا اتحاد فرہاد کے تیشے کی بدولت ہوا ۔ یوں کہ فرہاد کو سنگ تراشی کے فن میں کمال حاصل تھا ۔ اور شیریں نے اس سے مطالبہ کیا تھا کہ پہاڑ کاٹ کر نہر نکالو اور اس میں دودھ بھر دو جو میرے محل میں سے گزرے اور اس کمال نے اس کو شیریں سے ہم کلام کرا دیا ۔

قطرہ دریا میں جو مِل جائے تو دریا ہو جائے
کام اچھا ہے وہ جس کا کہ مآل اچھا ہے

فرماتے ہیں ۔ فرع کا اپنی اصل کی طرف لَوٹنا سب سے اچھا ہے جس طرح قطرہ اپنی انفرادی حیثیت کھو کر اجتماعی حیثیت ، حاصل کر کے اپنا مقام بلند کر لیتا ہے اسی طرح وہ سب کام اچھے ہیں جن کا نتیجہ اچھا ہے یہ ظُلمت و نور میں تفریق جو کر سکتے ہیں ؛ اجر بھی ان کا بڑا ان کا مآل اچھا ہے (شارحا

خضر سلطاں کو رکھے خالقِ اکبر سرسبز
شاہ کے باغ میں یہ تازہ نہال اچھا ہے

شاہزادہ خضر سلطان بہادر شاہ ظفر کے صاحب زادہ تھے ۔ اُن کی مدح میں یہ شعر ہے ۔

ہم کو معلوم ہے جنّت کی حقیقت لیکن
دل کے خُوش رکھنے کو غالبؔ یہ خیال اچھا ہے

فرماتے ہیں ۔ اے غالبؔ جنّت کے متعلق جو بہت سی دُور از کار باتیں لوگ کرتے ہیں ان لوگوں کو جنّت کی

حقیقت نہیں معلوم۔ انہوں نے روحانی زندگی کو جسمانی زندگی کے مترادف خیال کر رکھا ہے اور اس کی لذتوں کے متماثل قرار دے رکھا ہے۔ ان خیالات کی حیثیت اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کہ وہ اپنے دل کو ان موہوم خیالات سے خوش کرتے ہیں۔ ہم وہاں کی روحانی زندگی کی حقیقت سمجھتے ہیں جو اس جسمانی زندگی اور اس کی لذتوں سے بالکل مختلف ہے۔

فہم قرآن سے ہوتی ہے حقیقت معلوم ؛ یہ تصور ہے حقیقت یہ خیال اچھا ہے
(شارح)

غزل ۱۷۹

غیر لیں محفل میں بوسے جام کے ہم رہیں یوں تشنہ لب پیغام کے

فرماتے ہیں۔ آپ کی محفل ناز روز منعقد ہوتی ہے اور روز ہی غیروں کو بھر بھر کے جام اپنے ہاتھوں سے پلاتے ہو اور ایک ادھر ہم ہیں کہ ہمیں بھول کر بھی اپنی بزم ناز میں نہیں بلاتے کبھی، تو ہمیں بھی، دعوت نامہ ملے ۔ شعر ہے بھر دے ساقیا اب جام کو ؛ بھول جائیں ہم غم ایام کو (شارح)

خستگی کا تم سے کیا شکوہ کہ یہ ہتھکنڈے ہیں چرخ نیلی فام کے

فرماتے ہیں۔ اپنی تباہی و بربادی کا تم سے کیا شکوہ اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں یہ تو آسمان کے ستم و جور ہیں جو نئے نئے حیلے بہانے ہماری بربادی کے تراشتا رہتا ہے۔

خط لکھیں گے گرچہ مطلب کچھ نہ ہو ہم تو عاشق ہیں تمہارے نام کے

فرماتے ہیں۔ اگر خط لکھنے کے لئے کوئی خاص بات یا مضمون نہ ہو ہم پھر بھی تمہیں خط لکھیں گے۔ ہم تمہارے نام کے عاشق ہیں۔ اظہار مطلب اگر نہیں ہے تو نہ ہو ۔۔

نامہ بر کچھ تو بتا اُس شوخ نے ؛ کیا کہا جب سن لیا پیغام کو (شارح)

رات پی زمزم پہ مَے اور صبح دم   دھوئے دھبّے جامۂ احرام کے

فرماتے ہیں ۔ ہماری شوخی تو دیکھئے کہ چاہِ زمزم پر ساری رات شراب پی جبکہ ہم حرم میں تھے اور احرام باندھے ہوئے تھے ۔ اور صبح سویرے جو دھبے رات کو احرام پر لگ گئے تھے اُن کو آبِ زمزم سے دھویا ۔ مطلب یہ ہے کہ لوگ رات بھر گناہوں میں ملوث رہتے ہیں اور صبح کے وقت زاہد و عابد بنے پھرتے ہیں ۔ دوسرے معنی جو بہت دل کو لگتے ہیں وہ یہ ہیں رات سے مراد زمانۂ شباب و جوانی اور غفلت کا ہے اور صبح سے مراد روشنی ، آگاہی ، ہدایت ہے ۔ کہ تمام جوانی کی عمر غفلت میں گذاری لیکن شکر ہے کہ صبح کے ہونے پر تمام احرامِ زندگی پر جو دھبے لگ گئے تھے نظر آ گئے اور ہم نے توبہ و استغفار کی برکت سے ان دھبّوں کو دُھو ڈالا ۔ سہ

آنسوؤں سے عمر بھر دھوتے رہے ؛ لگ گئے تھے داغ کچھ احرام کو (شارح)

دل کو آنکھوں نے پھنسایا ۔ کیا مگر   یہ بھی حلقے ہیں تمہارے دام کے

فرماتے ہیں ہماری آنکھوں نے ہمارے دل کو جال میں پھنسا کر جو قید کیا ہے پتہ چلتا ہے کہ ہماری آنکھیں تمھارے حُسن و جمال نے لے کر اپنے دام کے حلقے بنالئے اور اس وجہ سے ہم تمہارے عشق میں گرفتار ہیں ۔

دل مرا اک خوبصورت پھول تھا ؛ دے دیا ناصرؔ کسی گلِ فام کو (شارح)

شاہ کی ہے غسلِ صحت کی خبر   دیکھیئے دن کب پھریں حمّام کے

فرماتے ہیں ۔ بادشاہ کے غسلِ صحت کی خبر گرم ہو رہی ہے ۔ ہم بھی منتظر ہیں کہ کیا حمّام کی قسمت جاگ جاتی ہے یعنی بادشاہ غسلِ صحت سے اُس کو عزت بخشتا ہے ۔

عشق نے غالبؔ نکمّا کر دیا   ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

مطلب صاف اور سیدھا ہے ۔ پھر بھی بہت پُر لطف ہے ۔

غزل ۱۸۰

پھر اس انداز سے بہار آئی کہ ہوئے مہر و مہ تماشائی

فرماتے ہیں۔ دوبارہ موسمِ بہار اس انداز کے ساتھ آیا ہے کہ مہر و ماہ بھی تماشائی ہو گئے ہیں۔

؎ دل و نگاہ میں تصویرِ یار رہتی ہے ٭ مرے چمن میں ہمیشہ بہار رہتی ہے (صادق دہلوی)

دیکھو اے ساکنانِ خطۂ پاک اس کو کہتے ہیں عالم آرائی

فرماتے ہیں۔ اے خطۂ زمین پر بسنے والو دیکھو کیسی بہار آئی ہے جس کی وجہ سے سارا عالم آراستہ و پیراستہ ہے

کہ زمیں ہو گئی ہے سر تا سر روکشِ سطحِ چرخِ مینائی

فرماتے ہیں۔ ساری زمین پر بہار نے سبزہ و گل اس طرح اگایا ہے کہ زمین کی سطح سبزہ سے ڈھک کر نیلگوں آسماں کا مقابلہ کر رہی ہے۔

سبزے کو جب کہیں جگہ نہ ملی بن گیا روئے آب پر کائی

فرماتے ہیں۔ سبزے کے لئے زمین پر جگہ نہ تھی تو وہ روئے آب یعنی پانی پر کائی کی شکل میں نمودار ہو گیا۔

سبزہ و گل کے دیکھنے کے لئے چشمِ نرگس کو دی ہے بینائی

فرماتے ہیں۔ چشمِ نرگس کو اندھا خیال کیا جاتا ہے مگر باغبانِ عالم نے اس کو بینائی عطا کی ہے
تاکہ سبزہ و گل اور اس بہار کو دیکھے۔

ہے ہوا میں شراب کی تاثیر بادہ نوشی ہے بادپیمائی

فرماتے ہیں۔ اب جبکہ موسمِ بہار کی ہوا میں ایسی تاثیر ہے کہ وہ مست کئے دیتی ہے تو بادہ نوشی
کر کے ہم کیوں فضول کام کریں۔

کیوں نہ دُنیا کو ہو خوشی غالبؔ شاہِ دیندار نے شفا پائی

فرماتے ہیں۔ اے غالبؔ ہمارے دیندار بادشاہ نے بیماری سے شفا پائی ہے تو سارے لوگ
خوشی کیوں نہ منائیں۔

غزل ۱۸۱

تغافل دوست ہوں میرا دماغِ عجز عالی ہے
اگر پہلو تہی کیجیے، تو جا میری بھی خالی ہے

فرماتے ہیں۔ میں گوشہ نشین تغافل پسند انسان ہوں۔ میری فطرت میں عاجزی و خاکساری ہے۔
مجھ سے اگر کوئی بے التفاتی کرتا ہے تو میں التفات کے بدلے تغافل زیادہ پسند
کرتا ہوں۔ اگر کوئی مجھ سے پہلو تہی کرتا ہے تو گویا وہ میرے لئے پہلو میں جگہ خالی کر رہا
ہے۔ ع کیونکر نہ ہو غرور مجھے اپنے عجز پر
یہ شے وہ ہے جو پاس نہیں کردگار کے
حضرت مختار شاہجہانپوری

رہا آباد عالم اہلِ ہمت کے نہ ہونے سے

بھرے ہیں جس قدر جام و سبو میخانہ خالی ہے

فرماتے ہیں۔ یہ عالم اس وجہ سے آباد ہے کہ اہلِ ہمت یہاں نہیں ہیں اگر وہ ہوتے تو دُنیا کو حقیر جانتے اور اس کی طرف ان کی توجہ نہ ہوتی۔ اور دُنیا اس رنگ میں نہ ہوتی جس رنگ میں اب ہے یعنی جیسے مے کدہ میں شراب کا شکوں کو بھرا رہنا اس بات کی دلیل ہے وہاں میخوار نہیں ہیں۔

غزل ۱۸۲

کب وہ سُنتا ہے کہانی میری　　　اور پھر وہ بھی زبانی میری

فرماتے ہیں۔ پہلی مشکل تو یہی درپیش ہے کہ وہ میرا حال احوال جاننا ہی نہیں چاہتا۔ اور اگر کسی طرح مان بھی جائے تو اُسے دوسرا عذر سننے میں یہ۔ ہے کہ میں تمہاری زبانی نہیں سنوں گا۔ الفاظ کی بندش، حُسنِ بیان یہ سب ناقابل بیان ہے۔

خلشِ غمزۂ خوں ریز نہ پوچھ　　　دیکھ خوں نابہ فشانی میری

فرماتے ہیں۔ خلشِ غمزہ خوں ریز کے متعلق مجھ سے سوال نہ کر میں اس خلش کو بیان نہیں کر سکتا۔ دل زخمی ہو چکا ہے۔ جگر لخت لخت ہے اور ہر دم خون کے آنسو بہا رہا ہوں۔ اسی سے خلش کا اندازہ لگا لے۔

کیا بیاں کر کے مرا روئیں گے یار؟ مگر آشفتہ بیانی میری

فرماتے ہیں ۔ مجھ میں ایسی کوئی خوبی نہیں جس کو میرے دوست احباب یاد کر کے میرا ذکر خیر کریں البتہ اگر میں کسی کو یاد بھی آیا تو آشفتہ بیانی کے سبب سے یاد آؤں گا۔ کس قدر کسرِ نفسی ہے ۔

ہوں زخود رفتہ بیدائے خیال بھول جانا ہے نشانی میری

معنی ۔ بَیدا ۔ بیابان ، دشت ، صحرا

فرماتے ہیں ۔ صحرائے خیال کا از خود رفتہ ہوں۔ یعنی احباب کو میرا خیال کبھی نہیں آتا۔ یہی میری نشانی ہے ۔

مَتقابل ہے مَقابل میرا رُک گیا۔ دیکھ روانی میری

فرماتے ہیں ۔ میرا ہم عصر مقابل تو آیا مگر جب اُس نے میری روانی دیکھی تو مقابلہ کی تاب نہ لا سکا اور رُک گیا۔

قدرِ سنگ سرِ رہ رکھتا ہوں سخت ارزاں ہے گرانی میری

معنی ۔ گرانی = مہنگائی ، بیش قیمت ہونا ۔ بھاری پن

فرماتے ہیں ۔ میری قدر اُس پتھر کی مانند ہے جو سر راہ پڑا ہوا ہو۔ ہر شخص آتے جاتے اُس پر پیر رکھ کر گزر جاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ میں ہوں تو گراں قدر مگر بے قدر ہوں اس لئے میری گرانی بہت سستی ہے ۔

گردِ بادِ رہِ بے تابی ہوں صرصرِ شوق ہے بانی میری

فرماتے ہیں ۔ میں بگولے کی طرح بے قرار و بے تاب ہوں اور رہ گزر بیتابی کا گرباد ہوں۔ شوق کی تند و تیز ہوائیں مجھے بگولے کی طرح پیچ و تاب میں رکھتی اور اڑائے لئے پھرتی ہیں۔

دہن اس کا جو نہ معلوم ہوا   کھل گئی ہیچ مدانی میری

فرماتے ہیں ۔ محبوب کا دہن اتنا تنگ اور خوبصورت ہے کہ اس پر النادر کالمعدوم کی مثال صادق آتی ہے میں اس کی کم سخنی سے اس کے دہن کو تلاش نہ کر سکا۔ اس لئے میری کم علمی کا پردہ چاک ہو گیا۔

کر دیا ضعف نے عاجز غالبؔ   ننگ پیری ہے جوانی میری

فرماتے ہیں ۔ اے غالبؔ میں جوانی میں بھی اس درجہ کمزور و ناتواں ہوں کہ دوسرے لوگ بڑھاپے میں بھی اس قدر ناتواں اور کمزور نہیں ہوتے۔ یعنی میری جوانی پیری کو بھی شرما رہی ہے۔

غزل ۱۸۳

نقش نازِ بتِ طناز بہ آغوشِ رقیب   پائے طاؤس پئے خامۂ مانی مانگے

فرماتے ہیں۔ اس بتِ طناز کی تصویر آغوشِ رقیب میں بے جوڑ معلوم ہوتی ہے۔ ایسی تصویر کی مصوری کے لئے بالوں والا برش (موقلم) نہیں بلکہ دستِ مانی میں طاؤس کے پیر ہونے چاہئیں۔ مانی ایران کا مشہور مصور طاؤس کے پر و بال جسم حسین و جمیل ہوتا ہے اور پاؤں بدصورت اس لیے پائے طاؤس سے آغوشِ رقیب کا نقشہ کھینچا ہے۔

تو وہ بدخو کہ تحیّر کو تماشا جانے   غم وہ افسانہ کہ آشفتہ بیانی مانگے

فرماتے ہیں۔ تحیّر میں خاموشی لازمی ہے اور تو ایسا بدخو ہے کہ تحیّر کو تماشا سمجھ رہا ہے اور میرا غم وہ افسانہ ہے جسے بیان کیا جائے تو آشفتہ بیانی پر محمول کیا جائے گا۔ لیکن تو میری حیرت اور آشفتہ بیانی کو بھی ایک تماشا جان کر اپنی بیزاری کا اظہار کرتا ہے۔

وہ تپِ عشقِ تمنّا ہے کہ پھر صورتِ شمع شعلہ تا نبضِ جگر ریشہ دوانی مانگے

فرماتے ہیں مجھ کو ایسی گرمیٔ عشق کی تمنّا ہے کہ شمع کی مانند شعلہ جگر تک دوڑنے والا ہو اور میری رگ رگ میں اُس کی گرمی پہنچے۔

غزل ۱۸۴

گلشن کو تری صحبت ازبس کہ پسند آئی ہے

ہر غنچے کا گُل ہونا آغوش کُشائی ہے

فرماتے ہیں۔ باغ کو تیری صحبت سے مسرور و فیض یاب ہونا بہت پسند آیا ہے۔ یہاں تک کہ ہر غنچے نے گل بن کر یہ کہا ہے کہ میری آغوش تجھ سے بغل گیر ہونے کے لئے بیتاب ہے۔

واں کنگرِ استغنا ہر دم ہے بلندی پر

یاں نالے کو اور اُلٹا دعوائے رسائی ہے

فرماتے ہیں۔ اُن کے استغنا کا کنگرہ ہر وقت بلند سے بلند تر ہوتا چلا جا رہا ہے اور ادھر معاملہ بالکل برعکس ہے۔ ہمارا نالہ دن بدن نیچے کی طرف آ رہا ہے۔ یعنی اب وہ دل سے نکل کر ہونٹوں تک بھی نہیں پہنچتا۔

از بس کہ سکھاتا ہے غمِ ضبط کے انداز ے
جو داغ نظر آیا اِک چشم نمائی ہے

معنی ۔ چشم نمائی = آنکھوں کے ذریعہ تنبیہ کرنا ۔
فرماتے ہیں ۔ غم عشق مجھ کو ضبط کی تعلیم دیتا رہتا ہے ۔ دل پر جب کوئی نیا داغ لگتا ہے تو اس کو ضبط غم کی چشم نمائی سمجھنا چاہیئے ۔ ؎ اس طرح غم کو مٹانا چاہیئے
زندگی بھر مُسکرانا چاہیئے (شارح)

غزل ۱۸۵

جس زخم کی ہو سکتی ہو تدبیر رفو کی لکھ دیجیو یارب اسے قسمت میں عدو کی

فرماتے ہیں ۔ جس زخم کو ٹانکے لگ سکتے ہوں ۔ یعنی اُس کو سیا جا سکتا ہو وہ مجھے نہیں چاہیئے ۔ اے میرے خُدا تو اُسے میرے دشمن کی قسمت میں لکھ دینا ۔ مجھے ایسا زخم درکار ہے جس کا علاج کوئی چارہ گر نہ کر سکے ۔ مطلب یہ ہے کہ میرا زخم عشق ہمیشہ ہی ہرا رہے اور میں تیرا اسیر عشق ہر حال میں رہوں ۔

اچھّا ہے سرِ انگشتِ حنائی کا تصوّر دل میں نظر آتی تو ہے اک بوند لہو کی

فرماتے ہیں ۔ اشکِ خوں اس قدر بہائے کہ اب دل میں ایک بوند بھی لہو کی باقی نہیں رہی ۔ ایسی حالت میں دوست کی انگشتِ حنائی کا تصوّر ہی غنیمت ہے ۔ دل میں نظر آتی " تو " ہے اک بوند لہو کی لفظ " تو " نے شعر کو پُرمعنی و پُرلطف بنا دیا ۔

کیوں ڈرتے ہو عشاق کی بے حوصلگی سے ؟ یاں تو کوئی سُنتا نہیں فریاد کسو کی

فرماتے ہیں ۔ اے میرے محبوب عشاق کی کم حوصلگی سے کیوں ڈرتے ہو کہ وہ تیرے ظلم و ستم کی تاب نہ

لاسکیں گے اور نالہ و فریاد پر اتر آئیں گے۔ فکر نہ کرو کیونکہ اس دنیا میں تو کوئی کسی کی سنتا ہی نہیں۔ سب کو اپنی اپنی پڑی ہے۔ ؎ غریبوں بے کسوں کا بھی سُنے حال
کسی کو اتنی فرصت ہی کہاں ہے (شارح)

دشنے نے کبھی مُنہ نہ لگایا ہو جگر کو
خنجر نے کبھی بات نہ پوچھی ہو گلو کی

فرماتے ہیں۔ دشنہ نے کبھی جگر کو مُنہ نہیں لگایا اور خنجر نے کبھی گلے کی بات نہیں پوچھی۔ یعنی تیرے ظلم و ستم کا رُخ کبھی ہماری طرف ہوا ہی نہیں
عشق میں ناکامیاں ہیں جلوہ گر کچھ اس طرح ؎ ہر نفس اک داغِ دل ہے آہِ بے اثر کا (شارح)

صد حیف وہ ناکام کہ اک عمر سے غالب
حسرت میں رہے ایک بتِ عربدہ جو کی

فرماتے ہیں۔ اے غالب تیری ناکام تمنا پر ہمیں بہت افسوس ہے کہ برسوں سے تو اک بتِ عربدہ جُو کی تلاش میں سرگرداں ہے لیکن کامیاب نہ ہو سکا۔

غزل ۱۸۶

سیماب پشتِ گرمیٔ آئینہ دے ہے ہم
حیراں کیے ہوئے ہیں دلِ بے قرار کے

فرماتے ہیں۔ جس طرح سیماب کی گرمی سے آئینہ روشن ہو کر صورت گر بن جاتا ہے اسی طرح میرے شیشۂ دل نے مجھے بے قرار کر کے مُجسّم حیرت بنا دیا ہے۔
رگ رگ میں عشق ہے مرے جسمِ نزار کے ؎ کیا حوصلے ہیں دیکھئے مُشتِ غبار کے (شارح)

آغوشِ گل کشودہ برائے وداع ہے
اے عندلیب چل کہ چلے دن بہار کے

فرماتے ہیں۔ پھول کھلنے کے ساتھ ہی اپنے ہاتھ پھیلاتے ہیں کہ آؤ گلے مل لو ہم جانے کے لئے تیار ہیں۔ تو اے بلبل پھولوں کا کھلنا دراصل پیغامِ وداع ہے۔

غزل ۱۸۷

ہے وصل ہجر عالمِ تمکین و ضبط میں
معشوقِ شوخ و عاشقِ دیوانہ چاہیئے

فرماتے ہیں۔ اگر محبوب خود دار و باتمکین ہے اور عاشق صبر و ضبط کا حامل۔ ہے تو وصل میں بھی ہجر کا عالم ہوگا۔ محبوب کا شوخ و بیباک ہونا اور عاشق کا دیوانہ اور گستاخ ہونا ہی وصل کی کامیابی کا راز ہے۔

اُس لب سے مِل ہی جائے گا بوسہ کبھی تو ہاں
شوقِ فضول و جرأتِ رندانہ چاہیئے

فرماتے ہیں۔ کبھی تو اس کے لبوں کا بوسہ ہمیں مل ہی جائے گا لیکن اس کے لئے بے حد شوق اور جرأتِ رندانہ کی ضرورت ہے۔

غزل ۱۸۸

چاہیئے اچھوں کو جتنا چاہیئے　　یہ اگر چاہیں تو پھر کیا چاہیئے

فرماتے ہیں۔ حسینوں سے محبت کرو اور اگر یہ بھی تم سے محبت کرنے لگیں تو پھر اور کیا چاہیئے۔ لیکن غالب صاحب نے "اچھوں" کہا ہے جس کا مطلب یہ بھی ہے کہ محبت اچھے لوگوں سے کرنی چاہیئے اور

اگر وہ بھی تم سے محبت کریں تو سونے پر سہاگہ ۔

صحبتِ رنداں سے واجب ہے حذر　　جائے مے اپنے کو کھینچا چاہیئے

فرماتے ہیں ۔ رندوں کی صحبت سے بچنا چاہیئے اور شراب سے اپنے آپ کو بچانا چاہیئے یعنی شراب سے اجتناب کرنا چاہیئے ۔

چاہنے کو تیرے کیا سمجھا تھا دل　　بارے اب اس سے بھی سمجھا چاہیئے

فرماتے ہیں ۔ میرے دل نے تجھ سے عشق و محبت کرنا کھیل سمجھا تھا ۔ اور یہ اس کو دل لگی اور سہل سمجھتا تھا اب ہمیں اس دل سے ضرور بدلہ لینا چاہیئے ضبطِ عشق اور رنج و غم جھیلنے کی اگر طاقت نہ تھی تو کیوں عشق کیا تھا ۔ اب رات دن ہائے ہائے کرتا ہے ۔ نالہ و فریاد کرتے کرتے تھک گیا ہے ۔

چاک مت کر جیب بے ایامِ گُل　　کچھ اُدھر کا بھی اشارہ چاہیئے

فرماتے ہیں ۔ جب تک پھول اپنا گریبان چاک نہیں کرتے تو بھی اپنا گریبان چاک نہ کر (پھول کا کھلنا پھول کا گریبان چاک کرنا ہے) قدرت کے نظام پر نظر رکھنی چاہیئے ہر کام کو اس کے مناسب وقت پر کرنا چاہیئے ۔ شعر کی تعریف نہیں کی جاسکتی ۔ اتنے تھوڑے لفظوں میں اتنے بڑے مضمون کو ادا کیا ہے کہ اس پر کتابیں لکھی گئیں ہیں اور لکھی جاسکتی ہیں ۔

دوستی کا پردہ ہے بیگانگی　　مُنہ چھپانا ہم سے چھوڑا چاہیئے

فرماتے ہیں ۔ تم جو ہم سے بیگانہ وار پردہ کرتے ہو یعنی پردہ کرتے بھی ہو اور اس طرح سے کرتے ہو کہ ہم تمہارے حُسن کی جھلکیاں بھی دیکھتے رہیں ۔ اس طرح سے دیکھنے والوں پر راز کُھل جائے گا آپ ہم سے محبت کرتے ہیں لہٰذا پردہ بالکل نہ کرو ۔

دشمنی نے میری کھویا غیر کو　　کس قدر دشمن ہے دیکھا چاہیئے

فرماتے ہیں ۔ میری دشمنی میں غیر نے اپنے آپ کو تباہ و برباد کرلیا ۔ وہ میرا کس قدر دشمن نکلا ۔

اپنی رسوائی میں کیا چلتی ہے سعی　　یار ہی ہنگامہ آرا چاہیئے

فرماتے ہیں ۔ ہماری بدنامی کی کنجی بھی محبوب کے پاس ہے ۔ وہ جب چاہے ہنگامہ آرا ہو کر اپنے حسن سے ہمیں مضطرب و بے قرار بنا دے اور ہمارا اضطرار اور بے قرار ہونا ہماری بدنامی اور رسوائی کا باعث بنے ۔

منحصر مرنے پہ ہو جس کی اُمید　　نا اُمیدی اُس کی دیکھا چاہیئے

فرماتے ہیں ۔ جس نے اپنی ساری مصیبتوں کا علاج موت کو سمجھا ہو اور اس کی ساری امیدوں کی تان موت پر ہی ٹوٹتی ہو ۔ اُس کی نااُمیدی قابلِ عبرت ہے ۔

غافل اِن مہ طلعتوں کے واسطے　　چاہنے والا بھی اچھا چاہیئے

فرماتے ہیں ۔ اے غافل بوالہوس ان مہ جبینوں سے عشق و محبت کرنے والا بھی اسی کی طرح خوبصورت وضع دار باتہذیب انسان ہونا چاہیئے تاکہ زندگی میں کوئی تلخی پیدا نہ ہو ۔

چاہتے ہیں خوب رُویوں کو اسدؔ　　آپ کی صورت تو دیکھا چاہیئے

فرماتے ہیں ۔ کیا خوب اسدؔ جیسی بھونڈی صورت والا بھی حسینوں سے محبّت کا دعویدار ہے ۔ ذرا آپ کی صورت تو ملاحظہ کیجیئے ۔ کیا کسرِ نفسی ہے حالانکہ مرزا صاحب بہت حسین وجمیل شخصیت والے انسان تھے

غزل ۱۸۹

ہر قدم دوریٔ منزل ہے نمایاں مجھ سے　　میری رفتار سے بھاگے ہے بیاباں مجھ سے

فرماتے ہیں۔ جتنی تیزی سے میں منزل کی طرف بڑھتا ہوں۔ اتنا ہی منزل کا فاصلہ مجھ سے بڑھتا جاتا ہے کم ہونے میں نہیں آتا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے بیاباں مجھ سے ڈر کر بھاگ رہا ہے۔

درسِ عنوانِ تماشا۔ بہ تغافل خوش تر　　ہے نگہ رشتۂ شیرازۂ مژگاں مجھ سے

فرماتے ہیں۔ تماشائے عالم سے عبرت کا سبق بھی حاصل کرنا تغافل کے ساتھ خوش تر ہے۔ میری نگہ تو شیرازۂ مژگاں رشتہ بنی رہتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ میں دنیا کا تماشا ایک اچٹتی نظر ڈال کر کرتا ہوں کہ کہیں میں خود بھی اس تماشے کا حصہ نہ بن جاؤں۔ شاذ ہی میری نظر آنکھ کے پردہ سے باہر آتی ہے۔

وحشتِ آتشِ دل سے شبِ تنہائی میں　　صورتِ دود رہا سایہ گریزاں مجھ سے

فرماتے ہیں۔ میرے آتشِ دل کی وحشت سے فراق کی راتوں میں سایہ تک مجھ سے دھوئیں کی مانند بھاگ جاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ مصیبت کے وقت جو اپنا ہے وہ بھی کام نہیں آتا۔

غمِ عشاق، نہ ہو سادگی آموزِ بتاں　　کس قدر خانۂ آئینہ ہے ویراں مجھ سے

فرماتے ہیں۔ خدا ایسا نہ کرے کہ غمِ عشاق محبوبوں کو سادگی کی تعلیم دے جس کے نتیجہ میں حسینانِ جہاں سادہ رہنا شروع کر دیں۔ نہ بناؤ سنگار کریں نہ زینت و آرائش سے کام لیں اگر ایسا ہوا تو خانۂ آئینہ

ویران ہو جائے گا۔ اور کسی حسین کو اس کی ضرورت نہ رہے گی۔

اثرِ آبلہ سے جادۂ صحرائے جنوں　　　صورتِ رشتۂ گوہر ہے چراغاں مجھ سے

فرماتے ہیں۔ جادۂ صحرائے جنوں میرے پاؤں کے چھالوں کے پھوٹنے کی وجہ سے رشتہ گوہر کی مانند روشن ہو گیا۔

بے خودی بسترِ تمہیدِ فراغت ہو جو　　　پُر ہے سایے کی طرح میرا شبستاں مجھ سے

فرماتے ہیں۔ کاش میری بیخودی میرے لئے بسترِ تمہید فراغت بن جائے اور میرا راحت و آرام کرنے کا کمرہ مجھ سے سایہ کی طرح ہر وقت بھرا رہے۔ مطلب یہ ہے کہ مجھے فکر و آلامِ دُنیا سے پوری طرح نجات مل جائے اور میں وہ کام کرسکوں جو اب تک فکرِ دُنیا کی وجہ سے نہ کر سکا۔

شوقِ دیدار میں گر تو مجھے گردن مارے　　　ہو نگہ مثلِ گُلِ شمع پریشاں مجھ سے

فرماتے ہیں۔ اگر شوقِ دیدار کی حالت میں تو میرا سر کاٹ دے۔ تو میری نگاہیں اور بھی روشن ہو کر تیرے دیدار کی مشتاق ہو جائیں گی جیسے شمع کا گُل کتر دینے سے شمع کی روشنی میں اضافہ ہو جاتا ہے۔

بے کسی ہائے شبِ ہجر کی وحشت ہے ہے　　　سایہ خورشیدِ قیامت میں ہے پنہاں مجھ سے

فرماتے ہیں۔ شبِ ہجر کی بے کسی و بے بسی اور وحشت کا حال کیا کہوں۔ افسوس ہے کہ میرا سایہ تک مجھ سے ڈر کر بھاگا اور خورشیدِ قیامت میں جا چھپا ہے۔

گردشِ ساغرِ صد جلوۂ رنگیں تجھ سے　　　آئینہ داریِ یک دیدۂ حیراں مجھ سے

فرماتے ہیں۔ تیرا جلوۂ رنگین بزم میں ساغر کی طرح شراب پلا کر ہوش رُبا بن گیا ہے اور میرا

دیدۂ حیراں آئینہ داری کی طرح ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تیرے حسن کے جادو سے بزم میں
لوگ مسحور و مدہوش ہیں اور میرے عشق سے دیدۂ حیرت میں جا پڑے ہیں۔

نگہِ گرم سے اک آگ ٹپکتی ہے اسدؔ　　　ہے چراغاں خس و خاشاکِ گلستاں مجھ سے

فرماتے ہیں۔ اے اسدؔ میں، جو فراقِ یار میں دل کو بہلانے کی غرض سے گلستان گیا تو آتشِ عشق نے
حسنِ یار کے خیال سے میرے تن بدن میں آگ لگا دی اور میری آنکھوں سے جو شعلے نکلے، انہوں
نے چمن کے خس و خاشاک کو جلا کر چراغاں کر دیا۔ مطلب یہ ہے کہ شاہدِ حقیقی جس نے اپنے حُسن
سے کچھ چمن کو دے کر اتنا حسین بنایا ہے وہ خود کیا ہے۔ بس اسی خیال نے دُنیا کو میری نظر
میں خس و خاشاک بنا دیا ہے۔ یعنی کوئی حیثیت نہیں۔

میں نے اپنے عشقِ حقیقی کی بدولت وہ گرمی حاصل کی کہ اب میری نگاہِ گرم دنیا کے خس
و خاشاک یعنی بے بضاعت لوگوں کو بھی معتبر بنانے کی صلاحیت رکھتی ہے۔

غزل ۱۹۰

نکتہ چیں ہے غمِ دل اس کو سنائے نہ بنے

کیا بنے بات جہاں بات بنائے نہ بنے

فرماتے ہیں۔ وہ شوخ بے حد نکتہ چیں واقع ہوا ہے یعنی بال کی کھال نکالتا ہے۔ اُس کو ہم غمِ دل
کیسے سنا سکتے ہیں۔ ہم کہیں گے اور وہ بات بات پر اعتراض کرے گا۔ اس کے روبرو کوئی بات
بنانی ناممکن امر ہے وہ شوخ ہی نہیں ہوشیار بھی ہے۔ لہٰذا ہماری سحر بیانی کا اس پر جادو
نہیں چلے گا۔ (بات بنانا جھوٹ بولنا)

میں بلاتا تو ہوں اُس کو مگر اے جذبۂ دل

اُس پہ بن جائے کچھ ایسی، کہ بن آئے نہ بنے

میں اس کو رات دن بُلا رہا ہوں لیکن وہ شوخ آنے کا نام ہی نہیں لیتا۔ نا امیدی کا دَور دورہ ہے۔ اے میرے جذبۂ دل تو کہاں ہے تو اپنی کشش کو کیوں بروئے کار نہیں لاتا۔ تو اُسے کھینچ اور مجبور کر دے کہ بغیر آئے اس کو بن نہ پڑے۔

کھیل سمجھا ہے کہیں چھوڑ نہ دے بھول نہ جائے

کاش یوں بھی ہو کہ بن میرے ستائے نہ بنے

فرماتے ہیں ۔ میرا محبوب ابھی کم سن ہے وہ ستم و جور مجھ پر کھیل سمجھ کر کرتا ہے مجھے یہ خوف لاحق ہے کہ وہ یہ کھیل کھیلنا چھوڑ نہ دے یا بھول ہی جائے۔ کاش وہ اس کھیل کو کبھی نہ چھوڑے نہ بھولے۔ اور اس جور و ستم سے ستائے بغیر اُسے خود چین نہ آئے۔

غیر پھرتا ہے لئے یُوں ترے خط کو کہ اگر

کوئی پوچھے کہ یہ کیا ہے تو چھپائے نہ بنے

فرماتے ہیں۔ رقیب تیرے خط کو اس طرح لئے پھرتا ہے کہ اگر اُس سے کبھی کوئی پوچھ بیٹھے کہ تیرے ہاتھ میں کیا ہے تو وہ اسے بالکل نہ چھپا سکے گا۔ مطلب یہ ہے کہ تیرا رقیب پر بھروسہ کرنا تیرے حق میں اچھا نہیں وہ ضرور ایک دن تجھ کو رسوا کرے گا۔

اِس نزاکت کا بُرا ہو وہ بھلے ہیں تو کیا

ہاتھ آئیں تو انھیں ہاتھ لگائے نہ بنے

فرماتے ہیں ۔ان کی اتنی نزاکت بھی ہمارے حق میں کوئی اچھی فال نہیں۔ وہ خود اچھے ہیں تو کیا ہوا۔ ان کی نزاکت کا تو یہ حال ہے بوقت وصل اُن کو ہاتھ لگانے سے بھی خوف آتا ہے کہ کہیں اُن کی نازکی کچھ اور رنگ نہ لے آئے ۔

کہہ سکے کون کہ یہ جلوہ گری کس کی ہے

پردہ چھوڑا ہے وہ اُس نے کہ اٹھائے نہ بنے

فرماتے ہیں " کہہ سکے کون کہ یہ جلوہ گری کس کی ہے" یعنی خدا کے علاوہ اِس جلوہ کا کوئی دعویدار نہیں ہو سکتا۔ اُس کی قدرتِ کاملہ نے اس عالم امکان کو پیدا کیا اور اپنے چہرے پر دہ پردہ ڈالا ہے کہ کسی کے اٹھانے سے یہ پردہ ہرگز اٹھ نہیں سکتا ۔

موت کی راہ نہ دیکھوں کہ بن آئے نہ رہے

تم کو چاہوں کہ نہ آؤ تو بلائے نہ بنے

فرماتے ہیں موت کی راہ دیکھنا اک فضول کام ہے وہ وقتِ معیّن پر ضرور آکر رہے گی۔ تم کو چاہوں کہ نہ آؤ۔ تو دل نہیں مانتا وہ مجبور کرتا ہے کہ تم کو ضرور بلاؤں اور اگر کچھ نہیں تو کم از کم یاد ہی کر دوں ۔

بوجھ وہ سر سے گرا ہے کہ اٹھائے نہ اُٹھے

کام وہ آن پڑا ہے کہ بنائے نہ بنے

سارے شعر کا مطلب صاف اور واضح ہے ۔

عشق پر زور نہیں، ہے یہ وہ آتش غالبؔ

کہ لگائے نہ لگے اور بُجھائے نہ بنے

فرماتے ہیں ۔ اے غالب عشق پر کسی کا زور نہیں چلتا۔ یہ تو خود عاشق کو قابو کر لیتا ہے اور یہ اک ایسی آگ ہے جو بغیر جلائے خود جلتی ہے اور اگر بجھانے کی کوشش کی جائے تو اور بھڑکتی ہے۔

غزل ۱۹۱

چاک کی خواہش اگر وحشت بہ عریانی کرے
صبح کے مانند زخمِ دل گریبانی کرے

فرماتے ہیں ۔ اگر وحشتِ دل عشق کے رازوں کو افشاں کرنے اور مجھے اس طرح عریاں کرنے کی خواہش کرے گی تو میرا زخم دل کھل جائے گا یعنی چاک ہو جائے گا اور اس صورت سے یہ نقصان ہو گا کہ صبح کی مانند جبکہ ہنستے ظاہر ہیں نظر آنے لگتی ہے۔ میرے دل میں جو عشق کا خزینہ عرصہ سے دفن ہے باہر نکل آئے گا۔ مطلب یہ ہے کہ وحشتِ دل پر قابو چاہیئے۔ (گریبانی کرنا۔ چاک کرنا)

جلوے کا تیرے وہ عالم ہے کہ گر کیجیے خیال
دیدۂ دل کو زیارت گاہِ حیرانی کرے

فرماتے ہیں ۔ تیرا جلوہ تو الگ رہا اگر تیرے جلوہ کا خیال بھی دل میں گزرے تو میرا دیدۂ دل حیرانی کی زیارت گاہ بنائے گا

ہے شکستن سے بھی دل نومید یارب کب تلک
آبگینہ کوہ پر عرضِ گراں جانی کرے

فرماتے ہیں ۔ اے خدا ہم کب تک جھوٹی امیدوں سے دل کو بہلاتے رہیں کہ ایک دن ضرور وہ سنگدل محبوب ہمارے دل کو اپنے سنگِ جفا سے ریزہ ریزہ کر دے گا ہم تو سخت ناامید ہو چکے ہیں کہ یہ سب موہوم باتیں ہیں ۔

میکدہ گر چشمِ مستِ ناز سے پائے شکست
مُوئے شیشہ دیدۂ ساغر کی مژگانی کرے

فرماتے ہیں ۔ اگر میکدے کو اس کی چشمِ مستِ ناز ہر طرح ہر میدان میں شکست دے دے اور کوئی میکدے اور شراب کی طرف رُخ بھی نہ کرے تو پھر بھی شیشۂ شراب یعنی مینا میں جو بال پڑ جائیں گے (میکدہ ٹوٹنے کی وجہ سے) وہ دیدۂ ساغر کی پلکیں بن کر ساغر کی مژگانی کریں گے یعنی دیدۂ ساغر مستِ ناز کو حیرانی سے دیکھے گا ۔

خطِ عارض سے لکھا ہے زُلف کو اُلفت نے عہد
یک قلم منظور ہے جو کچھ پریشانی کرے

فرماتے ہیں ۔ خطِ عارض جو محبوب کے رخساروں پر نمودار ہوا ہے وہ درحقیقت میری محبت کا لکھا ہوا عہد نامہ زلفوں کے نام ہے کہ جتنا چاہیں تیرے زلف و رخسار مجھ پر جور و ستم کریں پریشانی دیں سب ہمیں یک قلم منظور ہے ۔

ہم ہوئے ، تم ہوئے ، کہ میر ہوئے ؛ اُس کی زلفوں کے سب اسیر ہوئے (میر)
زاہد نے مرا حاصلِ ایماں نہیں دیکھا ؛ رُخ پہ تیری زُلفوں کو پریشاں نہیں دیکھا
(اصغر گونڈوی)

غزل ۱۹۲

وہ آکے خواب میں تسکینِ اضطراب تو دے ۔۔۔ ولے مجھے تپشِ دل مجالِ خواب تو دے

فرماتے ہیں ۔ بہت ممکن ہے کہ وہ ویسے تو نہ آئے مگر خواب میں آکر تسکینِ اضطراب دے جائے لیکن یہ قطعی ممکن نہیں ہے میری تپشِ دل مجھے سونے ہی نہیں دیتی ۔ یہ کم بخت تپشِ دل اس شوخ ستمگر سے کہیں زیادہ ظالم ہے کاش یہ سب کچھ میری طاقت میں ہوتا ۔

کرے ہے قتل لگاوٹ میں تیرا رو دینا ۔۔۔ تری طرح کوئی تیغِ نگہ کو آب تو دے

فرماتے ہیں ۔ لگاوٹ میں تیرا رو دینا میرے لئے قتل کا حکم رکھتا ہے ۔ تیرے محبت میں آنسو نہیں بلکہ وہ سان ہے جس پر تلواروں کو آب دی جاتی ہے ۔ یہ آنسو بھی بعینہٖ وہی کام کر رہے ہیں ۔ تیرِ نظر تیز سے تیز تر ہو رہے ہیں ۔ میں نہیں سمجھتا کہ کوئی اور محبوب دُنیا میں تیری طرح تیغ نگہ کو آب دینی جانتا ہو ۔

دکھا کے جُنبشِ لب ہی تمام کر ہم کو ۔۔۔ نہ دے جو بوسہ تو منہ سے کہیں جواب تو دے

فرماتے ہیں ۔ اور کسی طرح سے نہیں ، تو جنبشِ لب سے ہی تلوار کا کام لے اور اس کے ذریعہ سے ہمیں قتل کر ڈال ۔ ہم طالبِ بوسہ ہیں ، تو نہیں دینا چاہتا ۔ نہ دے مگر صاف صاف جواب تو دے یعنی بوسہ دینے سے انکار کر دے ۔ ہمارے قتل کے لئے یہی کافی ہوگا ۔

پلا دے اوک سے ساقی جو ہم سے نفرت ہے ۔۔۔ پیالہ گر نہیں دیتا نہ دے شراب تو دے

فرماتے ہیں ۔ یہ سہی ہے کہ ہم رند ہیں تیرے ہم عقیدہ نہیں۔ شاید تو یہ سمجھتا ہے کہ تیرا پیالہ گندہ ہو جائے گا۔ تو پیالہ نہ دے ہم شراب کے طالب ہیں۔ اوک لگا کر ہی پی لیں گے۔ مگر تو شراب دینے میں پس و پیش نہ کر۔

اسدؔ خوشی سے مرے ہاتھ پاؤں پھول گئے   کہا جو اُس نے ذرا میرے پاؤں داب تو دے

فرماتے ہیں ۔ جب محبوب نے مجھ سے کہا کہ ذرا میرے پاؤں تو دبا دو تو فرطِ خوشی سے میرے ہاتھ پاؤں پھول گئے ۔ اور ہم اس کے پیروں کو بھی نہ چھو سکے ۔ (ہاتھ پاؤں پھولنا ، کسی کام کو انجام نہ دے سکنا ۔

غزل ۱۹۲

تپش سے میری وقفِ کشمکش ہر تارِ بستر ہے

مرا سر رنجِ بالیں ہے مرا تن بارِ بستر ہے

فرماتے ہیں ۔ میرا تپشِ دل کی وجہ سے ہر دم تڑپتے رہنا میرے بچھونے کے ایک ایک تار کو تکلیف میں مبتلا کئے ہوئے ہے ۔ میرا سر تکیہ کے لئے اور میرا جسم بستر کے لئے بوجھ بنا ہوا ہے ۔

سرشکِ سر بہ صحرا دادہ نورالعین دامن ہے

دلِ بے دست و پا افتادہ برخوردارِ بستر ہے

فرماتے ہیں ۔ صحرا میں میرا ہر ایک آنسو دامن کی آنکھ کا نور ہے اور میرا دل بیمار بستر کا برخوردار ہے مطلب یہ ہے کہ میرے کثرتِ گریہ کی وجہ سے دامن کو آنسوؤں سے محبت ہو گئی ہے ۔ ایک قسم کا ربط ہے اور بیماری کے بستر کو میرے دلِ بیمار سے بے حد دلبستگی ہے ۔

خوشا اقبالِ رنجوری عیادت کو تم آئے ہو

فروغِ شمعِ بالیں طالعِ بیدارِ بستر ہے

فرماتے ہیں میری بیماری بہت مبارک اور بڑی قسمت والی ہے کہ تم جیسا محبوب میری عیادت کو آئے۔ تمہارا تشریف لانا شمع بالیں کو فروغِ نور بخش رہا ہے اور بستر کی قسمت بھی جاگ اُٹھی ہے۔

یہ طوفان گاہِ جوشِ اضطرابِ شامِ تنہائی

شعاعِ آفتابِ صبحِ محشر تارِ بستر ہے

فرماتے ہیں۔ اے اللہ شبِ فراق کا جوشِ اضطراب کیا بلا ہے یہ جگہ تو طوفان گاہ بن گئی ہے اس قدر تاریکی کہ ہر ایک تارِ بستر اندھیرے میں چمکنے لگا ہے اور ہر تارِ بستر آفتابِ صبحِ محشر کی گویا کرن بن گیا ہے۔

ابھی آتی ہے بو بالش سے اُسکی زلفِ مشکیں کی

ہماری دید کو خوابِ زلیخا عارِ بستر ہے

فرماتے ہیں۔ رات سے اب تک اس کی مشکیں زلفوں کی خوشبو تکیہ سے پھوٹ رہی ہے اور گرد و پیش کو معطر کر رکھا ہے خوشا قسمت کہ رات اس کا وصل نصیب ہوا۔ جس کی وجہ سے دل و دماغ میں اس کی زلفِ مشکیں کی خوشبو مہک رہی ہے۔ ہماری دید اور بستر کے لئے تو ننگ و عار ہے کہ ہم زلیخا کی طرح خواب میں نظارے کریں۔ ایسا نہیں ہمارا محبوب تو خود ہی تشریف لایا تھا۔

کہوں کیا دل کی کیا حالت ہے ہجرِ یار میں غالبؔ

کہ بیتابی سے ہر اک تارِ بستر خارِ بستر ہے

فرماتے ہیں ۔ اے غالبؔ میں تجھے کیا بتاؤں کہ ہجر یار میں دل پر کیا کیا بیت رہی ہے اور اس کی کیا حالت ہے۔ بس یہ سمجھ لے کہ تڑپتے تڑپتے کروٹیں بدلتے بدلتے بستر میں اس قدر سلوٹیں پڑ گئیں ہیں کہ ہر تار بستر خار بستر بنا ہوا ہے۔ جس سے میری بیتابی میں مزید اضافہ ہو گیا ہے ۔

غزل ۱۹۴

خطر ہے رشتۂ الفت رگِ گردن نہ ہو جائے
غرورِ دوستی آفت ہے تو دشمن نہ ہو جائے

معنی رگ گردن : کبر و غرور

فرماتے ہیں ۔ یہ ہمیشہ مقامِ خوف ہے کہ رشتۂ الفت کبر و غرور میں بدل کر آفت اور دشمنی میں تبدیل نہ ہو جائے ۔

سمجھ اس فصل میں کوتاہیٔ نشو و نما غالبؔ
اگر گُل سرو کے قامت پہ پیراہن نہ ہو جائے

فرماتے ہیں ۔ اے غالبؔ فصلِ بہار میں وہ نشو و نما کی کوتاہی ہوتی ہے ۔ اگر گلاب کی بیلیں اتنی نہ پھیلیں پھولیں کہ وہ سرو پر چڑھ کر اس کو پوری طرح ڈھانک نہ لیں ۔

امیرؔ جاتی جوانی ، یہ مجھ سے کہتی ہے : خزاں نہ مجھ کو سمجھ آخری بہاروں میں
(امیرؔ مینائی)

غزل ۱۹۵

فریاد کی کوئی لَے نہیں ہے   نالہ پابندِ نَے نہیں ہے

فرماتے ہیں ۔ فریاد کے لئے کسی انداز کی ضرورت نہیں نالہ دل سے بے ساختہ نکلے تو موثر ثابت ہو گا۔ اگر تصنع اور بناوٹ کا بیج اس میں داخل ہوگا تو نالہ و فریاد نہیں بلکہ بانسری کے سُر ہوں گے ۔

کیوں بوتے ہیں باغبان تونبے؟   گر باغ گدائے مَے نہیں ہے

فرماتے ہیں ۔ باغبان تونبے کی بیلیں کیوں لگاتے ہیں۔ اگران تونبوں سے کشکول گدائی بنانا مقصود نہیں ہوتا۔ اس کوشش سے ثابت ہے کہ باغ بھی گدائے مے ہے۔ مطلب یہ ہے کہ سیرِ باغ کا لطف شراب پی کر اٹھاتے ہیں ۔

ہر چند ہر ایک شے میں تو ہے   پر تجھ سی تو کوئی شے نہیں ہے

فرماتے ہیں ۔ باوجود اس کے کہ ہر شے میں تیری قدرت کا ظہور ہو رہا ہے مگر تیری مانند کائنات میں کوئی شے نہیں ہے یعنی تو جسمانی حالت سے منزہ ہے

ہاں کھائیو مت فریبِ ہستی   ہر چند کہیں کہ "ہے" نہیں ہے

فرماتے ہیں ۔ ہاں خبردار کہیں تو ہستی کے فریب میں آجائے ۔ ہر چند لوگ کہیں گے کہ ہے مگر تو یہی کہنا کہ نہیں ہے اس شعر میں ہستی کی ناپائیداری کی طرف اشارہ ہے۔ قطعی انکار اور زندگی کا عدم نہیں کہا ہے ۔

شادی سے گزر، کہ غم نہ ہووے اُردی جو نہ ہو تو دے نہیں ہے

فرماتے ہیں۔ اگر تو شادی کو بھول جائے تو پھر تجھے غم نہ ہوگا یعنی تو بہار کو نہ جانے تو خزاں کا کب احساس ہوگا۔ اُردی بہار کے مہینہ کو اور دے خزاں کے مہینہ کو کہتے ہیں۔

کیوں ردِ قدح کرے ہے زاہد مے ہے یہ مگس کی قے نہیں ہے

فرماتے ہیں۔ اے زاہد شہد کھانا تو تُو موجب ثواب سمجھتا ہے لیکن شراب سے نفرت کرتا ہے جبکہ شہد تو مکھی کی قے ہے اور شراب انگور کا مصفّا عرق ہے۔ پھر شراب کے پینے میں کیوں ردِ قدح کرتا ہے۔

غزل ۱۹۶

نہ پوچھ نسخۂ مرہم جراحتِ دل کا کہ اس میں ریزۂ الماس جزوِ اعظم ہے

فرماتے ہیں۔ زخمِ دل کے لئے جو مرہم کا نسخہ ہے اُس کی کیفیت کیا پوچھتے ہو۔ اس نسخہ میں، جو دوائیں ڈالی جاتی ہیں۔ ان میں سب سے بڑا جزو ہیرے کی کنی کا ہے مطلب یہ ہے زخمِ دل کے لئے اس مرہم کو استعمال کرتے ہیں جس سے زخمِ دل مندمل نہیں ہوتا بلکہ زیادہ تکلیف کا باعث بنتا ہے۔

بہت دنوں میں تغافل نے تیرے پیدا کی وہ اک نگہ کہ بظاہر نگاہ سے کم ہے

فرماتے ہیں۔ بہت دنوں میں تیرے تغافل نے ایک نگاہ پیدا کی ہے جو بظاہر نگاہ سے کم ہے

مطلب یہ ہے کہ پہلے تو تم ہماری طرف دیکھنا ہی نہیں چاہتے تھے صرف تغافل تھا۔ مگر اب اُس تغافل نے کچھ التفات کا رنگ پکڑا ہے اور تم ۔ نے ہم پر ایک اچٹتی سی نظر ڈال کر ہماری امید دل میں جان ڈال دی ہے ۔

غزل ۱۹۷

ہم رشک کو اپنے بھی گوارا نہیں کرتے　　　مرتے ہیں ولے اُن کی تمنا نہیں کرتے

فرماتے ہیں ۔ ہمیں اپنی ذات سے بھی رشک پیدا ہو گیا ہے ۔ اس کی بدولت ہم پر بہت کچھ گذرتی ہے ۔ اس لئے ہمیں مرنا گوارا ہے ان سے ملنا اور ان کو اپنے پاس بلانا گوارا نہیں ہے ۔ کیونکہ ہماری آنکھیں انہیں دیکھیں گی ہمیں رشک آئے گا ۔ وہ ہم سے ملیں گے بغل گیر ہوں گے ۔ ہمیں رشک آئے گا ۔ اس لئے بہتر یہی ہے کہ ان کا خیال ہی چھوڑ دیں ۔

در پردہ اُنہیں غیر سے ہے ربطِ نہانی　　　ظاہر کا یہ پردہ ہے کہ پردا نہیں کرتے

فرماتے ہیں ۔ غیر سے انہیں دلی محبت ہے جس کا اظہار وہ نہیں کرتے ۔ لیکن اس محبت پر پردہ ڈالنے کے لئے وہ اس سے پردہ نہیں کرتے تاکہ محبت پر پردہ پڑا رہے ۔

یہ باعثِ نومیدیٔ اربابِ ہوس ہے　　　غالبؔ کو بُرا کہتے ہو اچھا نہیں کرتے

فرماتے ہیں ۔ اربابِ ہوس کے لئے یہ امر نا اُمیدی کا باعث ہوا ہے کہ تم غالب کو بُرا کہتے ہو ۔ وہ بوالہوس جو تم سے جسمانی تعلق کے خواہاں ہیں جب سُنتے ہیں کہ تم اپنے عاشق صادق غالب کو بھی بُرا بھلا کہتے رہتے ہو تو اُن کو تم سے قرب کی امید باقی نہیں رہتی اور وہ تم سے کنارہ کش ہوتے جا رہے ہیں ۔

غزل ۱۹۸

کرے ہے بادہ ترے لب سے کسبِ رنگِ فروغ
خطِ پیالہ سراسر نگاہِ گُل چیں ہے

فرماتے ہیں ۔ شراب تیرے لبِ لعلین سے سرخ رنگ حاصل کرتی ہے اور خطِ پیالہ سراسر گلچیں کا تارِ نظر ہے جو تیرے سرخ ہونٹوں سے پھول چنتا ہے ۔

کبھی تو اِس سرِ شوریدہ کی بھی داد ملے
کہ ایک عمر سے حسرت پرستِ بالیں ہے

فرماتے ہیں ۔ کبھی تو میرے سر شوریدہ کے ساتھ انصاف ہو کہ یہ جب سے سودائے عشق و جنون کا مریض ہوا کبھی تکیہ پر سر رکھ کر آرام سے نہیں سویا۔ اسی لیے یہ حسرت پرست بالیں ہے ۔ (سودا اور جنون کی حالت میں نیند نہیں آتی)۔

بجا ہے گر نہ سُنے نالہ ہائے بُلبُلِ زار
کہ گوشِ گُل نمِ شبنم سے پنبہ آگیں ہے

فرماتے ہیں ۔ یہ بہت ممکن ہے کہ پھول بلبل زار کے نالہ و فریاد کو نہ سُن سکے کیونکہ گُل کے کانوں میں شبنم نے نمی کے چند قطرے ڈال کے بہرہ کر دیا ہے۔ گویا کہ پھول کے کانوں میں روئی کی چھوٹی چھوٹی گولیاں (پنبہ) ٹھونس دی گئی ہیں جو وَقر بن گئی ہیں ۔

اسدؔ ہے نزع میں، چل بے وفا برائے خدا

مقامِ ترکِ حجاب و وداعِ تمکیں ہے

فرماتے ہیں۔ اسد حالتِ نزع میں ہے۔ اے بے وفا خدا کے لئے جلدی کر اور اس کے پاس چل۔
ایسے وقت میں نہ تو شرم و حجاب کی ضرورت ہوتی ہے اور نہ تمکین و وقار کی۔

غزل ۱۹۹

کیوں نہ ہو چشمِ بتاں محوِ تغافل، کیوں نہ ہو؟ یعنی اس بیمار کو نظارے سے پرہیز ہے

فرماتے ہیں۔ چشمِ بتاں یعنی حسینوں کی آنکھ کیوں نہ تغافل برتے جبکہ ان کو نظاروں سے پرہیز کرنا
ہے۔ چشمِ بیمار آخر محبوب کی ہی آنکھ کو کہتے ہیں۔

مرتے مرتے دیکھنے کی آرزو رہ جائے گی وائے ناکامی کہ اس کافر کا خنجر تیز ہے

فرماتے ہیں۔ وائے ناکامی و نامرادی مرتے وقت بھی حسرتِ دیدار دل ہی میں رہی۔ کاش اس بتِ کافر
کا خنجر کند ہوتا تا وہ تیزی سے میرا گلا نہ کاٹ سکتا اور گلا آہستہ آہستہ کٹتا تو میں بھی جی بھر کے اسے
دیکھ تو لیتا۔ اور حسرتِ دیدار ایک حد تک پوری ہو جاتی۔

عارضِ گُل دیکھ روئے یار یاد آیا اسدؔ جوششِ فصلِ بہاری اشتیاق انگیز ہے

فرماتے ہیں۔ چمن میں پھولوں کو کھلا ہوا دیکھ کر اے اسدؔ مجھے اپنے یار کا چہرہ یاد آ گیا فصلِ بہار کا جوش یقیناً
اشتیاق کو زیادہ کرنے والا ہے یعنی سودائے عشق اور جنونِ عشق دونوں موسمِ بہار میں تیز ہوتے ہیں۔

غزل ۲۰۰

دیا ہے دل اگر اُس کو بشر ہے کیا کہیے
ہوا رقیب تو ہو، نامہ بر ہے کیا کہیے

فرماتے ہیں ۔ بوجہ بشریت کے نامہ بر کے پاس ہمارے ہی جیسا دل ہے ۔ اگر وہ اُس کے حُسنِ دلکش کو دیکھ کر اس پر فریفتہ ہوا اور ہمارا رقیب بن جائے تو کوئی تعجب نہیں وہ بے خطا ہے اس کو الزام دینا نامناسب بات ہے ۔ ہمارے محبوب کا حُسن ہی اتنا دلفریب، دلربا اور دلکش ہے کہ جو دیکھتا ہے اُس پر عاشق ہو جاتا ہے ۔

یہ ضد کہ آج نہ آئے اور آئے بن نہ رہے
قضا سے شکوہ ہمیں کس قدر ہے کیا کہیے

فرماتے ہیں ۔ موت کا آنا تو لازمی ہے یہ اُس کا کام ہے جو ازل سے اُس کے سپرد کیا گیا ہے آج نہیں تو کل بہرحال اُس کو آنا ہے ۔ مگر اس کا کیا بگڑ جاتا جو وہ ہماری ضرورت کے وقت آتی ۔ آج جبکہ شبِ فراق میں ہماری جان پر بنی ہے ۔ ہم اُس کو بُلا رہے ہیں اُسے یہ ضد ہے کہ وہ آج ہماری ضرورت اور ہمارے کہنے کی وجہ سے نہیں آئے گی ۔ یہ بہت بیجا بات ہے ہمیں عمر بھر شکایت رہے گی ۔

رہے ہے یوں گہ و بے گہ کہ کوئے دوست کو اب
اگر نہ کہیے کہ دشمن کا گھر ہے کیا کہیے

فرماتے ہیں ہم تو وقت بے وقت رقیب کو کوچۂ یار ہی میں دیکھتے ہیں پھر ہم کیسے نہ کہیں کہ کوے یار اس کا گھر بن گیا ہے۔

زہے کرشمہ کہ یوں دے رکھا ہے ہم کو فریب
کہ بن کہے ہی انہیں سب خبر ہے کیا کہیے

فرماتے ہیں۔ واہ واہ خوب حیرت انگیز اُن کا یہ کیسا فریب ہے کہ اپنے ناز و ادا سے یہ بات ظاہر کر رہے ہیں کہ تمہارا حال احوال ہم پر ظاہر ہے اور ہم اس سے باخبر ہیں تمہیں ہم سے کچھ کہنے یا سنانے کی ضرورت نہیں ہے۔

سمجھ کے کرتے ہیں بازار میں وہ پرسشِ حال
کہ یہ کہے کہ سرِ رہ گذر ہے کیا کہیے

فرماتے ہیں وہ بہت سمجھ دار وضع شناس ہے کہ میں حال چال پوچھوں گا۔ میرزا صاحب اپنی وضع داری کے سبب مجھ سے بات کرتے ہوئے جھجکیں گے۔ اور میری پرشش کے جواب میں کہیں گے کہ سرِ رہ بات چیت کا کیا موقعہ ہے کہ آپ یہاں میرا حال پوچھتے ہو۔

تمہیں نہیں ہے سر رشتۂ وفا کا خیال
ہمارے ہاتھ میں کچھ ہے مگر ہے کیا؟ کہیے

فرماتے ہیں۔ تم کو رشتۂ وفا کا قطعی خیال نہیں نہ ہی اس کی حکمت کا کچھ تمہیں پتہ ہے۔ ہمارے ہاتھ میں کچھ ہے یعنی اس کی حکمت بھی اور ہم اس پر عمل کر کے خود بھی وفادار بنے ہیں اور اپنے آپ کو وفادار خیال کرتے ہیں مگر تم سے کیا کہیں کہ ہم وفادار ہیں، تم کب ہماری بات پر یقین کرنے والے ہو۔

انہیں سوال پہ زعمِ جنوں ہے کیوں لڑیے؟
ہمیں جواب سے قطعِ نظر ہے کیا کہیے

فرماتے ہیں۔ وہ شوخ مجھ پر اور میرے سوال سے اپنے زعم میں یہ سمجھا ہے کہ میں دُور از عقل اور بے تکی بات کر رہا ہوں لہٰذا یہ جنوں ہے اور اِدھر ایک ہم ہیں کہ سوال کے جواب کی امید ہی نہیں رکھتے۔

حسد، سزائے کمالِ سخن ہے کیا کیجے
ستم بہائے متاعِ ہنر ہے کیا کہیے

فرماتے ہیں۔ جب کسی کو سخن میں کمال حاصل ہو جاتا ہے تو اُس سے لوگ حسد کرنے لگتے ہیں اور یہ باکمال ہونے کی سزا ہے اور اسی طرح متاعِ ہنر کی قیمت ستمِ ہائے روزگار ہے۔

کہا ہے کس نے کہ غالبؔ بُرا نہیں لیکن
سوائے اس کے کہ آشفتہ سر ہے کیا کہیے

فرماتے ہیں "کہا ہے کس نے" میں غالباً محبوب کی طرف اشارہ ہے۔ فرماتے ہیں کہ غالبؔ آدمی بُرا نہیں ہے۔ مگر افسوس یہ ہے کہ وہ دیوانہ ہو گیا ہے اور اس سے زیادہ اس کے لئے کیا کہا جاسکتا ہے۔

شعاعِ حسن سے ذرّہ ہے مثلِ آئینہ ؛ وہ ذرّے ذرّے میں جلوہ نما ہے کیا کہیے

(شارح)

غزل ۲۰۱

دیکھ کر در پردہ گرمِ دامن افشانی مجھے
کر گئی وابستۂ تن میری عریانی مجھے

معنی۔ دامن افشانی = دامن جھاڑنا، لاتعلق ہونا، ترک کرنا
عریانی = یہاں بے تعلق ہونا مراد ہے

فرماتے ہیں۔ روح مجرد تھی خالق کے ساتھ الحاق چاہتی تھی۔ لیکن مجھے سرگرم دامن افشانی دیکھ کر مجھے جسم سے وابستہ کر دیا گیا۔ اور ایک عرصہ کے لئے قیدِ جسم کی سزا ملی۔

بن گیا تیغِ نگاہِ یار کا سنگِ فساں
مرحبا میں، کیا مبارک ہے گراں جانی مجھے

معنی۔ فساں = سان، سخت، پتھر گراں جانی = سخت جان ہونا

فرماتے ہیں۔ واہ واہ، میرا کیا مبارک وجود ہے کہ سخت جان ہونے کی وجہ سے میں تیغ نگاہِ یار کا سنگِ فساں بن گیا ہوں۔ جب وہ مجھ پر وار کرتی ہے تو تیغِ نگاہِ یار زیادہ تیز اور آبدار ہو جاتی ہے جیسے تلوار سنگِ فساں پر رگڑنے سے میرے زخمِ دل اور زخمِ جگر تیغِ نگاہِ یار کو تیز سے تیز تر کر رہے ہیں۔

کیوں نہ ہو بے التفاتی اُس کی خاطر جمع ہے
جانتا ہے محوِ پرسش ہائے پنہانی مجھے

فرماتے ہیں ۔ وہ کیوں نہ لے التفاتی کرے جبکہ اُس ظالم کی خاطر جمع ہے یعنی وہ یہ جانتا ہے کہ میں اپنے جنونِ عشق میں مست و بے خود ہوں اور میں تصور میں ہی محبوب سے محوِ گفتگو رہتا ہوں اور خیالی پرسش ہائے پنہانی مجھے مست و بے خود کئے رکھتی ہے ۔

میرے غم خانے کی قسمت جب رقم ہونے لگی

لکھ دیا منجملۂ اسبابِ ویرانی مجھے

فرماتے ہیں ۔ میرے غم خانے کی قسمت جب روزِ اوّل میں کاتبِ تقدیر نے لکھی تو اُس وقت اس نے مجھ کو میرے گھر کی ویرانی کا سبب لکھ دیا ۔ مطلب یہ ہے کہ میرے گھر کی ویرانی میرے ہی دم سے ہے ۔ اور کوئی وجہ نہیں ہے ۔ یہاں منجملۂ اسبابِ ویرانی ہے اور ہم نے اس کے معنی اسبابِ ویرانی سے کئے ہیں ۔

بدگماں ہوتا ہے وہ کافر نہ ہوتا کاش کے

اس قدر ذوقِ نوائے مرغِ بستانی مجھے

فرماتے ہیں ۔ مجھ کو خوش نوایانِ چمن کے زمزمے سننے کا بے حد شوق ہے اور وہ میرا محبوب میرے اس ذوقِ سماع سے یہ خیال کرتا ہے کہ میں محبوب کی گفتگو پر پرندوں کی چہچہاہٹ کو ترجیح کیوں دیتا ہوں ۔ کاش وہ میرے ذوقِ سماع سے بدگماں نہ ہوتا ۔

وائے ! واں بھی شورِ محشر نے نہ دم لینے دیا

لے گیا تھا گور میں ذوقِ تن آسانی مجھے

فرماتے ہیں ۔ افسوس قبر میں بھی چین نہ ملا ۔ شورِ قیامت نے مجھے جگا دیا ۔ میں تو وہاں اس لئے گیا تھا کہ نیند بھر کے سوؤں گا ۔ آرام حاصل کروں گا ۔ دُنیا سے گھبرا کر قبر میں چین پانے کی امید تھی ۔ اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے ؛ مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے (ذوق)

وعدہ آنے کا وفا کیجے ، یہ کیا انداز ہے
تم نے کیوں سونپی ہے میرے گھر کی دربانی مجھے؟

فرماتے ہیں ۔ آنے کا وعدہ پورا کیجے ۔ میں منتظر بیٹھا ہوں کہیں جا بھی نہیں سکتا ۔ تم نے تو میرے سپرد گھر کی دربانی کردی ۔ یہ تمہارے کیسے انداز ہیں ۔ بے مثل شعر ہے ۔

ہاں نشاطِ آمدِ فصلِ بہاری واہ وا !
پھر ہوا ہے تازہ سودائے غزل خوانی مجھے

فرماتے ہیں ۔ ہاں اے نشاطِ فصلِ بہاری تیری کیا بات ہے ۔ تجھ کو آتے دیکھ کر میرا سودائے غزل خوانی تازہ ہوگیا ہے ۔ میری طبیعت غزل کہنے کی طرف مائل ہوگئی ۔

دی مرے بھائی کو حق نے از سرِ نو زندگی
میرزا یوسف ہے غالبؔ یوسفِ ثانی مجھے

میرزا یوسف میاں غالبؔ کے بڑے بھائی تھے جو کہ عین جوانی میں دیوانے ہو گئے تھے ۔ شعر کا مضمون صاف سیدھا ہے ۔

غزل ۲۰۲

یاد ہے شادی میں بھی ہنگامہ یارب مجھے
سبحۂ زاہد ہوا ہے خندہ زیرِ لب مجھے

معنی ۔ یارب = خدا سے فریاد کرنا (فارسی کا محاورہ ہے) سبحۂ زاہد = ذکرِ الٰہی

فرماتے ہیں۔ مجھے بوقتِ شادی ہنگامۂ یارب یاد ہے اور میرا مسکرانا بھی زاہد کا ذکر خفی ہے مطلب یہ ہے
کہ میں ہر حال میں، تجھے یاد کرتا ہوں یعنی یادِ الٰہی سے غافل نہیں ہوں۔

تھا طلسمِ قفلِ ابجد خانۂ مکتب مجھے ہے کشادِ خاطرِ وابستہ در رہنِ سخن

فرماتے ہیں۔ جس طرح قفل ابجد حرفوں کے جوڑ ملنے سے کھل جاتا ہے۔ اسی طرح میری طبیعت کشادہ
ہو جاتی ہے جب میں اچھا شعر کہوں یا کسی اور کا سنوں۔ گو میری طبیعت سخن نے رہن رکھی
ہوئی ہے۔ شعر کے ساتھ رہن ادا ہو جاتا ہے۔

رشکِ آسائش یہ ہے زندانیوں کی اب مجھے یارب! اس آشفتگی کی داد کس سے چاہیئے؟

فرماتے ہیں۔ یارب میں پریشان حالی کی داد کس سے چاہوں، جب میں قید تھا تو آزادانہ بیاباں گردی کرنا
چاہتا تھا اور قیدیوں کی حالت پر رحم کھاتا تھا۔ اب جبکہ میں آشفتہ سری کے ہاتھوں صحرا نوردی کر رہا
ہوں تو اہل زنداں پر رشک ہے کہ وہ آوارہ گردی سے بچ کر سکون سے زندگی بسر کر رہے ہیں۔

آرزو سے ہے شکستِ آرزو مطلب مجھے طبع ہے مشتاقِ لذت ہائے حسرت کیا کروں؟

فرماتے ہیں۔ میری طبیعت ہمیشہ سے لذتِ حسرت و حرماں کی مشتاق چلی آتی ہے اسی میں مجھے لطفِ زندگی
حاصل ہوتا ہے۔ میں آرزو شکستِ آرزو کی خاطر کرتا ہوں۔ یہی میرا مطلب ہوتا ہے تا حسبِ خواہش
مجھے لذتِ حرماں و یاس ملتی رہے۔

عشق سے آتے تھے مانع میرزا صاحب مجھے دل لگا کر آپ بھی غالبؔ مجھی سے ہو گئے

فرماتے ہیں۔ دل لگا کر غالبؔ بھی مجھی سے ہو گئے۔ کوئی اُن سے پوچھے کہ میرزا صاحب کیا ہوا۔ آپ عشق کے
خلاف وعظ و نصیحت کیا کرتے تھے۔ آپ نے اپنے گلے میں یہ پھانسی کا پھندا کیوں ڈال رکھا ہے۔

غزل ۲۰۳

حضورِ شاہ میں اہلِ سُخن کی آزمائش ہے
چمن میں خوشش نوایانِ چمن کی آزمائش ہے

فرماتے ہیں ۔ بادشاہ کے دربار میں شاعروں کا امتحان لیا جا رہا ہے اور یہ بات ایسی ہے کہ گویا چمن میں خوش نوایانِ چمن کا خوشش الحانی کا امتحان ہو۔ غالب میاں نے یہ غزل دربارِ شاہی میں پڑھی تھی جب بادشاہ رونق افروز تھے ۔

قد و گیسو میں قیس و کوہ کن کی آزمائش ہے
جہاں ہم ہیں وہاں دار و رسن کی آزمائش ہے

فرماتے ہیں ۔ قیس و فرہاد کے لئے تو لیلیٰ و شیریں کا عشق اور اس سے متعلق مصائب و آلام ہی تھے ۔ لیکن جہاں ہمارا امتحان لیا جا رہا ہے وہاں تو دار و رسن تک بات پہنچ چکی ہے ۔ اور بادشاہ سلامت کو دار پر چڑھانے کا اختیار ہے ۔

کریں گے کوہ کن کے حوصلہ کا امتحاں آخر
ہنوز اس خستہ کے نیروئے تن کی آزمائش ہے

فرماتے ہیں ۔ ابھی تو صرف کوہ کن کی قوتِ دست و بازو کا امتحان ہو رہا ہے کہ وہ پہاڑوں کو کاٹ کر جوئے شیر نکالے اور خسرو اور شیریں کے لئے پتھر تراش کر دو محل تعمیر کرے ۔ جب کوہ کن یہ کام کرے گا تو اُس کے حوصلہ کا امتحان ایک پیرزن کے ذریعہ لیا جائے گا جو مرگِ شیریں

کی، دل خراش خبر لے کر عاشقِ نامراد کو وہ کن کو سنائے گی۔ اور وہ کم حوصلہ تیشہ سے اپنا سر پھوڑ کر مر جائے گا۔

نسیمِ مصر کو کیا پیرِ کنعاں کی ہوا خواہی
اُسے یوسف کی بوئے پیرہن کی آزمائش ہے

معنی: پیرِ کنعاں = حضرت یعقوب علیہ السلام

فرماتے ہیں۔ نسیمِ مصر کو پیرِ کنعاں سے کوئی ہمدردی نہیں ہے بلکہ وہ تو یوسف کی بوئے پیرہن کا امتحان لینا چاہتی ہے اور اسی لئے مصر سے کنعان کی طرف جا رہی ہے۔

وہ آیا بزم میں دیکھو نہ کہیو پھر کہ غافل تھے
شکیب و صبرِ اہلِ انجمن کی آزمائش ہے

فرماتے ہیں۔ وہ ہوش و حواس، صبر و شکیب لوٹنے والا محبوب بزم میں آگیا ہے۔ خبردار ہو جاؤ پھر نہ کہنا کہ ہم غافل تھے۔ اس کا غفلت میں ہم پر وار چل گیا۔ اور اس کے آنے کی غرض تمہارے صبر و قرار کا امتحان بھی ہے۔

رہے ہے دل میں تیر اچھا، جگر کے پار ہو بہتر
غرض شستِ بتِ ناوک فگن کی آزمائش ہے

فرماتے ہیں۔ تیر دل میں رہے یا جگر کے پار ہو۔ اس سے بالکل غرض نہیں بلکہ ہمیں تو اُس بتِ ناوک فگن کی نشانہ بازی دیکھنی اور اُس کا امتحان لینا منظور ہے آیا کتنے اس کے تیر نشانہ پر لگتے ہیں اور کتنے خطا ہوتے ہیں وہ تیر اندازی کا ماہر ہے یا نہیں۔

نہیں کچھ سبحہ و زنار کے پھندے میں گیرائی
وفاداری میں شیخ و برہمن کی آزمائش ہے

فرماتے ہیں ۔ سبحہ و زنار جو شیخ و برہمن کی علامت ہیں ان میں فی ذاتہٖ کچھ نہیں رکھا بلکہ ان سے ۔ دیکھنا اور امتحان لینا مدِ نظر ہے کہ وفاداری کے میدان میں کون پورا اترتا ہے یعنی تمام عمر وفادار رہتا ہے ۔ ایک دوسری جگہ فرماتے ہیں ۔ سه

وفاداری بشرطِ استواری اصل ایماں ہے
مرے بتخانے میں تو کعبہ میں گاڑو برہمن کو

پڑا رہ اے دلِ وابستہ بیتابی سے کیا حاصل؟
مگر پھر تابِ زلفِ پُرشکن کی آزمائش ہے

فرماتے ہیں ۔ اے میرے دل اسی حالت میں سکون سے پڑا رہ کیا تیری بیتابی سے زلفِ پرشکن کے حلقے ٹوٹ جائیں گے ۔ اگر زیادہ تڑپے گا تو وہ اور بھی کس جائیں گے ۔ کیونکہ یہاں تیری نہیں بلکہ زلفِ پرشکن کی طاقت کا امتحان ہے ۔

رگ و پے میں جب اُترے زہرِ غم تب دیکھئے کیا ہو!
ابھی تو تلخیٔ کام و دہن کی آزمائش ہے

فرماتے ہیں ۔ زہرِ غم یعنی زہرِ عشق جب رگ و پے میں خوب رچ جائے گا تب اس کے اثرات دیکھنے والے ہوں گے ۔ ابھی تو صرف مُنہ اور حلق کو تلخی سے آزمایا جا رہا ہے مطلب یہ ہے کہ انجام دیکھنے والا ہوگا ابھی تو آغاز ہے ۔

ابتدائے عشق ہے روتا ہے کیا ؛ آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا (میر تقی میر)

وہ آئیں گے مرے گھر وعدہ کیسا دیکھنا غالبؔ

نئے فتنوں میں اب چرخِ کہن کی آزمائش ہے

فرماتے ہیں ۔ وہ وعدے کا پابند نہیں ہے وہ میرے گھر ہرگز نہیں آئے گا۔ اور بہت ممکن ہے اُسے وعدہ کرنا اب یاد بھی نہ ہو۔ ہمیں تو اب یہ دیکھنا ہے کہ یہ چرخِ کہن ہمارے لئے کون سے نئے فتنے پیدا کرتا ہے۔

غزل ۲۰۴

کبھی نیکی بھی اُس کے جی میں گر آجائے ہے مجھ سے

جفائیں کر کے اپنی یاد شرما جائے ہے مجھ سے

فرماتے ہیں ۔ یعنی یہ سوچ کر کہ زندگی بھر اس پر ظلم و ستم کئے ہیں ۔اب تھوڑی نیکی کر کے کیا فائدہ ہوگا۔ لہٰذا وہ تھوڑی نیکی کرنے سے بھی رک جاتا ہے۔

خدایا جذبۂ دل کی مگر تاثیر اُلٹی ہے

کہ جتنا کھینچتا ہوں اور کھنچتا جائے ہے مجھ سے

فرماتے ہیں ۔ اے خدا جذبۂ دل میں تاثیر تو ہے مگر اُلٹی ہے کہ جس قدر میں اُس کو اپنے جذبِ دل سے کھینچتا ہوں اُسی قدر وہ مجھ سے بگڑ کر اور بد مزاج ہو کر دُور ہو جاتا ہے۔

وہ بد خُو، اور میری داستانِ عشق طولانی

عبارت مختصر، قاصد بھی گھبرا جائے ہے مجھ سے

فرماتے ہیں ۔ کس مصیبت میں جان پھنسی ہے ایک تو وہ شوخ بدخو، بدمزاج اور دوسرے میری داستانِ عشق بہت طویل ۔ وہ بدخو کب سننے والا ہے بلکہ طرہ یہ ہے کہ قاصد بھی گھبرا گیا اور کانوں کو ہاتھ لگا کر بولا کہ حضور اتنا لمبا طویل پیغام پہنچانا میرے بس کا نہیں ہے ۔لہٰذا میں معذرت چاہتا ہوں ۔

اُدھر وہ بدگمانی ہے اِدھر یہ ناتوانی ہے

نہ پوچھا جائے ہے اُس سے نہ بولا جائے ہے مجھ سے

فرماتے ہیں ۔ وہ بوجہ بدگمانی کے میری محبت کا یقین نہیں کرتا ۔ جو کچھ میں کہہ پاتا ہوں وہ سُن کر کہہ دیتا ہے کہ یہ سب غلط ہے ادھر وہ بدگمان ہے میرا حال چال کیوں پوچھے اور اِدھر اپنی حالت ضعیف و ناتواں ہے کہ میں تفصیل سے بتا نہیں سکتا ۔

سنبھلنے دے مجھے اے ناامیدی کیا قیامت ہے

کہ دامانِ خیالِ یار چھوٹا جائے ہے مجھ سے ۔

فرماتے ہیں ۔ اے ناامیدی مجھے ذرا ہوش میں آنے دے ۔میں کچھ سنبھل جاؤں اتنا پریشان نہ کر کہ میرے دل سے خیالِ یار تک نکل جائے تو ایسی قیامت برپا نہ کر ۔

تکلف برطرف ، نظارگی میں بھی سہی لیکن

وہ دیکھا جائے کب یہ ظلم دیکھا جائے ہے مجھ سے

فرماتے ہیں ۔ مَیں بھی اُس کے دیکھنے والوں میں شامل ہوں ۔مگر یہ ظلم مجھ سے کب دیکھا جا سکتا ہے کہ دوسرے لوگ بھی اُسے دیکھیں ۔ یہ مجھ سے ہرگز نہیں ہو سکتا ۔

ہوئے ہیں پاؤں ہی پہلے نبردِ عشق میں زخمی

نہ بھاگا جائے ہے مجھ سے نہ ٹھہرا جائے ہے مجھ سے

فرماتے ہیں ۔ وہ قویٰ جن سے عشق کو ترک یا اس کے مصائب و آلام برداشت ہوتے ہیں ۔ ابتدائے عشق میں ہی زخمی ہو گئے ۔ اب نہ عشق ترک کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی اس کی مصیبتوں کو برداشت کرنے کی طاقت ہے سب رخصت ہو گیا ۔

قیامت ہے کہ ہووے مدّعی کا ہم سفر غالبؔ
وہ کافر جو خدا کو بھی نہ سونپا جائے ہے مجھ سے

فرماتے ہیں ۔ غضب ہے کہ میں اس کافر کو رخصت کروں اور کہوں کہ جاؤ خدا حافظ ۔ بھلا الیسا رشک کب میں گوارا کر سکتا ہوں اور وہ بھی اس وقت جبکہ مدّعی بھی اس کے ساتھ ہم سفر ہو رہا ہے ۔

غزل ۲۰۵

زبس کہ مشقِ تماشا جنوں علامت ہے ۔ کشاد و بستِ مژہ سیلیٔ ندامت ہے

فرماتے ہیں ۔ اس عالمِ ناپائیدار کی نیرنگیاں دیکھنے کے لئے آنکھیں کھولنا ۔ بند کرنا ۔ ندامت کے طمانچے کھانے کے برابر اور دیوانگی کی علامت ہے ۔

نہ جانوں کیونکہ مٹے داغِ طعنِ بدعہدی ۔ تجھے کہ آئنہ بھی ورطۂ ملامت ہے

فرماتے ہیں ۔ مجھے معلوم نہیں کہ تیری بدعہدی کے داغ کوئی کس طرح مٹائے ۔ تیرے لئے تو آئنہ بھی ورطۂ ملامت ہے یعنی تو آئنہ دیکھ کر غیروں کے لئے بناؤ سنگھار کرتا ہے جو فی الحقیقت بدعہدی ہے مطلب یہ ہے کہ ہمارے ساتھ بے وفائی اور دوسرے سے وفا کی جاتی ہے ۔

بہ پیچ و تابِ ہوس سلکِ عافیت مت توڑ　　　نگاہِ عجز سرِ رشتۂ سلامت ہے

فرماتے ہیں اپنے آپ کو ہوس کے پیچ و تاب میں نہیں پھنسانا چاہیئے اس سے عافیت کا رشتہ ٹوٹتا ہے۔ مطلب یہ ہے ہوس رانی سے دونوں جہاں برباد ہو جاتے ہیں۔

وفا مقابل و دعوائے عشق بے بنیاد　　　جنونِ ساختہ و فصلِ گل قیامت ہے

فرماتے ہیں۔ محبوب وفادار اور رقیب دعویٰ عشق میں جھوٹا ہے ایسا ہی ہے جیسے سچ مچ بہار آگئی اور جنوں بناوٹی ہو۔ قابلِ شرم رقیب کا کام ہے

غزل ۲۰۶

لاغر اتنا ہوں کہ گر تو بزم میں جا دے مجھے

میرا ذمہ، دیکھ کر کوئی بتلا دے مجھے

فرماتے ہیں۔ رقیب کے خوف سے تو مجھے اپنی بزم میں آنے کی دعوت نہیں دیتا ہے تو اس قدر لاغر و نحیف ہوں کہ مجھے کوئی دیکھ نہ پائے گا۔ میں ذمہ داری لیتا ہوں۔ کسی کو پتہ بھی نہیں ہو گا کہ میں ہوں بھی یا نہیں۔

کیا تعجب ہے کہ اُس کو دیکھ کر آجائے رحم

واں تلک کوئی کسی حیلے سے پہنچا دے مجھے

فرماتے ہیں۔ میری حالت قابلِ رحم ہو چکی ہے۔ میری حالت زار و نزار ہے کیا تعجب ہے کہ اگر وہ

اس حالت میں مجھے دیکھے تو اس کو مجھ پر رحم آجائے. کوئی میری مدد کرے مجھے سہارا چاہیئے۔ کسی نہ کسی ذریعہ سے اُس تک مجھے لے چلو ۔

مُنہ نہ دکھلاوے نہ دکھلا، پر بہ اندازِ عتاب
کھول کر پردہ ذرا آنکھیں ہی دکھلا دے مجھے

فرماتے ہیں۔ اگر تجھے منہ دکھانا ناپسند ہے اور کسی بھی وجہ سے تو نہیں دکھا سکتا خیر ہے. ہمیں کوئی شکوہ شکایت تجھ سے نہیں لیکن ایک بات تو کر سکتا ہے کہ غصہ میں بھر کر ہمیں پردہ ہٹا کر بُرا بھلا کہہ تاکہ ہم دیکھیں تو غصہ میں کیسے رنگ بدلتا ہے۔ کیونکہ بعض حسین بوقتِ غیض و غضب زیادہ حسین ہو جاتے ہیں جتنے وہ بناؤ سنگار سے بھی نہیں ہوتے ۔

یاں تلک میری گرفتاری سے وہ خوش ہے کہ میں
زُلف گر بن جاؤں تو شانے میں اُلجھا دے مجھے

فرماتے ہیں ۔ وہ میری گرفتاری سے بہت خوش ہے اور یہاں تک وہ گرفتاری کا متمنّی ہے کہ اگر میں اس کی زلف بن جاؤں تو بجائے زُلف سلجھانے کے اپنے شانے میں وہیں پر مجھے الجھائے رکھے مطلب یہ ہے کہ محبوب قطعی نہیں چاہتا کہ اس کا کوئی عاشق اسے الوداع کہے۔ ہر محبوب اپنے عشاق کو ہمیشہ اسیر ہی رکھنے کا خواہش مند رہتا ہے ۔

غزل ۲۰۷

بازیچۂ اطفال ہے دُنیا مرے آگے ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے

فرماتے ہیں۔ یہ دُنیا میری نگاہ میں، بچوں کا کھیل ہے۔ رات دن جو کچھ یہاں ہوتا ہے وہ میری نظر میں کوئی اہم بات نہیں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جب یہ حادثات روزمرہ کا معمول ہیں اور میں اِن باتوں کا عادی ہوگیا ہوں تو کوئی حادثہ بڑا ہو یا چھوٹا میری طبیعت پر اثر انداز نہیں ہوتا۔

اِک کھیل ہے اورنگِ سلیماں مرے نزدیک اک بات ہے اعجازِ مسیحا مرے آگے

فرماتے ہیں۔ تختِ سلیمان اور اُس سے متعلق جو کہانیاں بنائی گئیں ہیں وہ سب اک کھیل ہے یعنی ان کہانیوں میں حقیقت نہیں ہے اور ایسا ہی ایک بات ہے اعجازِ مسیحا۔ میری نظر میں یعنی جو کچھ ان دونوں باتوں میں غلو کیا گیا ہے وہ میری نگاہ سے مخفی نہیں۔

جز نام نہیں صورتِ عالم مجھے منظور جز وہم نہیں ہستیٔ اشیا مرے آگے

فرماتے ہیں۔ اس دُنیا جہان کا نام ہی نام ہے اور ایسا ہی ہستیٔ اشیا میرے لئے وہم کے سوا نہیں۔ مطلب اس شعر کا یہ ہے کہ حقیقت میں ہر شے اللہ تعالیٰ کی قدرت سے وجود میں آئی ہے اس کا ذاتی کوئی وجود نہیں ہے۔ ذاتِ باری کے سوا میں کسی شے کی کوئی حقیقت نہیں سمجھتا۔

ہوتا ہے نہاں گرد میں صحرا مرے ہوتے گھستا ہے جبیں خاک پہ دریا مرے آگے

فرماتے ہیں ۔ انسان کو اللہ تعالیٰ نے اپنی فطرت پہ پیدا کیا ہے ۔ لہٰذا اس کے لئے سب چیزوں کو مسخر کیا ہے ۔ شعر کا مطلب یہی ہے کہ انسان کو یہ قدرت اور عقل بخشی ہے ۔ صحرا شرم کی وجہ سے خاک میں اپنا منہ چھپا رہا ہے اور بڑے بڑے دریا انسان کے آگے پیشانی رگڑتے ہیں ۔ یعنی اس کے فرمانبردار ہیں جو کچھ ہم روز مشاہدہ کر رہے ہیں یہ انسان کی عظمت کی نشانیاں ہیں ۔

مت پوچھ کہ کیا حال ہے میرا ترے پیچھے　　　　تو دیکھ کہ کیا رنگ ہے تیرا مرے آگے

فرماتے ہیں ۔ مجھ سے یہ نہ پوچھ کہ تیری جدائی میں میرا کیا حال ہوتا ہے بلکہ تو یہ دیکھ جو میرا حال ہے یعنی زبانِ حال سے ہی نظر آ رہا ہے اور میرے حال کو دیکھ کر تیرا کیا رنگ ہو جاتا ہے یعنی تو بھی بے چین اور پریشان ہو جاتا ہے ۔ بعینہٖ ایسا ہی میرا حال تیرے ہجر میں ہوتا ہے ۔

سچ کہتے ہو خود بین و خود آرا ہوں نہ کیوں ہوں؟　　　　بیٹھا ہے بُتِ آئینہ سیما مرے آگے

فرماتے ہیں تم سچ کہتے ہو کہ میں اپنے آپ کو بہت سمجھتا ہوں ۔ اس وجہ سے کچھ گھمنڈ بھی ہے لیکن یہ سب یوں ہے کہ تم سا آئینہ جبیں میرے آگے بیٹھا ہے تو خود بخود مجھ میں خود بینی اور خود آرائی کیوں نہ ہو ۔ میں تو اپنے آپ کو تم جیسی حسین اور آئینہ جیسی صاف و شفاف پیشانی رکھنے والی محبوبہ کے سامنے بیٹھا دیکھ کر اپنی قسمت پر ناز کر رہا ہوں ۔

پھر دیکھئے اندازِ گُل افشانیٔ گفتار　　　　رکھ دے کوئی پیمانۂ صہبا مرے آگے

فرماتے ہیں ۔ پھر دیکھئے کہ میری زبان سے کیسے کیسے پھول جھڑتے ہیں ۔ شرط یہ ہے کہ کوئی میرے سامنے پیمانہ اور شراب کا بھرا ہوا شیشہ رکھے تو سہی ۔

نفرت کا گُماں گزرے ہے، میں رشک سے گزرا　　　　کیوں کر کہوں لو نام نہ اُن کا مرے آگے

فرماتے ہیں ۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ میں اُن کے نام سے نفرت کرتا ہوں جب میں رشک کی وجہ سے کسی سے کہتا ہوں کہ میرے آگے ان کا نام نہ لو ۔ مجھے اُن کا نام غیر کے مُنہ سے بھی اچھا نہیں لگتا۔

ایماں مجھے روکے ہے جو کھینچے ہے مُجھے کفر　　کعبہ مرے پیچھے ہے کلیسا مرے آگے

فرماتے ہیں ۔ کعبہ جو ایمان کی علامت ہے اور جو میری پشت کی جانب ہے اور مجھے روکتا ہے لیکن کفر میرے آگے ہے جو مجھے اپنی طرف کھینچتا ہے ۔ ایمان اور کفر کی یہ کشمکش ازل سے جاری ہے اور ابد تک جاری رہے گی ۔

عاشق ہوں پہ معشوق فریبی ہے مرا کام　　مجنُوں کو بُرا کہتی ہے لیلیٰ مرے آگے

فرماتے ہیں ۔ ہوں تو میں عاشق مگر معشوق فریب عاشق ہوں ۔ ساری دُنیا کے معشوق مجھ سے محبت کرتے ہیں ۔ یہاں تک کہ لیلیٰ میرے مقابلہ میں مجنوں کو بُرا کہتی ہے اور میری تعریف کرتی ہے ۔

خوش ہوتے ہیں پر وصل میں یوں مَر نہیں جاتے　　آئی شبِ ہجراں کی تمنا مرے آگے

فرماتے ہیں وصل میں خوشی ہونا لازمی امر ہے ۔ مگر اس قدر خوشی نہ ہو کہ شادی مرگ ہو جائے اور شبِ فراق میں جو مرنے کی تمنا تھی وہ شبِ وصال میں تمہارے سامنے آ جائے ۔

ہے موجزن اِک قُلزمِ خوں کاش یہی ہو　　آتا ہے ابھی دیکھیئے کیا کیا مرے آگے

فرماتے ہیں ۔ آج جو میں ایک خون کا دریا اپنی آنکھوں سے بہا رہا ہوں کاش بس یہی ہو اس کے بعد مجھے ایسا خون کا دریا نہ بہانا پڑے مگر معلوم نہیں ابھی کیا کیا آفتیں اور آنی باقی ہیں ۔

گو ہاتھ میں جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے   رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے

فرماتے ہیں ۔ گو ہاتھ میں اتنی بھی طاقت و سکت نہیں کہ میں مینا میں سے شراب ساغر میں انڈیلوں مگر آنکھوں میں جان باقی ہے یعنی خواہش ختم نہیں ہوتی ۔لہٰذا ساغر و مینا میرے آگے سے مت ہٹاؤ۔ مطلب یہ ہے کہ جب تک انسان کے دم میں دم ہے خواہشات نفسانی انسان کا پیچھا نہیں چھوڑتیں ۔

ہم پیشہ و ہم مشرب و ہم راز ہے میرا   غالبؔ کو بُرا کیوں ۔ کہو اچھا مرے آگے

فرماتے ہیں ۔ غالب میری طرح عاشق بھی ہے ہم مذہب اور میرا راز داں بھی ۔تم اس کو میرے سامنے بُرا کیوں کہتے ہو ۔اگر کچھ کہنا ہی ہے تو اچھا کہو ۔مطلب یہ ہے کہ جب غالبؔ میرے ہی جیسا ہے تو آپ صرف غالبؔ کو نہیں مجھے بھی بُرا کہہ رہے ہیں ۔یہ بات خلافِ تہذیب ہے کہ مُنہ پر ہی گالیاں دیتے ہو ۔شاید محبوب غالبؔ کو جانتا پہچانتا نہیں اس لئے یہ سارا ڈرامہ ہوا ہے یا خود بدولت آپ سے ہی محوِ گفتگو ہیں ۔

غزل ۲۰۸

کہوں جو حال تو کہتے ہو "مدّعا کہیئے"
تم ہی کہو، کہ جو تم یُوں کہو تو کیا ۔کہیئے

فرماتے ہیں ۔ میں اگر اپنا حالِ دل کہتا ہوں تو تم فوراً کہتے ہو کہ بس بس مدعائے دل بیان کرو حالانکہ میرے مُدّعا سے تم بخوبی واقف ہو ۔اور پھر تجاہل عارفانہ دکھاتے ہو ۔اچھا میں تم سے کہتا

ہوں کہ تمہارا ان باتوں سے کیا مطلب ہے۔

نہ کہیو طعن سے پھر تم کہ "ہم ستم گر ہیں"

مجھے تو خُو ہے کہ جو کچھ کہو "بجا" کہیے

فرماتے ہیں تم جانتے ہو کہ میری عادت ہر بات پر درست اور بجا کہنے کی ہے جب یہ بات ہے تو آپ طنزاً بھی نہ کہنا کہ ہاں۔ ہم ستم گر ہیں ورنہ ہمیں عادت کے مطابق یہی کہنا ہوگا کہ آپ نے درست فرمایا۔ اب تم مجھ سے ناراض ہو۔ پھر کبھی تم طنزاً بھی اپنے آپ کو ستم گر نہ کہنا۔ ورنہ میں تو عادت کے موافق کہہ دوں گا بجا فرمایا۔ حالانکہ یہ میرے دل کی آواز نہ ہوگی۔

وہ نیشتر سہی پر دل میں جب اُتر جائے

نگاہِ ناز کو پھر کیوں نہ آشنا کہیے

فرماتے ہیں یہ ہم مانتے ہیں کہ نگاہِ ناز نشتر ہے مگر جب دل میں اُتر جائے اور مکینِ دل ہو جائے تو پھر اس کو آشنا کہنا ہی مناسب ہوگا۔

نہیں ذریعۂ راحت جراحتِ پیکاں

وہ زخمِ تیغ ہے جس کو کہ دل کشا کہیے

فرماتے ہیں تیر کا زخم ذریعہ راحتِ خاطر نہیں ہو سکتا۔ جس زخم کو دل کشا کہنا چاہیئے وہ تلوار کا زخم ہوتا ہے۔ اس سے دل خاطر خواہ لذّت یاب ہو جاتا ہے۔

جو مُدّعی بنے اُس کے نہ مدّعی بنئے

جو نا سزا کہے اُس کو نہ نا سزا کہیے

فرماتے ہیں ۔ کسی دشمنی کے جواب میں دشمنی کرنی حسنِ اخلاق نہیں اور نہ ہی یہ اسلام کی تعلیم ہے۔ ہاں بیشک دفاع کی اجازت ہے۔ اور اگر کوئی شخص تم کو بُرا کہتا ہے تو کہنے دو۔ تم اس کو بُرا نہ کہو برائی کا بدلہ بھلائی اور احسان سے دو۔ "ادفع باالتی ھی احسن"

کہیں حقیقت جاں کاہیٔ مرض لکھیئے

کہیں مصیبتِ ناسازیٔ دوا کہیئے

فرماتے ہیں ہم مرضِ عشق میں مبتلا ہیں اس لئے ہم اُس کی جانکاہی کا حال لکھنے پر مجبور ہیں۔ اس پر طرّہ یہ اس مرض میں کوئی دوا کارگر ثابت ہوتی نظر نہیں آتی تو اس کا حال لکھنے پر بھی مجبور ہیں۔ اس کے سوا ہمارا اور کام ہی کیا ہے۔

کبھی شکایتِ رنجِ گراں نشیں کیجے

کبھی حکایتِ صبرِ گریز پا کہیئے

فرماتے ہیں ساری عمر اسی میں گزر گئی کہ ہم شکایتِ رنج و آلام کرتے رہے کبھی صبرِ گریز پا کی شکایتیں ہیں سُننے والے بھی پریشان ہم بھی پریشان۔ دشمن ہنسی اڑاتے ہیں۔ دوست احباب طعن و تشنیع کے ساتھ صبر کی تلقین کرتے ہیں۔ عشق ہمارے لئے بلائے جان ہے۔

رہے نہ جان تو قاتل کو خوں بہا دیجے

کٹے زباں تو خنجر کو مرحبا کہیئے

فرماتے ہیں جان نکلتے وقت قاتل کو خون بہا معاف کر دینا چاہیئے۔ اور زبان کے کٹنے پر خنجر کی تعریف لازمی ہے۔

نہیں نگار کو الفت نہ ہو، نگار تو ہے
روانیٔ روش و مستیٔ ادا کہیئے

فرماتے ہیں ۔ محبوب کو محبت نہیں نہ سہی مگر وہ ہمارا محبوب تو ہے۔ تم اس کے ناز و انداز اور حُسن کی تعریف کرتے رہو۔

نہیں بہار کو فرصت نہ ہو، بہار تو ہے
طراوتِ چمن و خوبیٔ ہوا کہیئے

فرماتے ہیں بہار کو فرصتِ قیام نہیں ہے نہ ہو آخر بہار ہے۔ تم اس کی طراوت کی تعریف اور ہوا کی خوبی بیان کرو کہ کیسی فرحت بخش اور خوش گوار ہے لیکن اس کی کم فرصتی کی شکایت زبان پر نہ لاؤ۔

سفینہ جب کہ کنارے پہ آ لگا غالبؔ
خدا سے کیا ستم و جورِ ناخدا کہیئے

فرماتے ہیں ۔ اے غالبؔ اب سفینہ ساحل پر آ لگا ہے۔ اب تمام طوفانوں کو راستے کی مصیبتوں کو بھول جانا چاہیئے۔ اب کیا ناخدا کے ستم و جور کا شکوہ شکایت۔ جو کچھ تھا گزر گیا۔

اسی مفہوم سے ملتے جلتے چند اشعار جو ذہن میں تھے صفحہ قرطاس پر ثبت کر رہا ہوں۔

غالبؔ ہی دوسری جگہ فرماتے ہیں۔

ہو چکیں غالبؔ بلائیں سب تمام ؛ ایک مرگِ ناگہانی اور ہے

مدت سے امیرؔ اُس کے ملنے کی تمنا تھی ؛ آج اُس نے بُلایا ہے لینے کو قضا آئی (امیر مینائی)

اپنے غم خانہ کا دروازہ کرو بند اکبرؔ اب سوا موت کے کوئی نہیں آنے والا (اکبر الہ آبادی)

غزل ۲۰۹

رونے سے اور عشق میں بیباک ہو گئے　　　دھوئے گئے ہم اتنے کہ بس پاک ہو گئے

معنی ۔ دھویا جانا ۔ بے شرم و بیباک ہو جانا ۔

فرماتے ہیں ۔ جب تک ہم نے آنسو نہ بہائے تھے ۔ راز عشق چھپا تھا ۔ ہمارے عشق کا کسی کو پتہ نہ تھا ۔ مگر جب ضبط کا بندھن ٹوٹ گیا اور ہم کھُل کے رونے پر مجبور ہو گئے تو ہم نڈر ہو گئے اور ہمارا یہ ڈر کہ کسی کو ہمارے درد کا پتہ چل جائے گا ۔ جاتا رہا ۔ اور اب ہم ایسے بے شرم و بے حجاب ہو گئے کہ ہمیں کسی کی پرواہی نہیں ہم آزاد ہو کر بدلحاظ ہو گئے اور یہ سب کچھ ضبط گریہ میں ناکامی سے ظہور پذیر ہوا ۔ عشقِ حقیقی میں معنی یوں کریں گے کہ جس قدر ہم نے توبہ واستغفار کیا ۔ روئے دھوئے اتنا ہی عشق بڑھتا گیا ۔ اشکِ ندامت کے پانی سے ہمیں دھو دھلا کر بالکل پاک و صاف کر دیا یعنی خدا نے ہمارے گناہ معاف کر دیئے ۔

صرفِ بہائے مے ہوئے آلاتِ مے کشی　　　تھے یہ ہی دو حساب سو یوں پاک ہو گئے

فرماتے ہیں ۔ آلاتِ مے کشی ۔ چاندی سونے کے شراب رکھنے اور پینے کے برتن جو تھے ہمیں ان کی حفاظت اور حساب رکھنا ہوتا تھا ہم نے ان سب کو بیچ کر شراب پی اور جو کچھ کلال کا قرض تھا وہ بھی چکا دیا ۔ یہی دو مصیبتیں بلائے جان رہتی تھیں سو وہ یوں ختم ہوئیں ۔ نہ رہے بانس نہ بجے بانسری ۔

رسوائے دہر گو ہوئے آوارگی سے تم　　　بارے طبیعتوں کے تو چالاک ہو گئے

فرماتے ہیں ۔ اگرچہ آوارگی کے سبب تم زمانہ بھر میں بدنام و رسوا ہو گئے ۔ لیکن اس بدنامی سے ایک فائدہ بھی ہوا ہے اور وہ یہ ہے کہ تم حاضر جواب ہو گئے ۔ چالاک ہونا محاورہ ہے یعنی حاضر

جواب ہونا۔

کہتا ہے کون نالۂ بلبل کو بے اثر   پردے میں گُل کے لاکھ جگر چاک ہو گئے

فرماتے ہیں ۔ نالۂ بلبل کو بے اثر کون کہتا ہے۔ دیکھتے نہیں کہ گل کے لباس میں لاکھوں جگر چاک ہوتے ہیں۔ پھولوں کا کھلنا تشبیہ ہے جگر چاک ہونے کی۔ مطلب یہ ہے کہ عاشق کا نالہ و فریاد بے اثر نہیں ہوتا۔ گلوں کے یعنی حسینوں کے جگر چاک کرتا رہتا ہے۔ گو وہ پردے میں ہی رہتے ہیں۔

پوچھے ہے کیا وجود و عدم اہلِ شوق کا؟   آپ اپنی آگ کے خس و خاشاک ہو گئے

فرماتے ہیں ۔ اہلِ شوق یعنی عاشقانِ الٰہی کے وجود و عدم کا کیا کہنا۔ اُن کے متعلق تو کیا معلوم کرنا چاہتا ہے۔ وہ تو آتشِ عشق میں جل کر راکھ ہو گئے۔ جس طرح گھاس پھوس جلدی سے جل جاتا ہے یہ اہلِ شوق تو فنا فی اللہ ہو جاتے ہیں۔ بظاہر زندہ ہوتے ہیں لیکن اپنے آپ کو کبھی کا مٹا چکے ہوتے ہیں۔

کرنے گئے تھے اُن سے تغافل کا ہم گلہ   کی ایک ہی نگاہ کہ بس خاک ہو گئے

فرماتے ہیں ۔ کہ ہم اُس سے اُس کے تغافل کا گلہ کرنے گئے تھے اور ہم نے درخواست کی کہ ہماری طرف بھی نظر کیجئے۔ اس نے ایک ہی نگاہ غلط انداز ڈالی تو جل کر خاک ہو گئے۔ مطلب یہ ہے کہ شاہدِ حقیقی کو اپنے طریق پر دیکھنے کی خواہش کرنا اچھا نہیں وہ خود جانتا ہے کہ کسی پر اپنے آپ کو کس طرح اور کس طریق سے ظاہر کرے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دیکھنے کی ضد کی تھی کیا نتیجہ نکلا۔ بے ہوش ہو کر زمین پر گر گئے اور پہاڑ ریزہ ریزہ ہو گیا۔

کیا خوب فرمایا ہے استاذی المحترم حضرت دلؔ شاہجہانپوری نے ؎

سرِطور ایک برقِ حسن لہراتی نظر آئی
ذرا شوخی سے جھٹکا تھا کسی نے اپنے داماں کو

اس رنگ سے اُٹھائی کل اُس نے اسدؔ کی نعش دُشمن بھی جس کو دیکھ کے غمناک ہو گئے

فرماتے ہیں۔ خلافِ توقع اسدؔ کی میت کل اُس نے ایسے المناک انداز سے اُٹھائی کہ دشمنوں کی آنکھیں بھی اشک آلود ہو گئیں۔

غزل ۲۱۰

نشہ ہا شادابِ رنگ و ساز ہا مستِ طرب
شیشۂ مے سروِ سبزِ جُوئے بارِ نغمہ ہے

فرماتے ہیں۔ نشے راگ رنگ یعنی موسیقی سے شاداب ہوئے ہیں اور ساز نشۂ طرب سے مست و سرشار ہے۔ مطلب یہ ہے کہ دونوں میں حد درجہ اندمال ہے کہ مینائے شراب جوئبارِ نغمہ بن گیا ہے۔

ہم نشیں مت کہہ، کہ برہم کر نہ بزمِ عیشِ دوست
واں تو میرے نالے کو بھی اعتبارِ نغمہ ہے

فرماتے ہیں۔ اے ہم نشیں تو مجھے یہ نہ کہہ کہ بزمِ عیشِ دوست کو اپنے نالوں سے کیوں برہم کرتا ہے۔ نہیں ایسا بالکل نہیں ہے۔ میرا نالہ تو بزمِ دوست میں پہنچ کر نغمہ کا کام کرتا ہے مطلب یہ ہے کہ میرا دوست میرے نالے کو سن کر خوش ہوتا ہے۔ ناراض نہیں ہوتا۔ لہٰذا تو مجھے نالوں سے روکنے کی کوشش نہ کر۔

غزل ۲۱۱

عرضِ نازِ شوخیٔ دنداں برائے خندہ ہے　　دعوئے جمعیتِ احباب جائے خندہ ہے

فرماتے ہیں۔ دانت اپنی شوخی و خوبی ہنسی کے وقت دکھاتے ہیں یعنی بوقتِ ہنسی دانت نظر آتے ہیں۔ لیکن احباب کی جمعیت واتحاد کا دعویٰ کرنا۔ قابلِ مذمت و ندامت ہے۔ بڑھاپے میں دانت الگ ہوتے ہیں ٹوٹ جاتے ہیں۔ اسی طرح دوستوں کے دلوں میں فرق پڑ جاتا ہے اور دوستیاں ٹوٹ جاتی ہیں ۔

ہے عدم میں غنچہ محوِ عبرتِ انجامِ گُل　　یک جہاں زانو تامل درقفائے خندہ ہے

فرماتے ہیں ۔جب تک غنچہ کھل کر گل نہیں بنا تھا وہ گل بننے کا انجام سوچ رہا تھا اور یا غنچہ بننے کی خوشی میں محو تھا۔ لیکن اس غور وفکر یا خوشی ومسرت کا عرصہ بہت تھوڑا ہے جیسے انسان سر بزانو ہو کر سوچتا ہے اور پھر تھک کر اپنے سر کو زانو سے اُٹھا لیتا ہے۔ بعینہٖ یہی حالت غنچہ کی گل بن جانے کے بعد ہے۔

کلفتِ افسردگی کو عیشِ بےتابی حرام　　ورنہ دنداں در دل افشردن بنائے خندہ ہے

فرماتے ہیں ۔ افسردگیِ خاطر ایک ایسی مصیبت ہے کہ جس کے مقابلہ میں بیتابی عیش کا حکم رکھتی ہے ورنہ میں بیتابی میں دل کو دانتوں میں چبا لیتا۔ اور اپنی افسردگیٔ خاطر کا یوں خاتمہ کر سکتا۔ اور پھر دل زخمی ہو کر زخمِ خندہ اس سے حاصل ہوتا ۔

سوزشِ باطن کے ہیں احباب منکر ورنہ یاں　　دل محیطِ گریہ و لب آشنائے خندہ ہے

فرماتے ہیں ۔ ہمارے دوست احباب سوزشِ باطن کو نہیں دیکھ سکتے جو ہمارے دل میں ہر وقت موجزن
ہے یعنی درد و سوز۔ اور ہمارے دل کو گریہ نے گھیرا ہوا ہے لیکن ہمارے لبوں پر ہنسی کھیل رہی
ہے جو ہمارے سوزِ دل کی پردہ داری کر رہی ہے ۔ مطلب یہ ہے کہ ظاہر میں ہم رند ہیں لیکن باطن
میں صاحبِ وجد و حال ہیں ۔

خمار بارہ بنکوی کا ایک شعر ملاحظہ ہو ؎

نہیں ہوتا مداوائے غمِ پنہاں نہیں ہوتا
بظاہر ہنس لیا جاتا ہے غم پنہاں نہیں ہوتا

حسن بے پروا خریدارِ متاعِ جلوہ ہے　　آئنہ زانوئے فکرِ اختراعِ جلوہ ہے

فرماتے ہیں ۔ حسن بے نیاز اور بے پروا ہے لیکن پھر بھی آرائش اور جلوہ گری کی خواہش و آرزو رکھتا
ہے اور یہ نمود حسن متاعِ حُسن ہے ۔ آئینہ اُس کے لئے زانوئے فکر ہے یعنی وہ آرائشِ حسن
کے لئے نئے نئے طریق ایجاد کرتا رہتا ہے یہ شعر تصوف میں ہے ۔ ماہرِ فلکیات کا کہنا ہے کہ
ہزاروں دُنیائیں بنتی ہیں اور مٹتی بھی رہتی ہیں ۔

تا کجا اے آگہی رنگِ تماشا باختن　　چشمِ واگردیدہ آغوشِ وداعِ جلوہ ہے

معنی رنگِ تماشا باختن ۔ رنگ بدلتے رہنے کے تماشے ۔

فرماتے ہیں ۔ اے آگہی تو کب تک تماشائے عالم کو بدلتی رہے گی ۔ اور اس طرح چشم وا یعنی کھلی ہوئی
آنکھ محوِ تماشائے عالم رہے گی ۔ یعنی چشم تماشائی جلوہ کے رخصت کرنے کے لئے آغوشِ وداع
ہے چشم وا کرنا گویا اس کے رخصت کرنے کے لئے آغوش کشائی ہے

غزل ۲۱۲

جب تک دہانِ زخم نہ پیدا کرے کوئی   مشکل کہ تجھ سے راہِ سخن وا کرے کوئی

فرماتے ہیں ۔شاہدِ حقیقی کے ساتھ اس معمولی لب و دہن کے ساتھ بات چیت نہیں کی جا سکتی ۔اس کے لئے عشق و محبت درکار ہے اور جتنا زیادہ تیغِ عشق کا زخم دل پر ہوگا اسی قدر اُس سے راہِ سخن ہموار ہوگی۔ (یا) خالقِ حقیقی سے ہم کلام ہونے کے۔لیے ضروری ہے کہ دہانِ زخم پیدا کیا جائے یعنی دنیوی علائق کے گلے پر چھری پھیر کر ۔ا کو آلائشوں سے پاک کر لیا جائے۔

عالم غبارِ وحشتِ مجنُوں ہے سر بہ سر   کب تک خیالِ طرّۂ لیلیٰ کرے کوئی

فرماتے ہیں ۔ ہستی عالم سراسر وحشتِ مجنوں کے علاوہ کچھ نہیں یعنی بے حقیقت و بے ثبات و ناپائیدار ہے لہٰذا کب تک ہم مجنوں کی طرح طرّہ لیلیٰ کے پیچھے پڑے رہیں گے۔ ایسے سراب کو موج دریا سمجھنا سراسر حماقت ہے

افسردگی نہیں طرب انشائے التفات   ہاں دردبن کے دل میں مگر جا کرے کوئی

فرماتے ہیں ۔افسردگی دکھا کر محبوب کے التفات کو حاصل نہیں کیا جا سکتا۔محبوب کی نظرِ التفات کے لئے ضروری ہے کہ وہ سراپا درد بن جائے ۔ مطلب یہ ہے کہ محض افسردہ خاطر دیکھ کر محبوب یہ خیال نہیں کرتا کہ یہ میرے عشق میں جان گھلا رہا ہے بلکہ وہ سمجھتا ہے کہ یہ بوالہوس ہے جو عشق کی نہیں بلکہ اپنی خواہشات حاصل نہ ہونے پر افسردہ و مغموم ہے۔

رونے سے اے ندیم ملامت نہ کر مجھے　　　آخر کبھی تو عقدۂ دل وا کرے کوئی

فرماتے ہیں ۔ اے ندیم مجھے دل کھول کر رونے دے اور اس وجہ سے مجھے ملامت نہ کر تو ہی انصاف سے کہہ کہ کب تک دل کی گرہ کوئی نہ کھولے اور رو کر بخار اس نہ نکالے ۔

چاکِ جگر سے جب رہِ پرسش نہ وا ہوئی　　　کیا فائدہ کہ جیب کو رسوا کرے کوئی

فرماتے ہیں ۔ ہم نے اپنا جگر اس لئے چاک کیا تھا کہ وہ دیکھے ہمارے حال پر ترس کھا کر پرسشِ حال کرے ۔ جب یہ بات نہ ہوئی تو گریبان پھاڑ کر لوگوں میں خود کو کیوں رسوا و بدنام کریں ۔

لختِ جگر سے ہے رگِ ہر خار شاخِ گل　　　تا چند باغبانیٔ صحرا کرے کوئی

فرماتے ہیں ۔ میرے پارہ ہائے جگر آنسو بن کر آنکھوں سے ٹپکے اور انہوں نے جنگل کے ایک ایک کانٹے کو شاخِ گل میں بدل دیا یعنی انہیں سیراب کیا ۔ اب صحرا میں بہار آگئی کوئی کمی نظر نہیں آتی لیکن میں کب تک اس جنگل کی باغبانی کرتا رہوں ۔

ناکامیٔ نگاہ ہے برقِ نظارہ سوز　　　تو وہ نہیں کہ تجھ کو تماشا کرے کوئی

فرماتے ہیں ۔ ناکامیٔ نگاہ تھی جو طور پر برق بن کر گری اور نظارہ کو جلا گئی ۔ تو اور تیرا جلوہ بھلا کون دیکھ سکتا ہے ۔ نہ موسیٰؑ نے دیکھا نہ کوئی اور دیکھ سکتا ہے ۔

مطلب یہ ہے محدود غیر محدود کے حسن و جمال کا کیسے احاطہ کرے ہاں اس کی ذات سے اس کا مشاہدہ ہو سکتا ہے اور ہوتا رہتا ہے ۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے ۔

لَا تُدْرِکُهُ الابصار وھُوَ یدرک الابصار وھُوَ اللطیف الخبیر

ہر سنگ وخشت ہے صدفِ گوہرِ شکست　　　　نقصاں نہیں جنوں سے جو سودا کرے کوئی

فرماتے ہیں۔ دیوانہ سمجھتے ہیں تو لڑکے پتھر مارتے ہیں ہر پتھر سے جو زخم لگتا ہے دراصل وہ صدف کا موتی ہے۔ لہٰذا جنون کا سودا سر میں پیدا ہو تو کسی قسم کا نقصان نہیں ہے

سر بر ہوئی نہ وعدۂ صبر آزما سے عُمر　　　　فُرصت کہاں کہ تیری تمنّا کرے کوئی

فرماتے ہیں۔ ساری عمر تو صبر کی آزمائش میں گزر گئی پھر تیرے ملنے کی تمنّا اور جستجو کس وقت اور کس طرح کی جاتی۔

ہے وحشتِ طبیعتِ ایجاد یاس خیز　　　　یہ درد وہ نہیں کہ نہ پیدا کرے کوئی

فرماتے ہیں۔ فنِ شاعری میں وحشتِ طبیعت بہت سی باتیں کرتی ہے۔ اور اس سے ناامیدی بھی پیدا ہوتی ہے لیکن سب لوگ ہی پسند کرتے ہیں۔ گویا یہ درد ایسا نہیں ہے جسے کوئی پیدا کرنا نہ چاہے بلکہ ہر شخص کا کچھ نہ کچھ اس طرف رحجان ہوتا ہے۔

جناب سیتم شاہجہانپوری فرماتے ہیں۔ ؎

یہ الگ بات کہ حاصل نہ ہو تابِ اظہار
حسرتِ شعر ہر اک دل میں نہاں ہوتی ہے

بے کاریٔ جنوں کو ہے سر پیٹنے کا شغل　　　　جب ہاتھ ٹوٹ جائیں تو پھر کیا کرے کوئی

فرماتے ہیں۔ جنوں کے لئے کچھ کرنا لازمی ہے۔ جب تک لباس جسم پر تھا اُسے پھاڑتے رہے گریبان کی دھجیاں اُڑاتے رہے۔ جب وہ نہ رہا تو ہاتھوں سے سر پیٹنا شروع کر دیا۔ اب دیکھتے ہیں کہ جب ہاتھ ٹوٹ جائیں گے یعنی بیکار ہو جائیں یا تھک جائیں گے تو جنون کون سا طریقہ اختیار کرتا ہے۔

حُسنِ فروغِ شمعِ سخن دور ہے اسدؔ — پہلے دلِ گداختہ پیدا کرے کوئی

فرماتے ہیں)۔ اے اسد پہلے شمع کی طرح دلِ گداختہ پیدا کرو پھر حسنِ فروغِ شمعِ سخن نصیب ہوگا۔ اور وہ منزل ابھی بہت دُور ہے۔

غزل ۲۱۳

ابنِ مریم ہُوا کرے کوئی — میرے دُکھ کی دوا کرے کوئی

فرماتے ہیں۔ اگر کوئی اپنے زمانہ کا مسیحا ہے تو ہوا کرے مجھ سے کیا واسطہ میں تو جب اُسے مسیحا جانوں گا جب وہ میرے دردِ دل کا علاج کرے گا۔

شرع و آئین پر مدار سہی — ایسے قاتل کا کیا کرے کوئی

فرماتے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ شرع اور قانون کی نظر میں قاتل مجرم ہے اور قابلِ سزا ہے۔ مگر ایسے قاتل کا کوئی کیا کرے جو بغیر تلوار کے عشاق کو قتل کرتا ہے۔ یعنی تیغِ نگاہ اور تیرِ نظر سے۔

چال جیسے کڑی کمان کا تیر — دل میں ایسے کے جا کرے کوئی

فرماتے ہیں۔ ایسے محبوب کے دل میں کیسے جگہ پیدا کی جا سکتی ہے جس کی غرور کی چال کڑی کمان کی طرح ہے۔ کمان جس قدر سخت ہوگی اتنا ہی تیر تیزی سے اپنا کام کرے گا۔

بات پر واں زبان کٹتی ہے　　　وہ کہیں اور سنا کرے کوئی

فرماتے ہیں ۔ ان کے خلاف کون کچھ کہہ سکتا ہے ۔ کہنے کے جرم میں زبان کاٹ دیتے ہیں ۔ اس لئے اُن کی بات غلط بھی ہو تو ہم چپ چاپ سُنتے رہتے ہیں ۔

بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ　　　کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی

فرماتے ہیں ۔ جوشِ جنوں میں مَیں بڑے بڑے رازِ عشق کھول رہا ہوں ۔ خدا کرے میرے کہنے کو کوئی ذرا نہ سمجھے ۔

نہ سنو ، گر بُرا کہے کوئی　　　نہ کہو گر بُرا کرے کوئی

فرماتے ہیں ۔ اخلاقِ حسنہ کا تقاضا ہے کہ تم کسی کی غیبت یا چغلی نہ سُنو اور اگر کوئی بُرا کام کرتا ہے اور تمہیں معلوم ہے تو تم اُس کی اشاعت نہ کرو اس سے برائی پھیلتی اور بڑھتی ہے اشاعت میں نشہ کرنا بھی شامل سمجھو ۔

روک لو گر غلط چلے کوئی　　　بخش دو گر خطا کرے کوئی

فرماتے ہیں ۔ اگر کوئی غلط کام کرنے لگا ہے تو تم اُسے سمجھا بجھا کر روک دو یا کسی اور طریق سے کام لو مگر جبراً نہیں یہ قانون ہاتھ میں لینا ہے اور اگر کسی نے تمہارے ساتھ زیادتی کی ہے اور تمہارے معاف کرنے سے اُس کی اصلاح ہوسکے تو بخش دینا ایک اعلیٰ خُلق ہے ۔

کون ہے جو نہیں ہے حاجت مند　　　کس کی حاجت روا کرے کوئی

فرماتے ہیں ۔ اس دنیا میں ہر شخص حاجت مند ہے اگر کوئی کسی کی بوقتِ ضرورت مدد نہ کرسکے تو شکایت

کی جانہیں ہے بلکہ ہوسکتا ہے جس سے ہم گلہ کر رہے ہیں وہ ہم سے بھی زیادہ حاجت مند ہو۔

کیا کیا خضر نے سکندر سے　　اب کسے رہنما کرے کوئی

فرماتے ہیں ۔ مندرجہ بالا شعر میں حضرت خضر علیہ السلام اور سکندر کے مشہور قصّے کی طرف اشارہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرتِ خضر سکندر کو چشمہ آب حیواں پر لے گئے مگر سکندر نے لوگوں کو زندہ بحالت مردہ دیکھا تو آبِ حیات نہ پیا۔ فرماتے ہیں حضرت خضر نے سکندر کی کیا مدد کی کیا رہنمائی کی کہ آب حیات سے محروم رہا۔ سکندر بہت جلد دُنیا سے خالی ہاتھ چلا گیا۔ اب بتاؤ کہ کوئی کیسے کسی کو رہنما بنائے ۔

جب توقع ہی اُٹھ گئی غالب　　کیوں کسی کا گِلہ کرے کوئی

فرماتے ہیں ۔ توقع ہو تو گلہ شکوہ مفید ہوسکتا ہے مگر جب یہ نہ ہو تو پھر گلہ شکوہ کرنے سے کیا فائدہ

غزل ۲۱۴

بہت سہی غمِ گیتی ، شراب کم کیا ہے

غلامِ ساقیٔ کوثر ہوں ، مجھ کو غم کیا ہے

فرماتے ہیں ۔ دُنیا کے رنج و غم بہت ہیں مگر اس غم کے مقابلہ میں محبت الٰہی کی شراب ہر کس و ناکس کے لئے ہر وقت موجود ہے ۔ صبر و شکر کر کے غم گیتی سے مقابلہ کیا جا سکتا ہے ہم نے "شراب" سے محبتِ الٰہی مراد لی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ غالب میاں اپنے آپ کو منسوب کرتے ہیں کہ میں "غلام ساقی کوثر ہوں" ساقی کوثر کے پاس تو محبت الٰہی کی شراب ہے ۔ دوسری شراب ، تو آپ نے حرام قرار دی ہے ۔

تمہاری طرز روش جانتے ہیں ہم کیا ہے

رقیب پر ہے اگر لطف تو ستم کیا ہے

فرماتے ہیں ۔تمہاری عادت سے ہم خوب واقف ہیں کہ تم ہمیں رشک کی آگ میں جلاتے ہو۔اسی لئے تم رقیب پر لطف کرتے ہو۔یہ بھی ایک طریق تمہارا ہم پر ظلم وستم کرنے کا ہے۔

کٹے تو شب کہیں کاٹے تو سانپ کہلائے

کوئی بتاؤ کہ وہ زُلفِ خم بہ خم کیا ہے

فرماتے ہیں ۔تمہاری زلفِ پرخم سوائے ان دو باتوں کے اور کیا ہے اوّل یہ لمبائی میں شبِ فرقت کے برابر ہے اور دوئم یہ کہ اگر کسی کے کاٹ لے تو زہریلے سانپ کے زہر کا اثر اس میں ہے یعنی ان زلفوں کی محبت ہے اس کے سوا ہمیں کوئی بتلائے کہ پھر وہ زلف خم بہ خم کیا چیز ہے۔

لکھا کرے کوئی احکامِ طالعِ مولود

کسے خبر ہے کہ واں جنبشِ قلم کیا ہے؟

فرماتے ہیں ۔یہ جو اہلِ تنجیم روزانہ بچوں کے زائچہ بنا کر لوگوں کو ورغلاتے رہتے ہیں کہ اس کی قسمت میں یہ لکھا ہے تو یہ سب بے معنی ہے۔کسی کو پتہ نہیں ہے کہ کاتبِ تقدیر نے کسی کی قسمت میں کیا لکھا ہے؟

نہ حشر و نشر کا قائل نہ کیش و ملت کا

خدا کے واسطے ایسے کی پھر قسم کیا ہے؟

فرماتے ہیں ۔وہ کافرِ محض نہ قیامت کا قائل نہ وہاں کسی حساب کتاب کے عمل کا۔اور نہ وہ کسی مذہب

دلّت پر یقین رکھتا ہے۔ پھر وہ خدا کو کیسے گواہ کر سکتا ہے۔ یعنی خدا کی قسم کھائے اور ہم اس کا اعتبار کریں۔

وہ داد و دید گراں مایہ شرط ہے ہمدم

وگرنہ مہرِ سلیمان و جامِ جم کیا ہے؟

فرماتے ہیں۔ خدا کی نعمتیں اور یہ تمام تماشائے عالم جو ہمارے سامنے دیکھنے کے لیے رکھ دیا گیا ہے۔ جس کی وجہ سے ہماری نظر میں اس کی قدر و قیمت ہے وگرنہ بے دیکھے ہم کیا جانیں کہ مہرِ سلیمان کیا اور جام جم کیا چیز ہے۔

سخن میں خامۂ غالبؔ کی آتش افشانی

یقیں ہے ہم کو بھی لیکن اب اس میں دم کیا ہے

فرماتے ہیں۔ فنِ سخن میں غالبؔ کی جادو نگاری کے ہم قائل ہیں لیکن وہ اب بوڑھا ہو گیا ہے پہلے کی طرح دم خم اس میں نہیں ہے۔

غزل ۲۱۵

باغ پا کر خفقانی یہ ڈراتا ہے مجھے
سایۂ شاخِ گل افعی نظر آتا ہے مجھے

معنی۔ خفقانی = اپنے وہم سے ڈرنے والا۔

فرماتے ہیں۔ باغ نے مجھ کو خفقانی مزاج پا کر ڈرانا چاہا ہے کہ شاخِ گل شاخِ گل نہیں بلکہ افعی سانپ ہے۔ مطلب یہ کہ باغ کی تر و تازگی دل کشی کا اثر اپنے اندر لئے ہوئے ہے اور اس وجہ سے

انسان اس کے دامِ محبت میں گرفتار ہو جاتا ہے اور انجام اس کا ایسا ہی ہوتا ہے جیسے افعی سانپ کے کاٹے کا یعنی بچتا نہیں۔ ہلاک ہوتا ہے۔ یہی انجامِ عشق ہے۔

جوہرِ تیغ بہ سرچشمۂ دیگر معلوم ہوں میں وہ سبزہ کہ زہرآب اُگاتا ہے مجھے

فرماتے ہیں۔ جوہرِ تیغ جس طرح زہرآب تیغ پر چھڑکنے سے اُبھر آتا ہے۔ اسی طرح میں بحالتِ غیض وغضب باہر آتا ہوں۔ لیکن غصہ کی حالت میں بھی ہوش و حواس نہیں کھوتا بلکہ مجھ میں نہایت شاداب سبزہ نمودار ہوتا ہے۔

مدعا محوِ تماشائے شکستِ دل ہے آئنہ خانے میں کوئی لئے جاتا ہے مجھے

فرماتے ہیں۔ مجھے شکستِ دل کا تماشا دیکھنے کی خواہش اس طرح پوری ہوئی کہ دل کے ہر ٹکڑے میں تصویر نظر آنے لگی گویا میں آئینہ خانے میں داخل ہو کر تماشا دیکھ رہا ہوں۔

نالہ سرمایۂ یک عالم و عالم کفِ خاک آسماں بیضۂ قمری نظر آتا ہے مجھے

فرماتے ہیں۔ دنیا کا سرمایہ نالہ ہے اور اپنی ذات میں ایک مشتِ خاک سے زیادہ نہیں اور آسمان کی حیثیت قمری کے انڈے جیسی مجھے نظر آتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ دُنیا سوائے رنج و غم کے اور کچھ نہیں۔

زندگی میں تو وہ محفل سے اُٹھا دیتے تھے دیکھوں اب مر گئے پر کون اُٹھاتا ہے مجھے

فرماتے ہیں۔ زندگی میں وہ مجھے اپنی محفل سے اٹھا دیتے تھے اب میں مر گیا ہوں۔ دیکھوں مجھے اب کون اٹھاتا ہے۔ اٹھانے نے دو معنی پیدا کئے ہیں۔ اول میرا جنازہ کون اٹھاتا ہے۔ دوسرے دوبارہ زندہ کر کے کون اٹھاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ محبوبِ حقیقی کی محفل میں تو مجھے اس دنیا میں

باریابی نصیب نہیں ہوئی لیکن مرنے کے بعد تو میں اُن ہی کی محفل میں ہوں گا اب دیکھتا ہوں وہ مجھے وہاں سے کیسے اٹھائیں گے یعنی نکالیں گے۔ لا محالہ انہیں مجھے اپنی محفل میں ہی رکھنا پڑے گا۔

غزل ۲۱۶

روندی ہوئی ہے کوکبۂ شہریار کی　　اِترائے کیوں نہ خاک سرِ رہ گذار کی

فرماتے ہیں۔ شہریار کے خادموں، ہی غلاموں کی روندی ہوئی خاک، ہے اس لئے اِترا رہی ہے۔

جب اس کے دیکھنے کے لئے آئیں بادشاہ　　لوگوں میں کیوں نمود نہ ہو لالہ زار کی

فرماتے ہیں۔ موسم بہار میں بادشاہ سیر کو جاتے ہیں تو لوگوں میں بھی لالہ زار کی نمود و نمائش ہونی لازمی امر یعنی سیر باغ کا شوق پیدا ہو جاتا ہے۔

بھُوکے نہیں ہیں سیرِ گلستاں کے ہم ولے　　کیوں کر نہ کھائیے کہ ہوا ہے بہار کی

فرماتے ہیں۔ ہم سیر گلستان کے بھُوکے نہیں ہیں لیکن بہار کا موسم اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں سے ایک بہت بڑی نعمت ہے۔ لہٰذا ہم گلستان کی ہوا کھانے جاتے ہیں تاکہ اللہ تعالیٰ کا شکر کرنے کا موقعہ ہاتھ آئے۔

غزل ۲۱۷

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے

بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

معنی ۔ خواہش پر دم نکلنا = پورے ہونے کے لئے بیتاب ہونا جلدی کرنا ۔

فرماتے ہیں ۔ زندگی میں بفضلہ تعالےٰ بہت خواہشات پوری ہوئیں ۔ پھر بھی جو رہ گئیں وہ تعداد میں ہزاروں ہیں ۔ ہم ان کے لئے کیوں اس قدر مرے جاتے ہیں مطلب یہ ہے کہ انسان لالچی اور حریص ہے ۔ بہت کچھ مل جائے پھر بھی اس سے زیادہ کی خواہش کرتا ہے ۔ وہ مل جائے پھر اور غرض جب تک طبیعت میں غنا پیدا نہیں ہوتا یہی حالت رہتی ہے ۔

ڈرے کیوں میرا قاتل ؟ کیا رہے گا اس کی گردن پر ؟

وہ خوں جو چشم تر سے عمر بھر یوں دمبدم نکلے

فرماتے ہیں ۔ میرے قاتل کو ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں ۔ میرا خون تو بدن میں رہا ہی نہیں وہ تو سب آنسو بن کر آنکھوں کے راستہ بہہ گیا ۔ قاتل کی گردن پر کیا رہ سکتا ہے ۔

نکلنا خلد سے آدم کا سنتے آئے ہیں لیکن

بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے

مصرعِ ثانی میں "بہت" کے لفظ پر زور ہے ۔ اس لئے تاکہ آدم کے مقابلہ میں بے آبروئی کے ساتھ نکلنا ثابت ہو ۔ بے مثل شعر کہا ہے ۔

بھرم کھل جائے ظالم تیرے قامت کی درازی کا

اگر اس طرۂ پُر پیچ و خم کا پیچ و خم نکلے

فرماتے ہیں ۔ تجھے جو سب لوگ سروِ قامت کہتے ہیں اور تیرا قد دراز سمجھتے ہیں یہ اسی وقت تک ہے جب تک تیری زلفوں کے گھونگر کھلتے نہیں ورنہ ان کے کھلنے پر تیری زلفیں اتنی لمبی ہو جائیں گی کہ تیرا قد بہت چھوٹا لگنے گا ۔ مطلب یہ ہے کہ تیری زلفیں بہت خوبصورت اور لمبی ہیں ۔ بہت پُر لطف شعر ہے ۔

مگر لکھوائے کوئی اُس کو خط تو ہم سے لکھوائے

ہوئی صبح، اور گھر سے کان پر رکھ کر قلم نکلے۔

خوب انداز ہے رقیبوں کا پتہ لگانے کا اور مضامینِ خطوط سے باخبر رہنے کا ہے ۔ نامہ نویسی سے بہتر اور کیا تدبیر ہو سکتی ہے ۔ ہر شخص جو کچھ لکھوائے گا اس کا مُدعا معلوم ہو جائے گا ۔

ہوئی اِس دَور میں منسوب مجھ سے بادہ آشامی

پھر آیا وہ زمانہ جو جہاں میں جامِ جم نکلے

فرماتے ہیں ۔ گزشتہ زمانہ میں بادہ نوشی کے لئے جمشید اور اس کا جام مشہور ہوا ہے جو آج تک لوگوں میں ضرب المثل چلا آتا ہے ۔ اس زمانہ میں حریفِ جم میں ہوں ۔

ہوئی جن سے توقع خستگی کی داد پانے کی

وہ ہم سے بھی زیادہ خستۂ تیغِ ستم نکلے

فرماتے ہیں ۔ ہم جن لوگوں سے اُمید رکھتے تھے کہ آڑے وقت میں وہ ہماری کچھ مدد کریں گے ۔ وائے ستم روزگار

کہ تو نے اُن کو ہم سے زیادہ کشتۂ تیغ ستم کیا ہوا ہے۔

محبّت میں نہیں ہے فرق مرنے اور جینے کا

اُسی کو دیکھ کر جیتے ہیں جس کافر پہ دم نکلے

فرماتے ہیں ۔ محبّت میں مرنا اور جینا ایک ہی شے کے دو نام ہیں جس کو دیکھ کر ہم زندہ رہنے کی تمنّا کرتے ہیں اور جس کی وجہ سے روح و جسم میں تر و تازگی آجاتی ہے۔ اُسی کافر پہ ہمارا دم بھی نکلتا ہے۔

ذرا کر زور سینے پر کہ تیرِ پُرستم نکلے

جو وہ نکلے تو دل نکلے جو دل نکلے تو دم نکلے

فرماتے ہیں اگر ہم ذرا زور لگا کر اس کے تیرِ پرستم کو اپنے سینہ سے نکالیں تو ساتھ ہی دل بھی کھنچ کر باہر آجائے گا ۔ چونکہ تیرِ پرستم گڑ گیا ہے اور دل باہر نکل آئے گا تو دم بھی نکل جائے گا مطلب یہ ہے کہ عشقِ حقیقی کا تیر کبھی دل سے نکل ہی نہیں سکتا اور اگر نکلا تو وہی روحانی موت ہے۔

خدا کے واسطے پردہ نہ کعبہ سے اُٹھا ظالم

کہیں ایسا نہ ہو یاں بھی وہی کافر صنم نکلے

فرماتے ہیں ۔ میں تجھے خدا کا واسطہ دیتا ہوں کعبہ کا پردہ نہ اُٹھانا ۔ بہت ممکن ہے ہم جس کے عشق میں مبتلا ہیں ۔ وہ ہمارا صنم اس کے اندر ہو ۔ بے شک اور حاصل غزل شعر ہے ۔

کہاں مے خانہ کا دروازہ غالبؔ اور کہاں واعظ

پر اتنا جانتے ہیں کل وہ جاتا تھا کہ ہم نکلے

فرماتے ہیں ۔ تعجّب خیز بات ہے کہ مے خانہ کے دروازہ سے واعظ کو کوئی تعلق ہو ۔ مگر ہمیں یہ دیکھ کر

حیرت ہوئی کہ جب ہم مے خانہ سے نکل رہے تھے تو واعظ جارہا تھا۔ قیاس یہی کہتا ہے کہ مے خانہ میں شراب پینے کے لئے جارہا تھا۔ مطلب شعر کا یہ ہے کہ واعظ کو شراب الٰہی یعنی محبت الٰہی سے کیا غرض وہ تو اس شراب کا متمنی ہی نہیں ہے۔ ہم ہر وقت وہ شراب پیتے ہیں یا دہ آشامی کرتے ہیں۔

غزل ۲۱۸

کوہ کے ہوں بارِ خاطر گر صدا ہو جائیے

بے تکلف اے شرارِ جستہ کیا ہو جائیے

فرماتے ہیں ۔ اگر ہم صدا ہو جائیں تو پہاڑ بھی ہمارے بوجھ کو نہ اٹھا سکے گا۔ اور اے شرارِ جستہ تو ہی بتا کہ ہم کیا ہو جائیں گے مطلب یہ ہے کہ اگر ہماری آواز وہ آواز جو درویش کی صدا یعنی التجا ہوتی ہے۔ بن جائے ہمیں وہ درجہ اور وہ مقام حاصل ہو جائے گا جو پہاڑوں کو بھی نصیب نہیں شرارِ جستہ تو ہی بتا کہ بغیر بناوٹ بغیر تصنع کے کہ ہم صدا سے زیادہ اور کیا ہو سکتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ درویش کی طرح اللہ تعالیٰ سے صدا کرتے رہنا چاہیئے تاکہ انجام بخیر ہو ۔

بیضہ آسا ننگِ بال و پر ہے یہ کنجِ قفس

از سرِ نو زندگی ہو گر رہا ہو جائیے

فرماتے ہیں ۔ یہ کنجِ قفس یعنی دنیاوی زندگی انڈے کے خول کی مانند ہمارے بال و پر کے لئے روک ہے۔ اس کے ٹوٹتے ہی ہماری دوسری زندگی کا آغاز ہوگا۔ اور وہ زندگی از سرِ نو ہوگی یعنی اس زندگی کے مانند نہیں ہوگی ۔

غزل ۲۱۹

مستی بہ ذوقِ غفلتِ ساقی ہلاک ہے

موجِ شراب یک مژۂ خواب ناک ہے

فرماتے ہیں ۔ ساقی کی غفلت شرابیوں کی مستی تباہ و برباد کر رہی ہے اور موج شراب بھی یک لخت سوئی پڑی ہے

جز زخمِ تیغِ ناز نہیں دل میں آرزو

جیبِ خیال بھی ترے ہاتھوں سے چاک ہے

فرماتے ہیں دل میں سوائے زخم تیغ ناز کے اور کوئی آرزو نہیں ہے جیبِ خیال یعنی دل وہ بھی تیرے ہاتھوں نے چاک کر دیا ہے اور جب دل چاک ہو گیا تو وہاں آرزو کیسے رہ سکتی ہے۔

جوشِ جنوں سے کچھ نظر آتا نہیں اسدؔ

صحرا ہماری آنکھ میں یک مشتِ خاک ہے

فرماتے ہیں تماشاۓ صحرا نے جوش جنوں کو اور بڑھا دیا ہے۔ صحرا ہماری آنکھ کے لئے خاک کی چٹکی بن گیا ہے اور جب آنکھ میں خاک کے ذرات آ جائیں تو دکھائی کیا خاک دے گا مطلب یہ ہے کہ جنونِ عشق میں ماسوائے محبوب کے کوئی اور چیز کی کچھ حیثیت نہیں

غزل ۲۲۰

لبِ عیسیٰ کی جنبش کرتی ہے گہوارہ جنبانی

قیامت کشتۂ لعلِ بتاں کا خوابِ سنگیں ہے

فرماتے ہیں کشتۂ لب لعلین کی نیند کس قیامت کی نیند ہے کہ لب عیسیٰ کا اعجازِ لب بھی اُن کو جگاتا نہیں۔ اُس کے جگانے سے وہ اور گہری نیند میں ہو جاتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ جو خوابِ غفلت میں پڑے سو رہے ہیں وہ جاگنے کا نام ہی نہیں لیتے حتیٰ کہ خدا کے مامور کی آواز سنتے ہیں پھر بھی اپنی غفلت دُور نہیں کرتے۔

غزل ۲۲۱

آمدِ سیلاب طوفانِ صدائے آب ہے

نقش پا جو کان میں رکھتا ہے انگلی جادہ سے

فرماتے ہیں۔ طوفانِ صدائے آب آمدِ سیلاب کی نشانی ہے اور آمدِ سیلاب نقش پا کو جادہ سے مٹانے کے درپے ہے اسی لئے جادہ راہ اپنے کانوں میں انگلیاں ڈالے ہوئے ہے تا صدائے آب نہ سُنے چونکہ وہ وقت اُس کی فنا کا ہوگا اور ہر شے کو اپنی فنا کا خوف لاحق ہے

بزمِ مے وحشت کدہ ہے کس کی چشمِ مست کا؟ شیشے میں نبضِ پری پنہاں ہے موجِ بادہ سے

فرماتے ہیں ۔ وہ کونسا محبوب ہے جس کی چشمِ مست نے میکدہ کو ویران کر دیا اور اب وہاں سوائے وحشت کے اور کچھ نہیں۔ اور موجِ شراب شیشے میں چھپا دی گئی ہے۔ گویا پری خوف کھا کر شیشے میں بند ہو گئی ہے۔ یہ شعر بھی تصوف میں ہے۔ مراد معشوقِ حقیقی ہے ۔

غزل ۲۲۲

ہوں میں بھی تماشائی نیرنگِ تمنّا　　　مطلب نہیں کچھ اس سے کہ مطلب ہی بر آئے

فرماتے ہیں۔ میں تو نیرنگِ تمنّا کا تماشائی ہوں ۔ دیکھتا ہوں کہ تمنّا کیا کیا رنگ بدلتی ہے اور اس تماشا سے مجھے کچھ لذت حاصل ہوتی بھی ہے اور مراد پوری ہوتی بھی ہے یا نہیں کچھ سروکار نہیں ۔

غزل ۲۲۳

سیاہی جیسے گر جائے دمِ تحریر کاغذ پر

مری قسمت میں یوں تصویر ہے شب ہائے ہجراں کی

فرماتے ہیں ۔ میرے نوشتۂ تقدیر کو شبِ ہجراں نے اس طرح ڈھانک لیا ہے جس طرح لکھتے وقت سیاہی کاغذ پر گر کر لفظوں کو ڈھانک دیتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ شبِ فراق نے میری تمام آرزوؤں اور تمناؤں کو برباد کر دیا ۔ اب میں سوائے نالہ و فغاں کے کیا کر سکتا ہوں ۔

غزل ۲۲۴

ہجوم نالہ، حیرت عاجزِ عرضِ یک افغاں ہے

خموشی۔ ریشۂ صد نیستاں سے خس بدنداں ہے

فرماتے ہیں۔ باوجود ہجوم نالہ کے حیرت نے عرض فغاں سے عاجز کر دیا ہے۔ گویا خاموشی سے نیستاں جس میں صدہا بانسریاں ہیں خس بدنداں کیا ہوا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ باوجود قوتِ گویائی کے ہم رازِ عشق فاش نہیں کرنا چاہتے۔ اِسی وجہ سے ہمارے لب سلے ہوئے ہیں۔

تکلّف برطرف ہے جاں ستاں تر لطف بدخویاں

نگاہِ بے حجابِ نازِ تیغِ تیز عریاں ہے

فرماتے ہیں۔ تکلّف برطرف، محبوبوں کا لطف و کرم اُن کے جور و ستم سے زیادہ مہلک اور جان لیوا ہے یعنی جب ان کی نگاہِ ناز بے حجاب ہو جائے تو تیغِ تیز میان سے باہر ہو کر قتل کرتی ہے اور اپنا رنگ دکھاتی ہے۔

ہوئی یہ کثرتِ غم سے تلف کیفیتِ شادی

کہ صبحِ عید مجھ کو بدتر از چاکِ گریباں ہے

فرماتے ہیں۔ کثرتِ غم سے شادی کی ساری خوشی اور اُس کی لذّات خاک میں مل گئی ہیں۔ میری نگاہ میں صبحِ عید گریبان کے چاک ہونے سے زیادہ بدتر اور منحوس ہے۔

دل و دیں نقد لا، ساقی سے گر سودا کیا چاہے

کہ اس بازار میں ساغر متاعِ دست گرداں ہے

معنی دست گرداں ۔ اس شے کو کہتے ہیں، جو نقد قیمت پر بکتی ہے ۔

فرماتے ہیں ۔ اگر ساقی سے خانۂ عشق سے شراب محبت کا سودا کرنا ہے تو دل و دین کو نقد دے کر سودا کرے ۔ اس بازار میں یعنی بازارِ عشق میں شرابِ محبت کی قیمت نقد وصول کی جاتی ہے ۔

غمِ آغوشِ بلا میں پرورش دیتا ہے عاشق کو

چراغِ روشن اپنا قلزمِ صرصر کا مرجاں ہے

فرماتے ہیں ۔ غمِ عشق آغوشِ بلا میں عاشق کی پرورش کرتا ہے ۔ ہوا سے چراغ بجھ جاتا ہے ۔ لیکن طوفانِ آبِ دریا میں مرجان کا چراغ نہیں بجھاتا ۔ اسی طرح عاشق کا چراغ بھی بادِ صرصر کے طوفان میں روشن رہتا ہے ۔

غزل ۲۲۵

خموشیوں میں تماشا ادا نکلتی ہے   نگاہ دل سے تری سُرمہ سا نکلتی ہے

فرماتے ہیں ۔ تیری خاموشیوں میں ایک ادائے اظہار ہوتی ہے ۔ گویا نگاہِ دل تری سرمہ سا نکلتی ہے یعنی آواز ہوتی ہے مگر کانوں سے سنائی نہیں دیتی ۔

فشارِ تنگیٔ خلوت سے بنتی ہے شبنم   صبا جو غنچے کے پردے میں جا نکلتی ہے

فرماتے ہیں ۔ صبا اگر خلوتِ غنچہ میں چلی جاتی ہے تو غنچہ اُسے اپنی آغوش میں لے کر خوب دباتا ہے
اور صبا پھر شرم سے پانی پانی ہو جاتی ہے۔ نرالا خیال ہے ۔

نہ پوچھ سینۂ عاشق سے آبِ تیغِ نگاہ   کہ زخمِ روزنِ در سے ہوا نکلتی ہے
فرماتے ہیں ۔ دِل عاشق سے تیغِ نگاہ کی آبداری کا حال نہ پوچھ۔ اُن کے زخموں کے روزنوں سے
ہوا نکلتی ہے یعنی بے حد مہلک زخم ہیں ۔

غزل ۲۲۶

جس جا نسیم شانہ کشِ زلفِ یار ہے   نافہ دماغِ آہوئے دشتِ تتار ہے
فرماتے ہیں ۔ جس جگہ جس ملک میں نسیم زلفِ یار کی خوشبو پھیلا دیتی ہے ۔ وہاں آہوئے دشتِ تتار کا
کا دماغ بھی مشک نافہ ہو جاتا ہے ۔
مطلب اس شعر کا اہلِ تصوّف کے نزدیک یہ ہوگا کہ جس سرزمین میں محبوبِ حقیقی کی زُلف کی خوشبو
نسیم پھیلا دیتی ہے ۔ وہاں لوگوں کے دماغ بھی ترقی کر کے صاف ستھرے پاک ہو جاتے
ہیں اور وہ تمام اچھی اور نیک باتیں سوچنے اور سمجھنے لگتے ہیں ۔

کس کا سراغِ جلوہ ہے حیرت کو؟ اے خدا!   آئینہ فرشِ شش جہت انتظار ہے
فرماتے ہیں ۔ اے خدا حیرت کو کس کے جلوے کی تلاش ہے کہ اس نے شش جہت انتظار کو آئینہ بند
کر دیا ہے ۔ تاکہ کہیں نہ کہیں تو اس کا جلوہ نظر آ جائے ۔ مطلب یہ ہے کہ اے خدا میری حیرت
تجھے ہی ڈھونڈ رہی ہے اور تجھے آئینہ عالم یعنی کائنات میں دیکھ رہی ہے ۔

ہے ذرہ ذرہ تنگیٔ جا سے غبارِ شوق　　　گر دام یہ ہے وسعتِ صحرا شکار ہے

فرماتے ہیں ۔ جگہ کی تنگی کی وجہ سے اس عالم کا ذرہ ذرہ غبارِ شوق بن گیا ہے اور بہت سے ذرّے پریشان ہوکر دام بن گئے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ وسعت صحرا تک اس دام میں گرفتار ہوگئی ہے مطلب یہ ہے کہ غبارِ شوق نے صحرا پر احاطہ کیا ہوا ہے ۔

دل مدعی و دیدہ بنا مدعا علیہ　　　نظارہ کا مقدمہ پھر روبکار ہے

فرماتے ہیں ۔ دل نے آنکھوں کے خلاف عدالتِ عشق میں دعویٰ دائر کیا ہے کہ آنکھوں کی نظارہ بازی کی وجہ سے میں بتلائے رنج و ملال ہوں میری دادرسی ہونی لازم ہے ۔

چھڑکے ہے شبنم آئینہ برگِ گل پر آب　　　اے عندلیب! وقتِ وداعِ بہار ہے

اس شعر میں ایران کی پرانی رسم کا بیان ہے ۔ وہاں جانے والے مسافر کی پشت پر آئینہ رکھ کر پانی چھڑکتے تھے ۔ مطلب یہ ہوتا ہے کہ خیر و عافیت عزت و آبرو کے ساتھ اور صحیح سلامت واپس آؤ ۔ فرماتے ہیں شبنم آئینہ برگِ گل پر پانی چھڑک رہی ہے ۔ مطلب یہ ہے کہ اے بلبل وداعِ بہار کا وقت آگیا ہے ۔ اب جاؤ اور خیریت سے واپس آنا ۔

پچ آ پڑی ہے وعدۂ دلدار کی مجھے　　　وہ آئے یا نہ آئے یاں انتظار ہے

فرماتے ہیں ۔ ہمیں تو اپنے وعدہ کو نباہنا ہے ۔ ہم نے کہا ہے کہ ہم انتظار کریں گے ۔ یعنی محبوب سے جو آنے کا وعدہ لیا ہے ۔ وہ وعدہ فراموش ہے ، تو ہو ۔ آئے یا نہ آئے ۔ ہم تو رات بھر انتظار کریں گے ۔

بے پردہ سوئے وادئ مجنوں گزر نہ کر   ہر ذرّے کے نقاب میں دلِ بے قرار ہے

فرماتے ہیں۔ وادیٔ مجنوں کا ذرہ ذرہ دلِ بیتاب لئے ہوئے ہے۔ مجھے ایسی جگہ پہ بے پردہ سفر نہیں کرنا چاہیئے۔ یعنی عاشقان الٰہی کی وادی کا ذرہ ذرہ دلِ بیتاب لئے ہے کہ وہ اپنے محبوب کا دیدار کرے۔

اے عندلیب یک کفِ خس بہرِ آشیاں   طوفانِ آمد آمدِ فصلِ بہار ہے

فرماتے ہیں اے بُلبل دو چار تنکے لے کر اپنا آشیاں بنا لے ورنہ آمدِ فصلِ بہار کا طوفان آنے والا ہے تجھے کوئی سوکھے تنکے نہ ملیں گے۔ چونکہ فصلِ بہار ہر تنکے کو سرسبز کر دے گی۔

دل مت گنوا خبر نہ سہی سیر ہی سہی   اے بے دماغ آئنہ تمثال دار ہے

فرماتے ہیں۔ دل مت چھوڑ، ہمت کر لگا رہ۔ اگر تو معرفتِ الٰہی سے پوری طرح باخبر نہ ہو کوئی بات نہیں۔ تجھے لطفِ سیر تو ملے گا۔ اے بے دماغ دل میں تیرے کتنے بُت اور ان کی تصاویر بھری پڑی ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ دل اگر پوری طرح موحد نہ بنا تو نہ سہی کچھ تو توحید کی طرف آ ہی جائے گا۔

غفلت کفیلِ عمر و اسدؔ ضامنِ نشاط   اے مرگِ ناگہاں تجھے کیا انتظار ہے

فرماتے ہیں اے اسدؔ تیری کفیل غفلت ہوئی ہے۔ اور تو نے عمر بھر کی نشاط کی ٹھان رکھی ہے یعنی ہمیشہ ہی راحت و آرام، عیش و عشرت میں ہی زندگی گزارے گا۔ تو موت کو یکسر بھول گیا ہے۔ لیکن ایک دن ناگہانی موت آجائے گی۔ اے مرگ جب آنا ہی ہے تو پھر تجھے کیا پس و پیش ہے آجا۔

غزل ۲۲۷

آئینہ کیوں نہ دوں کہ تماشا کہیں جسے ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے

فرماتے ہیں۔ میں کیوں نہ آئینہ کو روبرو رکھ دوں کہ لوگ تیرے ظِل کو دیکھ سکیں اور محوِ تماشا ہو جائیں۔ تیرے جیسا تو کوئی دوسرا حسین و خوبصورت ہے نہیں۔ یہ شعر حمد میں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ دُنیا والے تجھ کو تو دیکھ نہیں سکتے مگر آئینہ میں تیری صفات کو دیکھ سکتے ہیں۔ اگر تجھ جیسا کوئی اور ہوتا تو ہم کہہ سکتے تھے کہ محبوبِ حقیقی اس جگہ ہے مگر جبکہ تیرے جیسا کوئی دوسرا ہے ہی نہیں تو آئینہ عالم کو دیکھ کر تیرا دیدار ہو جائے گا۔ اس قبیل کا ایک شعر جناب سلیم شاہجہانپوری کا بھی ہے فرماتے ہیں ؎

آئینہ دار جلوۂ فطرت ہے کائنات
کتنی حسین نقاب ہے رخ پر پڑی ہوئی

یا ناز بریلوی کا یہ شعر بھی اسی طرف اشارہ کر رہا ہے ؎

تیری خود نمائی کا آئینہ میں ہوں
مجھی میں تجھے دیکھتا ہے زمانہ

"مجھی میں" سے مراد محبوبِ کبریا صلی اللہ علیہ وسلم ہیں جو صفاتِ باری کا اتم و اکرم و اعلیٰ نمونہ ہیں۔

حسرت نے لا رکھا تری بزمِ خیال میں گلدستۂ نگاہ سویدا کہیں جسے

فرماتے ہیں۔ حسرت نے میرے دل میں جو کہ اصل میں تیری بزمِ خیال ہے کہ سویداء دل حسرت بھری نگاہوں کا پیدا کیا ہوا گلدستہ ہے۔ تیری یاد سے میرا دل راحت و آرام حاصل کرتا ہے جیسے لوگ

سیرِ باغ میں فرحت پاتے ہیں۔

پھونکا ہے کس نے گوشِ محبت میں اے خدا　　　افسونِ انتظار، تمنّا کہیں جسے

فرماتے ہیں۔ اے خدا محبّت کے کان میں کس نے انتظار کا جادو پھونکا ہے کہ جس کو تمنّا کہتے ہیں۔
مطلب یہ ہے کہ گوشِ محبت میں یہ تمنّا ہے کہ وہ تجھے دیکھیں۔ تجھ تک پہنچ جائیں۔ کسی نے تیرا بیٹا بنایا۔ کسی نے تجھے انسان کے روپ میں دیکھا۔ کسی نے خیالی بُت بنا کر سامنے رکھتے۔ اسی لیے سب کے دل میں تڑپ ہے اور سب کو انتظار بھی ہے اور تمنّا بھی۔

سر پر ہجومِ دردِ غریبی سے ڈالیے　　　وہ ایک مشتِ خاک کہ صحرا کہیں جسے

فرماتے ہیں۔ غربت کی تکلیفوں نے مجھے پاگل بنا رکھا ہے۔ جی چاہتا ہے کہ تمام صحرا کو اٹھا کر اپنے سر پر ڈال لوں۔ جو میری نظر میں ایک مشتِ خاک سے زیادہ نہیں۔ مطلب یہ کہ جب وطن سے بے وطن ہو گئے تو پھر کیا اگر در بدر مارے پھرتے رہیں۔

ہے چشمِ تر میں حسرتِ دیدار سے نہاں　　　شوقِ عناں گسیختہ، دریا کہیں جسے

معنی۔ عناں گسیختہ = ٹوٹی ہوئی لگام گھوڑے کی۔ مراد بے قابو گھوڑا۔
فرماتے ہیں۔ میری چشمِ تر میں دیدار کی حسرت پوشیدہ ہے جس کی وجہ سے آنسوؤں کا یہ حال ہے جیسے کسی کا گھوڑا بے لگام ہو جائے یعنی بند ٹوٹ کر ہر طرف سیلاب آ جائے۔ مطلب یہ ہے کہ میری چشمِ تر کا شوق عناں گسیختہ گھوڑے کی مانند ہے کہ دریا کی روانی کی طرح بہتا چلا جائے۔

درکار ہے شگفتنِ گُل ہائے عیش کو　　　صُبحِ بہار، پنبۂ مینا کہیں جسے

فرماتے ہیں۔ ہمیں معمولی قسم کی بہار درکار نہیں ہے بلکہ ایسی عیش و نشاط کی بہار چاہیئے جس کی صبحِ بہار

پنبۂ مینا ہو وہی اصل گلشنِ نشاط و عیش ہے۔

غالبؔ بُرا نہ مان جو واعظ بُرا کہے　　　　ایسا بھی کوئی ہے کہ سب اچھا کہیں جسے

فرماتے ہیں۔ اے غالبؔ بُرا نہ منا اگر واعظ تجھ کو رند سمجھ کر بُرا کہتا ہے یہ تو دستور ہے کہ کوئی بُرا کہلاتا ہے کوئی اچھا۔ ساری دنیا نہ کسی کو اچھا کہتی ہے نہ کسی کو بُرا۔ اگر دس آدمی کسی کو اچھا کہتے ہیں تو ایک بُرا بھی کہتا ہے۔

غزل ۲۲۸

شبنم بہ گُلِ لالہ نہ خالی زِ ادا ہے　　　　داغِ دلِ بے درد نظر گاہِ حیا ہے

فرماتے ہیں۔ لالہ کے پھول پر جو شبنم کے قطرے دکھائی دیتے ہیں۔ دراصل وہ ناز و ادا سے خالی نہیں ہیں بلکہ زبانِ حال سے کہہ رہے ہیں کہ دل پر داغ تو بے شک ہے لیکن درد و سوز نہیں ہے اس لئے یہ بوندیں عرقِ انفعال کا کام دے رہی ہیں یعنی لالہ کو شرم سے پسینہ آیا ہوا ہے۔

دل خوں شدۂ کشمکشِ حسرتِ دیدار　　　　آئینہ بہ دستِ بتِ بدمست حنا ہے

فرماتے ہیں۔ حسرت کی کش مکش نے دل کو خون کر دیا ہے اب گویا وہ ایک آئینہ بدست محبوب کے پاس ہے جو مہندی لگانے کے شوق میں دیوانہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ محبوب کو ہمارے دل کی قدر نہیں ہے۔

شعلے سے نہ ہوتی، ہوسِ شعلہ نے جو کی　　　　جی کس قدر افسردگیِ دل پہ جلا ہے

فرماتے ہیں ۔ شعلۂ عشق سے جو نہ ہو سکا وہ ہوسِ شعلہ نے کر دکھایا۔ چاہیئے تو یہ تھا کہ شعلۂ عشق خوب بھڑکتا اور دل کو جلا کر خاک کر دیتا۔ لیکن اس ناکامیٔ عشق پر ہمارا جی جل گیا اور خاک ہو گیا۔

تمثال میں تیری ہے وہ شوخی کہ بصد شوق آئینہ بہ اندازِ گل آغوش کُشا ہے

فرماتے ہیں ۔ تیری تصویر بھی شوخی و ادا میں کم نہیں ہے۔ جب اس کو شیشہ میں لگایا گیا تو وہ پھول کی مانندِ شوق ہم آغوشی میں آغوش کشا ہو گیا۔ مطلب یہ ہے کہ تیری تصویر ہمارے شیشہ دل میں جب جوڑی گئی تو دل ٹوٹ گیا۔ کیونکہ دل اس کو اپنی آغوش میں لینا چاہتا تھا۔ اور ہمارے دل کو توڑنا تیری تصویر کی شوخی تھی۔

قمری کفِ خاکستر و بلبل قفسِ رنگ اے نالہ نشانِ جگرِ سوختہ کیا ہے

فرماتے ہیں قمری جو ایک مشتِ خاک سے زیادہ ہستی نہیں رکھتی اور بُلبل جو ایک قفسِ رنگ سے زیادہ حیثیت کی مالک نہیں۔ ان کے بولنے اور چہکنے کی وجہ سے انہیں دنیا جان گئی ۔ گویا جگر سوختہ جو عشق کا نشان ہے (تمغہ) انہیں مل گیا ۔

خُو نے تری افسردہ کیا وحشتِ دل کو معشوقی و بے حوصلگی طرفہ بلا ہے

فرماتے ہیں تیرے تغافل نے میری وحشتِ دل کو یعنی ذوق و شوق کو افسردہ کر دیا یعنی کم کر دیا ہے محبوب کو ایسا کم حوصلہ ہونا نہیں چاہیئے چونکہ یہ عاشق کے لئے ایک بلا کی مانند ہے ۔

مجبُوری و دعوائے گرفتاریٔ الفت دستِ تہِ سنگ آمدہ پیمانِ وفا ہے

فرماتے ہیں ۔ عشق بے اختیاری و مجبوری کی شے ہے۔ یعنی عشق کیا نہیں جاتا بلکہ ہو جاتا ہے۔ عشق ہو جانے پر گرفتاری و مجبوریٔ الفت کا دعوی کرنا ایسا ہی جیسے کسی کا ہاتھ پتھر کے نیچے دب جائے او

وہ کہے کہ میں نے اس پتھر کے ساتھ پیمانِ وفا باندھا ہوا ہے۔

معلوم ہُوا حالِ شہیدانِ گزشتہ　　　　تیغِ ستم آئینہ تصویر نما ہے

فرماتے ہیں۔ تیری تیغِ ستم آئینہ تصویر نما ہے۔ لہٰذا ہمیں شہیدانِ گزشتہ کے حالات سے واقفیت ہو گئی کہ تو نے اُن کے گلے کس طرح کاٹے اور انہیں قتل کیا ہے۔ آج جس طرح تو ہم پر تلوار سونتے ہوئے ہے۔ مطلب یہ ہے کہ عشق نے جو اُس کی گلی میں آگیا اُس کو قتل کر کے دم لیا ہے۔

اے پرتوِ خورشیدِ جہاں تاب ادھر بھی　　　　سائے کی طرح ہم پہ عجب وقت پڑا ہے

فرماتے ہیں۔ اے آفتابِ حقیقت تیرے نور اور تیری روشنی نے ایک جہان کو منور کیا ہوا ہے۔ لیکن ہماری طرف بھی نظرِ عنایت کر۔ ہم بھی سایہ کی طرح اپنے آپ کو دھوکے میں ڈالے ہوئے ہیں جبکہ ہماری کوئی حقیقت ہی نہیں، جب روشنی آتی ہے تو سایہ غائب ہو جاتا ہے۔ اے ہمارے آفتابِ حقیقت ہم پر بھی چمک تاکہ ہم بھی تیری روشنی میں اپنا وجود کھو بیٹھیں۔

ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد　　　　یارب! اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے

فرماتے ہیں۔ یارب تیرا قانون ہے تیری سُنّت ہے کہ جب تک فعلِ بد کوئی کر نہیں لیتا اس وقت تک وہ گناہ نہیں لکھا جائے گا مگر اس کے برعکس نیک خیالوں کی بھی جزا تو دے گا۔ تو اے خدا کردہ گناہوں کی سزا ہے تو جو گناہ میں نہ کر سکا۔ تیرے خوف سے یا کسی وجہ سے اُن کی حسرت ہے لہٰذا ان کی داد ملنی چاہیئے۔ مطلب یہ ہے کہ ان حسرتوں کی جزا ملنی چاہیئے جو میرے دل میں تھیں لیکن عمل میں نہ آسکیں کیونکہ یہی تیری سنّت ہے۔

بیگانگیٔ خلق سے بے دل نہ ہو غالبؔ　　　　کوئی نہیں تیرا، تو مری جان، خُدا ہے

فرماتے ہیں۔ اے غالب لوگوں نے تجھے بھلا دیا ہے۔ تیری طرف توجہ نہیں کرتے نہ سہی۔ اگر اس دنیا میں
میں تیرا کوئی نہیں تو میری جان تیرا خدا تو ہے۔ حاصلِ غزل ہے۔

غزل ۲۲۹

منظور تھی یہ شکل تجلّی کو نور کی　　　قسمت کھلی ترے قد و رُخ سے ظہور کی

یہ نعتیہ شعر ہے۔ تجلی الٰہی نے ایک ایسے وجود کو پیدا کرنے کا فیصلہ ازل سے کر رکھا تھا جو ہمارے
آقا و مولا حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم خاتم النبیین تیری ذات میں ظاہر ہوا۔ صرف تجھے ہی کو
تمام صفاتِ الٰہی کا کامل مظہر دنیا نے دیکھا۔ اگر تجھے پیدا نہ کیا جاتا تو پھر ہم اپنے خالق کا چہرہ
کیسے دیکھتے۔ تیرے ہی بابرکت نورانی وجود سے ظہورِ الٰہی کی قسمت کھل گئی۔ تیرے ہی قد و رخ
نے پوری طرح تجلی کر کے بنی نوع انسان کو خدا کا چہرہ دکھایا ہے کیونکہ تو اپنی سیرت کے لحاظ
سے خدا نما وجود ہے۔

اِک خونچکاں کفن میں کروڑوں بناؤ ہیں　　　پڑتی ہے آنکھ تیرے شہیدوں پہ حُور کی

فرماتے ہیں۔ عاشقانِ الٰہی جو زندگی اور موت میں خدا تعالےٰ کے ہو جاتے ہیں اور اپنی دنیاوی زندگی
کو رضائے خداوندی کے مطابق ڈھال لیتے ہیں۔ ان کا خونچکاں کفن یعنی ان کی مصائب و آلام
سے بھری ہوئی زندگی جس میں کروڑوں حسین پہلو ہوتے ہیں آسمانی مخلوق اُن کو خراجِ تحسین پیش
کرتی ہے۔

واعظ نہ تم پیو نہ کسی کو پلا سکو　　　کیا بات ہے تمہاری شرابِ طہور کی

فرماتے ہیں ۔ اے واعظ نہ تم خود پی سکتے ہو اور نہ کسی کو پلانے کی اہلیت رکھتے ہو اور تعریف بے حد کرتے ہو۔ معلوم ہوتا ہے کہ تمہاری شراب طہور صرف باتیں بنانے کے لئے ہے ۔ مطلب یہ ہے کہ محبتِ الٰہی کی شراب نہ تم نے کبھی پی ہے اور نہ کسی کو پلائی ہے ۔ یعنی نہ تم خود نیک ہو اور نہ کسی کو نیک بنا سکتے ہو یا نہ تم خود متقی ہو نہ کسی اور کو اپنے وعظوں سے متقی بنا سکتے ہو۔ یہ شراب طہور تمہارا زبانی جمع خرچ ہے ۔

لڑتا ہے مجھ سے حشر میں قاتل کہ کیوں اُٹھا ۔ گویا ابھی سُنی نہیں آواز صُور کی

فرماتے ہیں ۔ میرا قاتل مجھ سے حشر کے دن جھگڑتا ہے کہ میں نے تجھے مارا ، میرے اُٹھانے سے ہی اٹھتا بغیر میرے اٹھائے کیوں اُٹھ گیا ۔ شاید اس نے ابھی تک صور کی آواز نہیں سُنی ۔ مطلب یہ ہے کہ جب دنیا قیامت (صغریٰ) یعنی حشر کا نظارہ پیش کرتی ہے ۔ تو اللہ تعالیٰ کسی کو صور پھونکنے والے کو چُن لیتا ہے یعنی مامور من اللہ ۔ جو صور میں نیکی کی آواز پھونکتا ہے جو روحانی طور پر زندہ کرنے کے مترادف ہے ۔ اُس وقت وہ قاتل جو نسلِ آدم کا خون کئے ہوتے ہیں ۔ یعنی بُرائی میں ملوث ہوتے ہیں ، وہ اُن لوگوں سے جھگڑتے ہیں جنہوں نے صور کی آواز سن کر لبیک کہا ہوا ہوتا ہے اور یہ ہمیشہ سے ہوتا آیا ہے اور ہوتا رہے گا ۔

آمد بہار کی ہے جو بُلبل ہے نغمہ سنج ۔ اُڑتی سی اک خبر ہے زبانی طیُور کی

یہ شعر بھی حقیقت اور مجاز دونوں پر یکساں چسپاں ہوتا ہے بلکہ مجاز کی نسبت حقیقت پر زیادہ ۔ فرماتے ہیں بُلبل کی نغمہ سنجی بلا سبب نہیں ہے ۔ بہار آنے والی ہے اور میں نے یہ بات طیور کی زبانی سُنی ہے ۔ حقیقت پر یہ شعر اس طرح چسپاں نظر آتا ہے کہ ہمارا اسلام کا زمانہ آنے والا ہے اور مجھے اس کا احساس مختلف بُلبلوں کی نغمہ سنجی کی وجہ سے ہوا اور خبر میں نے عام لوگوں سے نہیں بلکہ اُن لوگوں کی زبانی سُنی ہے جو طیور ہیں یعنی جن کی اڑان عرش تک ہے ۔ خدا تعالیٰ کے نیک بندے ۔

گو واں نہیں پہ واں کے نکالے ہوئے تو ہیں　　　کعبے سے اِن بتوں کو بھی نسبت ہے دُور کی

فرماتے ہیں ۔ اب تو نہیں مگر پہلے خانہ کعبہ میں بُت رکھے ہوئے تھے جو وہاں سے نکال دیئے گئے اِس لئے ان بتوں کو کچھ نہ کچھ نسبت تو ہے گو دُور کی سہی۔ مطلب یہ ہے کہ جن لوگوں نے بُت بنالئے ہیں گو انہوں نے یہ کام غلط کیا ہے مگر دیکھنا یہ ہے کہ کس کے لئے اور کس کی محبّت میں ایسا کیا ہے اور وہ محبتِ الٰہی ہے جو پسِ پردہ کام کر رہی ہے۔ لہٰذا نسبت ہے مگر دور کی جس کا فائدہ نہیں ۔

کیا فرض ہے کہ سب کو ملے ایک سا جواب　　　آؤ نہ ہم بھی سیر کریں کوہِ طُور کی

فرماتے ہیں ۔ یہ بات اللہ تعالیٰ نے اپنے اُوپر فرض نہیں کی کہ سب کو موسیٰ علیہ السلام کی طرح لن ترانی کہہ دیں۔ آؤ ہم کوشش کریں، شاید ہمیں جواب نفی میں نہیں بلکہ اثبات میں ملے۔ اور ہم دیدارِ الٰہی سے مستفید ہوں۔ سیر لفظ بمعنی کوشش استعمال ہوا ہے ۔

گرمی سہی کلام میں، لیکن نہ اِس قدر　　　کی جس سے بات اس نے شکایت ضرور کی

فرماتے ہیں ۔ وعظ و نصیحت والی باتیں پیار محبت والی زبان میں ہونی چاہئیں نہ کہ شعلہ بیانی اور تحکّم رکھنے والی زبان میں۔ آج یہ واعظ جس سے بھی بات کرتا ہے وہ شکایت کرتا ہے کہ اس کی باتوں پر کوئی کان نہیں دھرتا۔ اِس شعر میں موجودہ زمانے کے ملاؤں کا نقشہ کھینچا گیا ہے ۔

غالبؔ اگر سفر میں مجھے ساتھ لے چلیں　　　حج کا ثواب نذر کروں گا حضور کی

فرماتے ہیں ۔ بادشاہ ظفر حج کا ارادہ کر رہے تھے۔ غالبؔ میاں نے کمال اشتیاق کا اظہار کیا ہے اور منت یہ مانتے ہیں کہ حج کا ثواب حضور کی نذر کروں گا۔ بات صاف ہے جو کہ شوخیِ طبع میں کہی گئی ہے۔ نیکی کرنے والے اور کرانے والے دونوں کو ثواب ملتا ہے ۔

غزل ۲۳۰

غم کھانے میں بودا دلِ ناکام بہت ہے   یہ رنج کہ کم ہے مئے گلفام بہت ہے

فرماتے ہیں ۔ رنج و غم کی برداشت دلِ ناکام میں بالکل نہیں رہی. کوئی خاص وجہ رنج و غم کی نہ بھی ہو تو اس کو
یہ رنج لاحق ہو جاتا ہے کہ مے گلفام آج تھوڑی سی ہے جس سے نشہ پورا ہونا مشکل ہے ۔

کہتے ہوئے ساقی سے حیا آتی ہے ورنہ   ہے یوں کہ مجھے دُردِ تہِ جام بہت ہے

فرماتے ہیں ۔ مجھے اس قدر قناعت ہے کہ شراب کی تلچھٹ بھی میرے لئے بہت ہے مگر ساقی سے یہ بات
کہتے ہوئے حیا آتی ہے کہ یہ اس قدر کم حوصلہ انسان ہے ۔

نے تیر کماں میں ہے نہ صیاد کمیں میں   گوشے میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے

فرماتے ہیں ۔ میں ایک گمنام اور مجبور و معذور انسان ایک گوشے میں پڑا ہوا ہوں ۔ نہ سیاست سے تعلق
نہ کسی اور امارت سے ایسی حالت میں میرا دشمن اور بدخواہ کوئی نہیں ہے ۔ اس لئے نہ میرے
لئے کسی نے تیر کمان میں چڑھا رکھا ہے نہ میری کوئی گھات میں ہے لہٰذا اس کنجِ قفس میں مجھے
آرام ہی آرام ہے ۔

کیا زہد کو مانوں کہ نہ ہو گرچہ ریائی   پاداشِ عمل کی طمعِ خام بہت ہے

فرماتے ہیں ۔ زہد و تقویٰ وہ نہیں جو کسی لالچ میں کیا جائے بلکہ عمل وہ ہے جو خالص اللہ کی فرمانبرداری
اور محبت میں کیا جائے ۔ میں اسی کو زہد و تقویٰ سمجھتا ہوں ۔ اور شاید اسی خیال کی وجہ سے خود کو

سزاوار معافی سمجھتا ہوں۔

ہیں اہلِ خرد کس روشِ خاص پہ نازاں　　　پابستگیِ رسم و رہ عام بہت ہے

فرماتے ہیں ۔ اہلِ خرد کون سی خاص روش پہ نازاں ہیں یہ بھی عام لوگوں کی طرح راہ و رسم کے بندھن میں جکڑے ہوئے ہیں۔ اگر کسی رسم کو بُرا بھی جانتے ہیں تو پھر بھی معاشرے کے دباؤ میں کر گزرتے ہیں ۔ چاہیئے تو یہ تھا کہ دانشور گروہ کھُل کر لوگوں کو بتاتے کہ یہ رسم و قیود بے فائدہ اور خلافِ مرضیِ مولا ہیں ۔

زمزم ہی پہ چھوڑو مجھے کیا طوفِ حرم سے ؟　　　آلودہ بہ مے جامۂ احرام بہت ہے

فرماتے ہیں ۔ مجھے چاہِ زمزم پر ہی چھوڑ دو تاکہ میں اپنے جامۂ احرام پر سے شراب کے دھبے دھولوں۔ طواف سے مجھے کیا فائدہ ہوگا جب احرام ہی ناپاک ہے۔ مطلب یہ ہے کہ طواف کعبہ یا حج کا کسی کو کیا فائدہ اگر جامۂ تقویٰ گندہ و ناپاک ہے تو لازم ہے کہ وہ پہلے لباسِ تقویٰ پہنے اپنی نیّت کو صاف کرے پھر وہاں جانے کا فائدہ ہے۔ بغیر ندامت اور لباسِ تقویٰ کے طوافِ کعبہ کسی کو خاص فائدہ نہ دے گا۔

ہے قہر کہ اب بھی نہ بنے بات کہ ان کو　　　انکار نہیں اور مجھے ابرام بہت ہے

فرماتے ہیں ۔ کہ ادھر ان کو میری خواہش پوری کرنے سے انکار نہیں اور مجھے اس پر اصرار ہے۔ اگر ایسی حالت میں بھی بات نہ بنے تو یہ بڑی بدنصیبی کی بات ہوگی ۔

خوں ہو کے جگر آنکھ سے ٹپکا نہیں اے مرگ　　　رہنے دے مجھے یاں کہ ابھی کام بہت ہے

فرماتے ہیں ۔ اے اجل تو مجھے کچھ مہلت اور دیدے تاکہ میں جگر کے ٹکڑے کروں پھر اُن ٹکڑوں کو خون

میں تبدیل کر کے آنسوؤں کے ذریعہ اپنے دامن پر گل کاری کروں۔ ابھی ابتدائے عشق ہے مجھے اپنے عشق کو منزل تک پہنچانا ہے۔ اور یہ کام ابھی بہت وقت چاہتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ انسان کی خواہشات کی انتہا نہیں۔ مرتے دم تک انبار لگا رہتا ہے اور مرگ ناگہانی آجاتی ہے اور انسان کفِ افسوس ملتا ہوا اس جہانِ فانی سے کوچ کر جاتا ہے۔

ہوگا کوئی ایسا بھی کہ غالبؔ کو نہ جانے　　　شاعر تو وہ اچھا ہے پہ بدنام بہت ہے

فرماتے ہیں۔ کیا ایسا بھی کوئی انسان ہے جو سارے ہندوستان میں غالب کو جانتا پہچانتا نہ ہو۔ وہ شاعر تو بہت اونچے درجہ کا ہے۔ لیکن لوگوں نے ابھی تک اس کی قدر نہیں کی۔ کیونکہ وہ اس کے کلام کی کنہ کو نہیں سمجھتے اور اسے فضول گو سمجھ کر بدنام کرتے ہیں یا وہ اپنی میکشی اور شاہد پرستی کی وجہ سے بدنام ہے اور اس رنگ میں بھی وہ لوگوں میں مشہور ہے۔ تصوف کے اعتبار سے معنی یہ ہیں کہ میں ابھی تک توبہ و استغفار کر کے جگر کو خون نہ کر سکا۔ لہٰذا اے مرگ ناگہاں مجھے کچھ دن ندامت کے آنسو بہا لینے دے۔

غزل ۲۳۱

مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کیے ہوئے　　　جوشِ قدح سے بزم چراغاں کیے ہوئے

فرماتے ہیں۔ عرصہ ہو گیا یار کی مہمان نوازی نہیں کی۔ اور شراب بھر کر پیالوں میں مہمان کے آگے نہیں رکھی تا بزم چراغاں کا لطف حاصل ہو۔ یعنی ہر جام ایک ایک چراغ کا کام دے۔

کرتا ہوں جمع پھر جگرِ لخت لخت کو　　　عرصہ ہوا ہے دعوتِ مژگاں کیے ہوئے

فرماتے ہیں۔ پارہ ہائے جگر کو جو منتشر ہو گئے تھے دوبارہ اُن کو جمع کر رہا ہوں تا مژگانِ یار کو موقع ملے کہ وہ اپنے نشتروں اور نیزوں کو دعوتِ مژگاں میں کام پر لگائے۔

پھر وضعِ احتیاط سے رکنے لگا ہے دم   برسوں ہوئے ہیں چاک گریباں کیے ہوئے

فرماتے ہیں۔ ضبطِ جنونِ عشق سے دم گھٹنے لگا ہے کیونکہ ہم نے عرصہ سے اپنا گریبان چاک نہیں کیا۔
مطلب یہ ہے کہ رازِ عشق کو دل میں دفن کئے ہوئے ہیں اور یہ کام اتنا مشکل ہے کہ دم گھٹنے لگتا ہے کبھی تو سانس لینا ہی محال ہو جاتا ہے۔

پھر گرمِ نالہ ہائے شرربار ہے نفس   مدّت ہوئی ہے سیرِ چراغاں کیے ہوئے

فرماتے ہیں۔ پھر جی چاہتا ہے کہ پہلے کی طرح میرے نالوں سے آگ برسے۔ مدّت ہوگئی ہے کہ چراغاں کا یہ تماشا نہیں دیکھا۔

پھر پرسشِ جراحتِ دل کو چلا ہے عشق   سامانِ صد ہزار نمکداں کیے ہوئے

فرماتے ہیں۔ عشق زخمِ دل کا حال چال پوچھنے کے لئے نکلا مگر اپنے ساتھ لاکھوں نمک دان لئے ہوئے ہے تا زخمِ دل پر خوب نمک چھڑک سکے۔

پھر بھر رہا ہے خامۂ مژگاں بہ خونِ دل   سازِ چمن طرازیٔ داماں کیے ہوئے

فرماتے ہیں۔ خامۂ مژگاں دل کے خون میں خوب ڈوب رہا ہے تا میرے دامن پر گلکاریاں ہوں۔
مطلب یہ ہے کہ میں فراقِ یار میں خون کے آنسوؤں سے اپنے دامن پر گلکاریاں کر رہا ہوں۔

باہم دگر ہوئے ہیں دل و دیدہ پھر رقیب   نظّارۂ خیال کا ساماں کئے ہوئے

فرماتے ہیں۔ دل و دیدہ پھر سے ایک دوسرے کے رقیب بن گئے ہیں دل نے جمالِ یار کی خیالی تصویر کھینچی ہے اور آنکھ نے نظارۂ روئے نگار کی خواہش کی ہے۔ دونوں میں ہی کشمکش ہے کہ پہلے

کون اپنی مراد پاتا ہے

دل پھر طوافِ کوئے ملامت کو جائے ہے　　　　پندار کا صنم کدہ ویراں کئے ہوئے

فرماتے ہیں۔ پھر دل کوچۂ ملامت کو جانا چاہتا ہے تاکہ تکبر و غرور کا بت کدہ توڑ ڈالے۔

پھر شوق کر رہا ہے خریدار کی طلب　　　　عرضِ متاعِ عقل و دل و جاں کئے ہوئے

فرماتے ہیں پھر ہمارا شوق کسی خریدار محبوب کی تلاش میں ہے۔ اسی لیے شوق نے متاعِ عقل و دل
کی دکان سجائی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ پھر کوئی محبوب خریدار آئے اور ہماری دل و جاں کا اپنے
حسن سے سودا کرلے۔

دوڑے ہے پھر ہر ایک گل و لالہ پر خیال　　　　صد گلستاں نگاہ کا ساماں کئے ہوئے

فرماتے ہیں پھر خیال گل و لالہ یعنی حسینوں کی جانب دوڑنے لگا ہے۔ نگاہ میں سینکڑوں گلستاں کا
سامان لئے ہوئے۔

پھر چاہتا ہوں نامۂ دلدار کھولنا　　　　جاں نذرِ دل فریبیٔ عنواں کئے ہوئے

فرماتے ہیں پھر دل، چاہتا ہے کہ کسی دلدار کا خط ہمارے نام آئے۔ لفافہ پر ہمارا نام و پتہ لکھا ہو اور اس
کے عنوان دل کو موہ لینے والے ہوں اور پھر ہم اپنی جان نذر کر دیں۔

مانگے ہے پھر کسی کو لبِ بام پر ہوس　　　　زلفِ سیاہ رخ پہ پریشاں کئے ہوئے

فرماتے ہیں۔ دل میں یہ آرزو پھر پیدا ہوئی ہے کہ کوئی محبوب اپنی کالی زلفیں اپنے رخ پر پریشاں کر کے
ہمیں کوٹھے سے دیکھتا ہو۔

چاہے ہے پھر کسی کو مقابل میں آرزو سرمہ سے تیز دشنۂ مژگاں کئے ہوئے

فرماتے ہیں۔ دل چاہتا ہے پھر کوئی محبوب میرے مقابل مژگاں کی چھری سرمہ سے تیز کئے ہوئے میرے پاس آئے۔

اک نوبہارِ ناز کو تاکے ہے پھر نگاہ چہرہ فروغِ مے سے گلستاں کئے ہوئے

فرماتے ہیں۔ پھر اک نوبہارِ ناز کو میری نظر تاک رہی ہے اور چاہتی ہے کہ وہ حسین چہرہ فروغِ مے سے گلستان کے پھولوں کی طرح رنگین اور دہکتا ہوا ہو۔

پھر جی میں ہے کہ در پہ کسی کے پڑے رہیں سر زیرِ بارِ منّتِ درباں کئے ہوئے

فرماتے ہیں۔ پھر یہ خواہش دل میں سرایت کر گئی ہے کہ ہم کسی حسین کے دروازہ پر دربان کا احسان لیتے ہوئے سر اس احسان سے جھکائے ہوئے پڑے رہیں۔

جی ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت کہ رات دن بیٹھے رہیں تصوّرِ جاناں کئے ہوئے

فرماتے ہیں۔ پھر جی چاہتا ہے کہ عہدِ جوانی جو گزر گیا جس میں فرصت ہی فرصت تھی پھر نصیب ہو جائے اور ہم رات دن تصورِ جاناں کئے بیٹھے رہیں۔ رات کو زلفوں اور دن کو چہرے سے تشبیہ دی ہے۔

غالبؔ ہمیں نہ چھیڑ کہ پھر جوشِ اشک سے بیٹھے ہیں ہم تہیۂ طوفاں کئے ہوئے

فرماتے ہیں۔ اے غالب تو ہمیں نہ چھیڑ کہ ہم پھر جوشِ اشک سے طوفان برپا کرنے کا ارادہ کئے بیٹھے ہیں۔ ایک دوسری جگہ فرماتے ہیں ؎

یوں ہی گر روتا رہا غالبؔ تو اے اہلِ جہاں ؏ دیکھنا ان بستیوں کو تم کہ ویراں ہو گئیں

غزل ۲۳۲

نویدِ امن ہے بے دادِ دوست جاں کے لئے

رہی نہ طرزِ ستم کوئی آسماں کے لئے

فرماتے ہیں۔ جتنے بھی ظلم و ستم ممکن تھے وہ سب کے سب ہمارا دوست ہم پر کرتا رہا ہے۔ اب آسمان کوئی نیا طریق کہاں سے لائے۔ لہٰذا بے دادِ دوست ہمارے حق میں امن کی خوشخبری ہے اب زندگی بھر ہم آسمان کے ظلم و ستم سے محفوظ ہو گئے ہیں۔

بلا سے گر مژۂ یار تشنۂ خوں ہے

رکھوں کچھ اپنی بھی مژگانِ خوں فشاں کے لئے

فرماتے ہیں اگر مژگانِ محبوب ابھی تک میرے خون کی پیاسی ہے تو ہونے دو مجھے پروا نہیں۔ میں اس کے حصّہ کے مطابق اس کو اپنا خون دے چکا ہوں۔ اب جو کچھ تھوڑا بہت بچا ہے وہ میری مژہ خوں فشاں کا حِصّہ ہے۔

وہ زندہ ہم ہیں کہ ہیں روشناسِ خَلق اے خضر

نہ تم کہ چور بنے عمرِ جاوداں کے لئے

فرماتے ہیں ۔ جناب حضرتِ خضر زندہ ہونا یہ ہے کہ دنیا میں دکھ سکھ اٹھائے جائیں۔ بنی نوع انسان کے ساتھ وہ کے سب کے حقوق پورے کیے جائیں۔ سب سے ملتے جلتے رہنا۔ آپ نے اگر عمرِ جاوداں پائی تو کس کام کی، چوروں کی طرح چھپتے پھرتے ہو۔

رہا بلا میں بھی میں مبتلائے آفتِ رشک

بلائے جاں ہے ادا تیری اک جہاں کے لئے

فرماتے ہیں ۔ کاش میں تنہا ساری بلاؤں کے لئے تختۂ مشق ہوتا تو بخوشی برداشت کر لیتا۔ مگر ستم بالائے ستم یہ ہے کہ تیری ادائیں بلائے جان ہیں سارے جہان کے لئے اور میں اس وجہ سے مبتلائے آفت رشک ہوں ۔

فلک نہ دُور رکھ اُس سے مجھے کہ میں ہی نہیں

دراز دستیِ قاتل کے امتحاں کے لئے

فرماتے ہیں ۔ اے فلک مجھے اُس سے دُور نہ رکھ جب ہی تو وہ مجھے قتل نہیں کرتا بس جور و ستم کا نشانہ بنائے رکھتا ہے۔ ایک میں ہی تو اس کے جور و ستم کے لئے نہیں ہوں۔ اوروں پر بھی تو اس کی دراز دستی کا امتحان ہونا چاہیئے۔

مثال یہ مری کوشش کی ہے کہ مرغِ اسیر

کرے قفس میں فراہم خس آشیاں کے لئے

فرماتے ہیں ۔ باوجود قیدی ہونے کے مرغِ اسیر بھی آشیاں کے لئے تنکے جمع کر رہا ہے۔ اس سے بڑی کوشش کی اور کیا مثال ہوگی ۔

گدا سمجھ کے وہ چُپ تھا مری جو شامت آئی

اُٹھا اور اُٹھ کے قدم میں نے پاسباں کے لئے

فرماتے ہیں۔ پاسبان مجھے گدا سمجھے ہوئے تھا۔ اس لئے وہ مجھے کچھ نہیں کہتا تھا میں موقع کی تاک میں تھا لیکن

میری شامت آئی کہ میں اٹھا اور اٹھ کر میں نے پاسبان کے قدموں کو ہاتھ لگایا تاکہ اس کی منت سماجت ہو۔ بس پھر کیا تھا پاسبان میرے ارادے اور منشا سے واقف ہوگیا اور اس نے میری خوب خبر لی۔

بہ قدرِ شوق نہیں ظرف، تنگنائے غزل

کچھ اور چاہیئے وسعت میرے بیاں کے لئے

فرماتے ہیں ۔ میرے ذوقِ شاعری کے لئے غزل کا میدان تنگ ہے میں جو کچھ اور جس قدر کہنا چاہتا ہوں اس کے لئے بہت بڑی وسیع زمین درکار ہے۔

دیا ہے خلق کو بھی تا اُسے نظر نہ لگے

بنا ہے عیش تجمّل حسین خاں کے لئے

یہ شعر نواب تجمّل حسین خاں کے لئے ہے۔

فرماتے ہیں ۔ اللہ تعالیٰ نے دوسروں کو عیش و آرام اس لئے دیا ہے تاکہ تجمّل حسین خاں کو کسی کی نظر نہ لگے ورنہ ویسے تو سارا عیش و آرام صرف تجمّل حسین خاں کے لئے ہے۔

زباں پہ بارِ خدایا یہ کس کا نام آیا

کہ میرے نطق نے بوسے میری زباں کے لئے

فرماتے ہیں اے خدا میری زبان پر یہ کس انسان کا نام آیا ہے کہ میرے نطق نے میری زبان کو چوما ہے۔

نصیرِ دولت و دیں، اور مُعینِ ملّت و ملک

بنا ہے چرخِ بریں جس کے آستاں کے لئے

فرماتے ہیں ۔ وہ نصیرِ دولت و دین ہے۔ اور مددگار و ہمدرد ملک و ملت ہے اور اس کے لئے ہی چرخ
بریں آستانہ بنایا گیا ہے ۔

زمانہ عہد میں اُس کے ہے محوِ آرائش

بنیں گے اور ستارے اب آسماں کے لئے

فرماتے ہیں ۔ اِن کے دورِ حکومت میں زمانہ محوِ آرائش ہے اور یہ موجودہ ستارے اس کی زینت کے
لئے کافی نہ ہوں گے چونکہ تجمل حسین خاں کی رعایا اپنے گھروں کی آرائش میں لگ گئی ہے ۔
لہٰذا فلک کو بھی اور نئے ستارے بنا کر آسمان پر لگانا پڑیں گے ۔

ورق تمام ہوا اور مدح باقی ہے

سفینہ چاہیئے اِس بحرِ بیکراں کے لئے

فرماتے ہیں ۔ ورق ختم ہوا اور تجمل حسین خاں کی تعریف باقی ہے ۔ ایک دفتر درکار ہے اس دریائے
تعریف و توصیف کے لئے ۔

ادائے خاص سے غالبؔ ہوا ہے نکتہ سرا

صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لئے

فرماتے ہیں ۔ غزل میں مدح لکھنی غالبؔ کی ادائے خاص ہے ۔ میرے معاصر شاعروں اور دوستوں کو
چاہیئے کہ وہ بھی یہ طریق اختیار کریں اور غزل کے رنگ میں مدح لکھنے کی کوشش کریں ۔

شرح دیوانِ غالب

قصیدہ ۱

(منقبت میں)

سازِ یک ذرّہ نہیں فیضِ چمن سے بیکار　　سایۂ لالۂ بے داغ سویدائے بہار

فرماتے ہیں۔ اس چمن میں (کائنات میں) ایک ذرّہ بھی ایسا نہیں جو چمن سے فیض حاصل نہ کر رہا ہو۔ حتیٰ کہ سایۂ لالۂ بے داغ بھی بہارِ چمن کو دوبالا کر رہا ہے یعنی سویدا۔ لالہ کو بے داغ کہنے میں یہ مصلحت ہے تا لالہ کا سایہ سویدا سمجھا جائے۔ مطلب یہ ہے کہ کائنات میں کوئی چیز باطل و فضول نہیں یعنی کوئی شے بغیر مقصد کے پیدا نہیں کی گئی۔ نیز ہر ایک شے آپس میں مربوط ہے اور ایک دوسرے سے فیض حاصل کر رہی ہے۔

یہ مضمون قرآن کریم میں بااحسن مذکور ہے جیسا کہ فرمایا۔

"آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں اور رات دن کے پیچھے آنے میں عقلمندوں کے لئے بہت سے نشان موجود ہیں۔ وہ عقلمند جو کھڑے اور بیٹھے اور اپنے پہلوؤں پر اپنے خالق و مالک کو یاد کرتے رہتے ہیں۔ اور زمین و آسمان کی پیدائش، کے بارے میں غور و فکر سے کام لیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اے ہمارے رب تو نے اس کائنات کو بے فائدہ پیدا نہیں کیا (تو بے مقصد کام کرنے سے یقیناً پاک ہے پس تو ہمیں آگ کے عذاب سے بچا۔ یعنی ہمارا وجود بے مقصد ہونے سے بچالے۔　(آلِ عمران رکوع ۲۰)

مستیٔ بادِ صبا سے بعرضِ سبزہ ریزۂ شیشۂ مے جوہرِ تیغ کہسار

فرماتے ہیں بادِ صبا بہت مست ہونے کے سبب سے پہاڑ کی چوٹی پر سبزہ اپنی شکل و رنگ ہیئت میں شیشے کی کرچیں (جام کے ٹوٹے ہوئے ٹکڑے جو شراب پینے کے بعد بعض دفعہ توڑ دیتے ہیں) سے مشابہ ہو گیا ہے۔

سبز ہے جامِ زمرّد کی طرح داغِ پلنگ تازہ ہے ریشۂ نارنج صفتِ روئے شرار

معنی۔ پلنگ۔ چیتا نارنج۔ سنگترہ جو تُرش ہو۔

فرماتے ہیں بہار اس قدر زوروں پہ ہے چیتے کے سیاہ داغوں کو سبز جامِ زمرد کے مشابہ کر دیا ہے اور سنگترہ کا ریشہ تر و تازہ اور روئے شرار نظر آ رہا ہے۔

مستیٔ ابر سے گلچینِ طرب ہے حسرت کہ اس آغوش میں ممکن ہے دو عالم کا فشار

فرماتے ہیں ابر اپنی مستانہ خرامی سے حسرت کو گلچینِ طرب بنا رہا ہے یعنی اپنی لطف اندوزی سے دونوں عالم کے غموں کا قلع قمع کر رہا ہے۔

کوہ و صحرا ہمہ معموریٔ شوقِ بلبل راہِ خوابیدہ ہوئی خندۂ گل سے بیدار

معنی راہِ خوابیدہ۔ سنسان راستہ

فرماتے ہیں کوہ و دشت سب کے سب بلبلوں کے نغموں سے بھر گئے۔ اور غنچوں کے چٹکنے کی آوازوں سے وہ راستے جو سوئے ہوئے تھے جاگ گئے۔ یعنی لوگ ہجوم در ہجوم تماشائے بہار دیکھنے کے لئے اپنے گھروں سے نکل کھڑے ہوئے۔

سونپے ہے فیضِ ہوا صورتِ مژگانِ یتیم سرنوشتِ دو جہاں ابر بیک سطرِ غبار

فرماتے ہیں ۔ بادِ بہاری کا فیض ہر شے کو پہنچ رہا ہے ہر چیز سیراب ہو رہی ہے ۔ ایک سطر جو خطِ غبار سے لکھی ہوئی ہو وہ سرنوشتِ دوجہاں (یعنی دوسوگنا) بھی جا رہی ہے ۔ اور وہ مژگانِ یتیم جو برسوں سے اپنی سرنوشت یعنی بدقسمتی پر رو رہی تھی ۔ وہ بھی بادِ بہاری سے لطف اندوز ہوئیں ۔

کاٹ کر پھینکئے ناخن تو بانداز ہلال   قوتِ نامیہ اُس کو بھی نہ چھوڑے بیکار

فرماتے ہیں ۔ اگر ناخن بھی تراش کر پھینکا جائے تو وہ بھی ہلال کی طرح بڑھتے بڑھتے بدرِ کامل ہو جائے گا ۔ بادِ بہاری میں ایسی قوتِ نمو بھری ہے ۔

کفِ ہر خاک بگردوں شدہ قمری پرواز   دامِ ہر کاغذِ آتش زدہ طاؤس شکار

فرماتے ہیں ۔ مٹھی بھر خاک قمری بن کر پرواز کرنے لگی اور ہر شعلۂ آتش طاؤس بن گیا ہے ۔ بہار نے ہر چیز کو زندگی بخشی ہے ۔ خاک کو قمری کے ساتھ اور شعلۂ آتش کو طاؤس سے تشبیہ دی ہے ۔

میکدہ میں ہو اگر آرزوئے گُل چینی   بھول جا یک قدح بادہ بہ طاقِ گلزار

فرماتے ہیں ۔ اگر تجھے میکدہ میں بیٹھے رہنے اور وہاں پھول چننے کی تمنا ہو تو یہ کر کہ ایک جامِ شراب میکدہ کے کسی گوشے یا ایسے طاق میں رکھ کر بھول جا جہاں گلدستے رکھے جاتے ہیں ۔ وہ بادِ بہار کی بدولت کچھ دنوں میں ایک شراب خانہ بن جائے گا وہ جامِ نسیاں تخم کا حکم رکھے گا ۔

موجِ گل ڈھونڈ بہ خلوت کدۂ غنچۂ باغ   گم کرے گوشۂ مے خانہ میں گر تو دستار

فرماتے ہیں ۔ اگر تو بحالتِ نشہ اپنی پگڑی مے خانہ کے کسی کونے میں رکھ کر بھول گیا ہو تو اُس پگڑی کو غنچۂ باغ کے کسی گوشہ میں جا کر تلاش کر ۔ وہ موجِ گل بن چکی ہوگی اور بہار کی اعجاز نمائی تجھ پر اچھی طرح واضح ہو جائے گی ۔

کھینچے گر مانیٔ اندیشہ چمن کی تصویر سبز مثلِ خطِ نوخیز ہو خطِ پرکار

معنی۔ مانی بمصور، نقاش

فرماتے ہیں ۔ اگر کوئی بہت اچھی سوچ بچار والا مصور چمن کی تصویر کھینچے تو سبزہ خط نوخیز کی مانند پرکار سے کھینچی ہوئی لکیریں سبز رنگ کی ہو جائیں گی چونکہ بادِ بہار جوش پر ہے ۔

لعل سے کی، ہے پئے زمزمۂ مدحتِ شاہ طوطیٔ سبزۂ کہسار نے پیدا منقار

فرماتے ہیں ۔ شاہ کی مدح سرائی کے واسطے طوطیٔ سبزۂ کہسار نے لعل کو اپنی منقار بنایا ہے ۔ لعل بھی اور سبزہ زار دونوں پہاڑوں میں پیدا ہوتے ہیں ۔

وہ شہنشاہ کہ جس کے پئے تعمیرِ سرا چشمِ جبریل ہوئی قالبِ خشتِ دیوار

فرماتے ہیں ۔ شہنشاہ کے محل کی تعمیر کے لئے حضرت جبریل علیہ السلام کی آنکھ اینٹیں بنانے کا سانچہ بن گئی ۔ مطلب یہ ہے کہ تعمیرِ محل خدا کی رضا کے تحت ہے ۔

فلک العرش ہجومِ خمِ دوشِ مزدور رشتۂ فیضِ ازل سازِ طنابِ معمار

فرماتے ہیں ۔ قصرِ شاہ کی تعمیر میں کام کرتے کرتے آسمان دوشِ مزدور کی مانند خم ہو گیا ہے ۔ اور فیضِ ازل معمار کا وہ دھاگہ (ڈوری) بن گیا ہے جس کے ذریعہ سے دیوار کا سیدھا پن بار بار پرکھا جاتا ہے ۔

سبزۂ نہ چمن و یک خطِ پشتِ لبِ بام رفعتِ ہمتِ صد عارف و یک اوجِ حصار

معنی ۔ نہ چمن ، مراد نو آسمان

فرماتے ہیں ۔ نو آسمانوں کی بلندی شاہ کے بامِ محل کے برابر ہے ۔ اور ایک صد عارف باللہ کی

ہمتوں کی بلندی شاہ کے محل کی دیواروں کا احاطہ کئے ہوئے ہے ۔

واں کی خاک سے حاصل ہو جسے یک پرِکاہ　　وہ رہے مروحۂ بالِ پری سے بیزار

فرماتے ہیں :۔ محل سرا کی خس و خاشاک سے جسے یک پرِکاہ بھی حاصل ہو جائے وہ ساری عمر پری کے پنکھے کی قطعی پروا نہ کرے ۔ مطلب یہ ہے (کہ اگر پری اپنے پَروں سے پنکھا بھی کرے)

خاکِ صحرائے نجف جوہرِ سیرِ عرفا　　چشمِ نقشِ قدم، آئینہ بختِ بیدار

معنی :۔ عرفا ، عارف کی جمع

فرماتے ہیں :۔ صحرائے نجف کی خاک عارفوں کے لئے جوہرِ سیر ہے یعنی سلوک و طریقت کی راہ کا مقصود اور منزل ہے ۔ اور چشمِ نقشِ قدم بختِ بیدار کا آئینہ ہے ۔ مطلب یہ ہے کہ عارف باللہ خاکِ نجف کو اپنے لئے موجبِ خیر و برکت خیال کرتے ہیں اور نجف کے سفر میں خود مشاہدہ کر لیتے ہیں ۔

ذرہ اُس گرد کا خورشید کو آئینۂ ناز　　گرد اُس دشت کی اُمید کو احرامِ بہار

فرماتے ہیں :۔ نجف کی خاک کا ایک ذرہ آفتاب کے لئے فخر و ناز کا آئینہ ہے اور وہاں کی خاک امید کے لئے فصلِ بہار ہے ۔

آفرینش کو ہے واں سے طلبِ مستیٔ ناز　　عرضِ خمیازۂ ایجاد ہے ہر موجِ غبار

فرماتے ہیں :۔ واں کی خاکِ پاک سے مخلوقِ خدا کو مستیٔ ناز و فخر کی طلب ہے گویا موجِ غبار انگڑائی ہے ایجاد کی ۔ مطلب یہ ہے کہ جس طرح نشہ اترنے پر انگڑائیاں آتی ہیں ۔ اسی طرح موجِ غبار اُٹھ اُٹھ کر اپنی زبانِ حال سے یہ کہہ رہی کہ میرا پیدا کرنا خالق کے لئے باعثِ فخر و ناز ہے ۔

مطلعِ ثانی

فیض سے تیرے ہے اے شمعِ شبستانِ بہار　　دلِ پروانہ چراغاں، پرِ بلبل گلزار

فرماتے ہیں ، اے شمعِ شبستانِ بہار تیرے فیض سے پروانے کا دل روشن ہوا ہے اور بلبل کے پر گلزار بن گئے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ تیری رعایا کی، دلی مرادیں سب تجھ سے ہی وابستہ ہیں۔

شکلِ طاؤس کرے آئینہ خانہ پرواز　　ذوق میں جلوے کے تیرے بہوائے دیدار

فرماتے ہیں ، طاؤس کی طرح سارا آئینہ خانہ اُڑنے لگا ہے۔ تیرے جلوے اور دیدار کے شوق نے آئینہ خانہ کو پر لگا دیئے ہیں۔

تیری اولاد کے غم سے ہے بروئے گردوں　　سلکِ اختر میں مہِ نو مژہ گوہر بار

فرماتے ہیں ، تیری اولاد کے غم میں آسمان پر مہِ نو اشکوں کے موتی برسا رہا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تیری اولاد کے غم میں آسمان بھی شریک ہے اور تیرے اشکوں کو موتی کا مرتبہ حاصل ہے۔

ہم عبادت کو ترا نقشِ قدم مہرِ نماز　　ہم ریاضت کو ترے حوصلے سے استظہار

فرماتے ہیں ، تیرا نقشِ قدم عبادت کے لئے سجدہ گاہ ہے اور ریاضت میں ترا عزم و حوصلہ پشت پناہی کا حکم رکھتا ہے۔

مدح میں تیری نہاں زمزمۂ نعتِ نبی　　جام سے تیرے عیاں بادۂ جوشِ اسرار

فرماتے ہیں ، تیری مدح میں نعتِ نبی مضمر ہے شامل ہے (چونکہ تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا مطیع

و فرمانبردار ہے) اور جو تیرا جامِ محبت پیتا ہے وہ بادۂ اسرار و عرفان سے سرشار ہو جاتا ہے

جوہرِ دستِ دُعا آئنہ یعنی تاثیر　　　یک طرف نازشِ مژگان و دگر سُو غمِ خار

فرماتے ہیں ۔ تیرے دستِ دُعا کا جوہر یہ ہے کہ وہ تاثیر کا آئینہ ہے یعنی دستِ دعا کے اُٹھتے ہی دُعا قبول ہو جاتی ہے ۔ اور مژگاں اشک آلود ہوتے ہی قبولیت کا ذریعہ بن جاتیں ہیں اور دوسری طرف جوہرِ تاثیر خارِ حسرت کو نکال پھینکتا ہے ۔ اور حسرت کے لئے رنج و ملال کا سبب بن جاتا ہے ۔

مردمک ، سے ہو ، عزا خانۂ اقبالِ نگاہ　　　خاکِ در کی تری جو چشم نہ ہو آئنہ دار

فرماتے ہیں ۔ جو آنکھ تیرے خاکِ در کی آئینہ دار نہیں یعنی فیض حاصل نہیں کرتی وہ چشم عزا خانہ کے سوگواروں میں سے ہے ۔ اور سعادت و اقبال سے اُسے کوئی علاقہ نہیں مطلب یہ ہے کہ جو تیرا خادم مطیع و فرمانبردار نہیں ہے وہ ازلی بدقسمت ہے ۔

دشمنِ آلِ نبی کو یہ طربِ خانۂ دہر　　　عرضِ خمیازۂ سیلاب ہو طاقِ دیوار

فرماتے ہیں ۔ جو بھی آلِ نبی کا دشمن ہو اُس کو یہ طرب خانۂ دہر (یعنی دنیا) سیلاب بن کر اُسے غرق کر دے ۔ جیسے طاقِ دیوار میں کوئی شے رکھ دی جاتی ہے ۔ آلِ نبیؐ ، اُمتِ محمدیہ جس میں سب شامل ہیں ۔

دیدہ تا دل اسدؔ آئینہ یک پرتوِ شوق　　　فیضِ معنی سے خطِ ساغرِ راقم سرشار

فرماتے ہیں اے اسدؔ آنکھ سے دل تک تو پرتوِ شوق کا آئینہ دار ہو جا ۔ اور فیضِ معنی سے اپنے ساغر کو خوب بھر لے اور سرشار ہو جا ۔

منقبت میں

قصیدہ دیگر ۲

دہر جز جلوۂ یکتائی معشوق نہیں — ہم کہاں ہوتے اگر حُسن نہ ہوتا خود بیں

فرماتے ہیں تمام کائنات کا وجود جلوۂ یکتائی معشوق کے سوا نہیں ہے۔ ہر شے میں خالقِ مطلق ہی جلوہ فرما ہے۔ اگر ہمارے خالق و مالک معشوقِ ازل کو خود نمائی اور اپنے آپ کو ظاہر کرنا مقصود نہ ہوتا۔ تو ہمارا یعنی تمام کائنات کا بھی وجود نہ ہوتا۔ ہم سب، تمام کائنات، کیا فرشتے کیا زمین و آسمان کیا مہر و ماہ سب اُسی کے حسن و جمال کا آئینہ ہیں۔ ہر شے کسی نہ کسی رنگ میں اُس کی ازلی و ابدی صفات کی مظہر ہے حتیٰ کہ نور کے ساتھ ظلمت بھی۔

بے دلی ہائے تماشا کہ نہ عبرت ہے، نہ ذوق — بے کسی ہائے تمنا کہ نہ دنیا ہے نہ دیں

فرماتے ہیں :۔ افسوس صد افسوس ہم نے اپنی بے دلی کے سبب دنیا جو کہ لہو و لعب کی جگہ ہے اُس میں تماشا بھی نہ دیکھا۔ اور نہ لوگوں کے اُس سے دل لگانے کے بدانجام سے کوئی عبرت حاصل کی۔ اور یہ ہی حال ہماری تمناؤں کا ہوا ہے۔ تمام عمر بےبسی اور بیکسی میں گنوا دی۔ نہ دُنیا کی مادی لذتوں سے لطف اندوز ہوئے اور نہ ہی دین کی روحانی نعمتوں سے فیضیاب ہوئے بس ہماری بے دلی اور بے کسی نے کہیں کا نہ رکھا۔ نہ خدا ہی ملا نہ وصالِ صنم

ہرزہ ہے نغمۂ زیر و بم ہستی و عدم — لغو ہے آئینۂ فرقِ جنون و تمکیں

فرماتے ہیں :۔ وجودِ ذاتِ باری کے علاوہ کسی اور شے کے وجود و عدم پر گفتگو و بحث لاحاصل ہے۔ صرف اُسی کی ذاتِ اقدس حی و قیوم ہے۔ سب کچھ فنا ہونے والا ہے اور جنوں و تمکیں کا فرق

ظاہر کرنا بھی لغو اور فضول ہے۔

نقشِ معنی ہمہ خمیازۂ عرضِ صورت سخنِ حق ہمہ پیمانۂ ذوقِ تحسیں

فرماتے ہیں ۔ نقشِ معنی کے دعویدار ظاہر پرست ہیں اور حق گوئی کی باتیں کرنے والے محض اپنی شہرت چاہتے ہیں۔ اسرار و عرفان بتانے والے مخلص ہوتے ہیں۔ ان میں ظاہر داری بالکل نہیں ہوتی۔ اور حق گوئی کرنے والے پوشیدہ غرض نہیں رکھتے مگر افسوس صد افسوس کیسا زمانہ آگیا۔ ظاہر پرستی روز بروز بڑھتی جاتی ہے اور تقویٰ اور باطنی طہارت کا نام و نشان نہیں۔

(ضرورت تھی کہ اس وقت کوئی مامور من اللہ ہو)

مرزا غالب نے اپنے زمانہ کا ہو بہو نقشہ مندرجہ بالا شعر میں کھینچ دیا ہے۔

لافِ دانش غلط و نفعِ عبادت معلوم دُردِ یک ساغرِ غفلت ہے، چہ دُنیا و چہ دیں

فرماتے ہیں ۔ جو لوگ اپنی عقلمندی کی ڈینگیں مارتے ہیں۔ وہ بہت غلطی پر ہیں اور وہ بھی جو دنیاوی فائدے کی خاطر دین اختیار کرتے ہیں۔ عبادت کا نفع محبت سے کرنے میں ہے نہ کہ دنیاوی لالچ سے۔ ایسا کرنے والے بالآخر دُنیا و آخرت دونوں برباد کر لیتے ہیں۔

مثلِ مضمونِ وفا باد بہ دستِ تسلیم صورتِ نقشِ قدم خاک بہ فرقِ تمکیں

فرماتے ہیں ۔ دُنیا دار العمل دار الابتلا ہے ہمہ وقت جد و جہد کرنی لازم ہے۔ ورنہ انسان نقشِ قدم کی مانند ایک دن خاک میں مل جائے گا۔ اور دونوں جہانوں میں ذلت و رسوائی کے علاوہ کچھ نہ حاصل ہوگا۔

عشق بے ربطیٔ شیرازۂ اجزائے حواس وصل، زنگارِ رُخِ آئینۂ حُسنِ یقیں

فرماتے ہیں ۔ جن کے اجزائے حواس میں فتور واقع ہو چکا یعنی اہلِ ہوس نے بے ربطیٔ حواس کا

شیرازہ بگڑنے کا نام عشق رکھ لیا ہے۔ لیکن اہلِ یقیں کے نزدیک آئینہ زنگار وصلِ معشوق ہے۔
مطلب یہ ہے کہ اگر آئینہ دل صاف و شفاف کر لیا جائے تو معشوق کا جلوہ ہمہ وقت اپنی ذات
میں ہی نظر آنے لگے۔ اور معشوق کی رفاقت ہمیشہ رہے گی۔
نوٹ: اہلِ یقین سے مراد وہ لوگ ہیں جنھیں حق الیقین حاصل ہو جاتا ہے۔

کوہکن گرسنہ مزدورِ طرب گاہِ رقیب بے ستوں آئینۂ خوابِ گرانِ شیریں

معنی۔ طرب گاہ، فرحت افزا مقام، خوابِ گراں، غفلت کی نیند۔ بے ستوں، بے حقیقت
بے بنیاد، بے ستون۔
فرماتے ہیں: فرہاد مزدوری چاہنے والا مزدور تھا۔ اس کا عشق کامل نہ تھا۔ ورنہ اپنے جذبۂ محبت
کے ذریعہ شیریں کو حاصل کر لیتا۔ کوہِ بے ستوں شیریں کے خوابِ غفلت کی ایک تصویر تھی جس
کے پتھر کاٹتے کاٹتے اُس نے اپنے سر پر تیشہ مار کر جان دے دی۔

کس نے دیکھا نفسِ اہلِ وفا آتش خیز کس نے پایا اثرِ نالۂ دل ہائے حزیں؟
فرماتے ہیں: آج کل اہلِ وفا دلوں کو گرما دینے والی ہستیاں کہاں ہیں۔ کلی طور پر ان ہستیوں کا
فقدان ہے اور اہلِ کرامات بھی نہیں ہیں کہ جن کی اللہ تعالیٰ گریہ وزاری کی دُعائیں قبول کرے
اور اس طرح ان کی دعاؤں سے مخلوقِ خدا فیض حاصل کرے۔

سامعِ زمزمۂ اہلِ جہاں ہوں لیکن نہ سروبرگِ ستائش نہ دماغِ نفریں

بظاہر تو ان لوگوں کے زمزمہ ہیں لیکن دراصل ہرزہ سرائی ہے جو مجھے مجبوراً سننی پڑ رہی ہیں۔ نہ میں ایسے لوگوں کی تعریف کرنا چاہتا ہوں اور نہ ہی اُن کی مذمت کیلئے دماغِ نفریں میرے پاس ہے۔ نہ تعریف کرکے کوئی انعام چاہتا ہوں اور نہ مذمت کرکے موردِ عتاب بننا چاہتا ہوں۔

کس قدر ہرزہ سرا ہوں کہ عیاذاً باللہ یک قلم خارجِ آدابِ وقار و تمکیں

گریز کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔ خدا کی پناہ میں کس قدر بیہودہ باتیں لوگوں کے لئے بک رہا ہوں۔ جو کچھ لکھا ہے وہ یک قلم خارج اور آداب و وقار کے بالکل منافی ہے۔

نقشِ لاحول لکھ اے خامۂ ہذیاں تحریر یا علی عرض کر اے فطرتِ وسواس قریں

فرماتے ہیں۔ اے خامۂ ہذیاں اب تو نقشِ لاحول اور یا علی کہہ کر مدد مانگ۔ اے فطرتِ وسواس قریں۔ تاکہ جو بُرے خیالات پیدا ہوئے ہیں ان کا رفع دفع ہو سکے۔

مظہرِ فیضِ خدا۔ جان و دلِ ختمِ رُسل قبلۂ آلِ نبی کعبۂ ایجادِ یقیں

فرماتے ہیں۔ حضرتِ علیؑ فیضِ خدا کے مظہر اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جان و دل اور اہلِ بیت کے قبلہ و کعبہ ایجادِ یقیں ہیں۔

ہو وہ سرمایۂ ایجادِ جہاں گرمِ خرام ہر کفِ خاک ہے واں گردۂ تصویرِ زمیں

فرماتے ہیں۔ وہ باعثِ تخلیقِ عالمِ جہاں کہیں بھی سرگرمِ خرام ہوتا۔ وہاں کی مشتِ خاک ایک کرۂ زمیں کے برابر مقام حاصل کرلیتی ہے۔

جلوہ پرواز ہو نقشِ قدم اُس کا جس جا　　　وہ کفِ خاک ہے ناموسِ دو عالم کی امیں

فرماتے ہیں۔ اُس کا نقشِ قدم جس جگہ جلوہ فرما ہو۔ وہاں کی کفِ خاک سے دونوں جہانوں کو عزت اور امان ملتی ہے۔

نسبت نام سے اُسکی ہے یہ رُتبہ کہ رہے　　　ابداً پشتِ فلک خم شدہ نازِ زمیں

فرماتے ہیں۔ اُس کی کنیت ابو تراب ہونے کے سبب زمین کو یہ رُتبہ حاصل ہوا کہ فلک بھی تعظیم کرتے ہوئے ابدالآباد اپنی کمر جھکائے کھڑا رہے گا۔ اور اس طرح ہمیشہ زمیں کو فخر رہے گا۔

فیضِ خلق اُس کا ہی شامل ہے کہ ہوتا ہے سدا　　　بوئے گُل سے نَفَسِ بادِ صبا عطر آگیں

فرماتے ہیں۔ بادِ صبا بوئے گُل کی بدولت معطر ہے اور وہ اس وجہ سے ہے کہ علیؑ کا فیض تمام خلق کو پہنچ رہا ہے۔ خلق سے مراد زمین لی ہے۔

بُرشِ تیغ کا اُس کی ہے جہاں میں چرچا　　　قطع ہو جائے نہ سر رشتۂ ایجاد کہیں

فرماتے ہیں۔ اُس کی تیغ کی تیزی سارے عالم میں شہرت رکھتی ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ سر رشتۂ ایجاد اس کی شہرت کے خوف سے کٹ جائے۔

کُفر سوز اُس کا وہ جلوہ ہے کہ جس سے ٹوٹے　　　رنگِ عاشق کی طرح رونقِ بُتخانۂ چیں

فرماتے ہیں۔ میرے ممدوح کا جلوہ کفر کو جلانے اور مٹانے والا ہے کہ جس سے رنگِ عاشق کی طرح بُت خانۂ چین بھی ٹوٹ جاتا ہے۔

جاں پناہا! دل و جاں فیض رسانا! شاہا!　　　وصیِ ختمِ رُسل تو ہے بہ فتوائے یقیں

فرماتے ہیں ۔ اے جان کی پناہ دل و جان کو فیض پہنچانے والے تو ہی ختمِ رسل کا وصی ہے اور اس کا فتویٰ یقین کی حد تک پہنچ گیا ہے ۔

جسمِ اطہر کو ترے دوشِ پیمبر منبر نامِ نامی کو ترے ناصیۂ عرش نگیں

فرماتے ہیں ۔ تیرے جسم پاک کے لئے دوشِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم منبر بنا ۔ اور ترے نام کا نگینہ عرش کے ماتھے پر کندہ ہوا ۔

کس سے ممکن ہے تیری مدح بغیر از واجب شعلۂ شمع مگر شمع پہ باندھے آئیں

فرماتے ہیں ۔ واجب الوجود خدا تعالےٰ کے سوا تیری تعریف کون کر سکتا ہے ۔ جس طرح شمع کی تعریف اس کے شعلہ کے سبب سے ہے ۔ چونکہ تو خدا کا دوست خاتم الاولیا ہے ۔ اس لئے خدا ہی تیری تعریف کر سکتا ہے ۔

آستاں پر ہے ترے جوہرِ آئینۂ سنگ رقمِ بندگی حضرتِ جبریلِ امیں

فرماتے ہیں ۔ تیرے آستاں پر جوہرِ آئینہ کی طرح حضرت جبریل امیں کے سجدے لکھے گئے ۔

تیرے در کے لیے اسبابِ نثار آمادہ خاکیوں کو جو خدا نے دیئے جان و دل و دیں

فرماتے ہیں ۔ تیرے در پر قربان ہونے کے لئے سب تیار ہیں چونکہ تیری ہی خاطر سے انسانوں کو جان و دل اور دین ملا ہے ۔

تیری مدحت کیلئے ہیں دل و جاں کام و زباں تیری تسلیم کو ہیں لوح و قلم دست و جبیں

فرماتے ہیں ۔ تیری مدح سرائی کے لئے دل و جاں اور کام و زباں بنے ہیں اور تیری تسلیم کی خاطر لوح و قلم دست و جبیں ہو گئے ۔

کس سے ہو سکتی ہے مدّاحیِ ممدوحِ خدا　　کس سے ہو سکتی ہے آرائشِ فردوسِ بریں

فرماتے ہیں ۔ جس کا ممدوح خدا تعالیٰ ہو اُس کی تعریف کون کرسکتا ہے اور کون ہے جو عرشِ بریں کی آرائش کرے ۔

جنسِ بازارِ معاصی اسداللہ اسدؔ　　کہ سوا تیرے کوئی اس کا خریدار نہیں

فرماتے ہیں ۔ اسداللہ اسدؔ بازارِ معاصی کی ایک جنس ہے ۔ جس کا تیرے سوا کوئی خریدار نہیں ہے ۔

شوخیِ عرضِ مطالب میں ہے گستاخِ طلب　　ہے ترے حوصلۂ فضل پہ از بس کہ یقیں

فرماتے ہیں ، میری مدح سرائی میں جو شوخیاں مجھ سے سرزد ہوئی ہیں ۔ وہ تیرے حوصلہ اور بخشش پہ مدار کرنے کی وجہ سے ہیں چونکہ میں تری فضل و عطا پر یقین رکھتا ہوں ۔

دے دُعا کو مری وہ مرتبۂ حُسنِ قبول　　کہ اجابت کہے ہر حرف پہ سو بار آمیں

فرماتے ہیں ، میری دُعا کو حسنِ قبول کا وہ درجہ عطا فرما کہ میرے دُعا کے ایک ایک حرف پر اجابت سو بار آمین کہے ۔

غمِ شبیر سے ہو سینہ یہاں تک لبریز　　کہ رہیں خونِ جگر سے مری آنکھیں رنگیں

فرماتے ہیں ۔ غمِ شبیر سے میرے سینہ کو یہاں تک معمور کر دے کہ میں ہمہ وقت خونِ جگر سے آلود آنسو بہاؤں اور یہ اس سبب میری آنکھیں ہمیشہ رنگیں رہیں ۔

طبع کو اُلفتِ دُلدُل میں یہ گرمیِ شوق　　کہ جہاں تک چلے اُس سے قدم اور مجھ سے جبیں

فرماتے ہیں ۔ تیری دُلدُل کی محبت میرے دل میں یہ ذوق وشوق پیدا کر رہی ہے کہ جہاں تک اس کا قدم جائے وہیں میری جبیں ہو یعنی اس کے تمام نقشِ قدم پر سجدہ کرتا جاؤں ۔

دلِ الفت نسب و سینۂ توحید فضا نگہِ جلوہ پرست و نفسِ صدق گزیں

فرماتے ہیں ۔ دل میں تیری محبت کا جوش ہو اور میرے سینہ میں نورِ عرفاں نگاہ جلوہ پرست ہو اور میرے نفس میں صدق جاگزیں ہو ۔

صرفِ اعدا ، اثرِ شُعلۂ دودِ دوزخ وقفِ احباب گل و سنبل فردوسِ بریں

فرماتے ہیں ۔ تیرے دشمنوں کے لئے آگ کے شعلے اور دوزخ کا دھواں خاص کر دیا جائے اور تیرے احباب کے لئے فردوسِ بریں کے گل و سنبل وقف کر دیئے جائیں ۔

بادشاہ ظفر کی مدح میں عید الفطر کے موقع پر لکھا گیا قصیدہ

ہاں مہِ نو سنیں ہم اُس کا نام　　　جس کو تو جھک کے کر رہا ہے سلام

فرماتے ہیں ۔ اچھا مہِ نو اسس کا نام تو بتا جس کو تو جھک کر سلام کر رہا ہے ۔

دو دن آیا ہے تو نظر دمِ صبح　　　یہی انداز اور یہی اندام

فرماتے ہیں ۔ دو دن (۲۹ ویں اور ۳۰ ویں کی رات) صبح کے وقت تو نظر آیا تھا ۔ تو اسی طرح جھکا ہوا ۔
اور اسی اندام کے ساتھ ۔ بظاہر کوئی فرق نہ تھا ۔

بارے دو۲ دن کہاں رہا غائب　　　بندہ عاجز ہے گردشِ ایّام

فرماتے ہیں ۔ تو ہمیں یہ بتا کر تو دو دن کہاں چھپا ہوا تھا ۔ یہ تو ہم جانتے کہ تو بھی غلام ہے اور
گردشِ ایام سے تو بھی عاجز و مجبور ہے ۔

اُڑ کے جاتا کہاں کہ تاروں کا　　　آسماں نے بچھا رکھا تھا دام

فرماتے ہیں ۔ یہ تو ہم جانتے ہیں کہ تیرے لئے کوئی راہِ فرار نہیں ہے چونکہ آسمان نے تاروں کا جال
بچھایا ہوا ہے مطلب یہ ہے کہ خالقِ ازل نے سب کو اپنی اپنی جگہ قید کیا ہوا ہے ۔

مرحبا اے سرورِ خاصِ خواص　　　حبّذا اے نشاطِ عامِ عوام

فرماتے ہیں ۔ سبحان اللہ اے خاص الخاص انسانوں کے سردار اور سبحان اللہ عوام کے لئے بھی
عیش و آرام مہیا کرنے والے ۔

عذر میں تین دن نہ آنے کے لے کے آیا ہے عید کا پیغام
فرماتے ہیں تین دن غیر حاضر رہنے کی معذرت میں اب تو سب کے لئے عید کا پیغام لایا ہے ۔

اُس کو بھولا نہ چاہیئے کہنا صبح جو جائے اور آئے شام
فرماتے ہیں، صبح جا کر جو شام تک واپس آجائے اُس کو بھولا یا گم شدہ کہنا مناسب نہیں ۔

ایک میں کیا کہ سب نے جان لیا تیرا آغاز اور ترا انجام
فرماتے ہیں ۔ ایک میں ہی نہیں بلکہ سب نے جان لیا کہ کیا تیرا آغاز ہے اور کیا انجام ہے ۔

رازِ دل مجھ سے کیوں چھپاتا ہے مجھ کو سمجھا ہے کیا کہیں نمام ؟
معنی ۔ نمّام ، چغل خور ۔ لُترا
فرماتے ہیں ۔ مجھ سے رازِ دل کیوں چھپاتے ہو کیا تو نے مجھے اِدھر کی اُدھر کہنے والا لُترا سمجھ رکھا ہے ۔

جانتا ہوں کہ آج دُنیا میں ایک ہی ہے امید گاہِ اَنام
فرماتے ہیں ۔ میں جانتا ہوں آج ساری دُنیا میں بس ایک ہی بارگاہ ایسی ہے جہاں خاص و عام کی امیدیں بر آتی ہیں ۔

میں نے مانا کہ تو ہے حلقہ بگوش، غالبؔ اُس کا مگر نہیں ہے غُلام
فرماتے ہیں ۔ میں نے مان لیا کہ تو اُس کا حلقہ بگوش ہے ۔ تو کیا غالبؔ اُس کا غلام نہیں ہے ۔

جانتا ہوں کہ جانتا ہے تو تب کہا ہے بہ طرزِ استفہام

فرماتے ہیں۔ ہم دونوں ہی خوب جانتے ہیں مگر میں نے یہ بات بطرزِ استفہام کہی ہے۔

مہرِ تاباں کو ہو تو ہو۔ اے ماہ قرب ہر روزہ بر سبیلِ دوام

فرماتے ہیں۔ اگر مہرِ تاباں کو اُس کی بارگاہ میں رسائی ہر روز اور ہمیشہ کے لئے حاصل ہے تو ہوا اے ماہ

ق

تجھ کو کیا پایہ روشناسی کا جز بہ تقریبِ عیدِ ماہِ صیام

فرماتے ہیں۔ تجھے روشناسی کا رتبہ بجز عید کے اور کب نصیب ہوا ہے یعنی عید الفطر کے دن

جانتا ہوں کہ اُس کے فیض سے تو پھر بنا چاہتا ہے ماہِ تمام

فرماتے ہیں۔ مجھے معلوم ہے کہ تو اُس کے فیض سے پھر ماہِ کامل بنے گا مگر کیا تو بھی اُسے جانتا ہے کہ وہ کون ہے؟

ماہ بن، ماہ تاب بن، مَیں کون؟ مجھ کو کیا بانٹ دے گا تو انعام

فرماتے ہیں۔ تو ماہ بنے یا ماہتاب بنے۔ میں کون ہوں کہ تیرے راستہ میں حائل ہوں، اور مجھے تیرے بننے نہ بننے سے کیا واسطہ تو کونسا مجھے اپنا انعام بانٹ دے گا۔

میرا اپنا جدا معاملہ ہے　　اور کے لین دین سے کیا کام

فرماتے ہیں۔ میرا معاملہ جُدا ہے کیا تجھے ملے نہ ملے۔ مجھے کسی اور کے معاملات سے کوئی غرض نہیں ہے۔ اپنی اپنی قدر وظرف کے مطابق انعام پائیں گے۔

ہے مجھے آرزوئے بخشش خاص　　گر تجھے ہے امید رحمت عام

فرماتے ہیں اگر تجھے رحمت عام کی اُمید ہے تو میرے دل میں بھی بخشش خاص جاگزیں ہے۔

جو کہ بخشے گا تجھ کو فر فروغ　　کیا نہ دے گا مجھے مئے گل فام

فرماتے ہیں۔ میرا ممدوح اگر تجھے زینت ضیا بخشے گا تو کیا مجھے وہ لال پری عطا نہ کرے گا۔

جب کہ چودہ منازل فلکی　　کر چکی قطع تیری تیزئ گام

فرماتے ہیں۔ ہاں تو ماہ کامل تو بنے گا مگر کب؟ جب تو آسمان کی چودہ منازل طے کرے گا۔ اور یہ کوئی آسان کام نہیں۔

تیرے پرتو سے ہوں فروغ پذیر　　کوئے مشکوے وصحن و منظر و بام

فرماتے ہیں۔ ہاں جب تو ماہ کامل بن جائے گا تو تیری روشنی سے کوچے محل سرا صحن اور در و بام سب روشن ہو جائیں گے۔

دیکھنا میرے ہاتھ میں لبریز　　اپنی صورت کا ایک بلوریں جام

فرماتے ہیں۔ جب تو ماہ کامل بنے گا تو اپنی صورت جیسا میرے ہاتھ میں بھی ایک روشن چھلکتا ہوا بلوریں جام دیکھے گا۔

پھر غزل کی روش پہ چل نکلا توسنِ طبع چاہتا تھا لگام

فرماتے ہیں۔ جونہی بادہ وساغر اور شبِ مہ کی بات چلی تو توسنِ طبع نے غزل کا راستہ لیا۔
دراصل توسنِ طبع کو باگ کا اشارہ درکار تھا۔

غزل

زہرِ غم کر چکا تھا میرا کام تجھ کو کس نے کہا کہ ہو بدنام؟

فرماتے ہیں۔ غم کے زہر نے تو پہلے ہی میرا کام تمام کر دیا تھا تجھے کس بیوقوف نے مشورہ دیا کر تو
مجھ پر تیر چلائے اور پھر ناحق بدنامی کا داغ اپنے ماتھے پر لگائے۔

مے ہی پھر کیوں، نہ میں پیے جاؤں؟ غم سے جب ہو گئی ہو زیست حرام

فرماتے ہیں۔ شراب بھی حرام اور غم سے زیست بھی، حرام یعنی دونوں ہی حرام ہیں تو پھر میں کیوں نہ شراب
پیوں۔ شراب سے کم از کم کچھ غم غلط ہونے کا فائدہ تو ہوگا۔

بوسہ کیسا؟ یہی غنیمت ہے کہ نہ سمجھیں وہ لذتِ دشنام

فرماتے ہیں۔ وہ کہاں بوسہ دینے والے ہیں۔ ہم تو اُن کی دشنام دہی کو غنیمت سمجھتے ہیں اور
اسی سے لذت اُٹھاتے ہیں۔ خدا نہ کرے کہ اُس کو ہماری لطف اندوزی کا پتہ نہ چلے۔ نہیں تو
وہ ستم گر اس سے بھی ہمیں محروم کر دے گا۔

کعبے میں جا بجائیں گے ناقوس اب تو باندھا ہے دَیر میں احرام

فرماتے ہیں ۔ اب تو غلطی سے دَیر میں احرام باندھ لیا ہے خیر کوئی بات نہیں ۔ ہم پھر ایسی ہی غلطی کر کے کعبے میں جا کر ناقوس پھونکیں گے ۔ تا دونوں کا حساب برابر ہو جائے ۔

اُس قدح کا ہے دور مجھ کو نقد — چرخ نے لی ہے جس سے گردشِ دام

فرماتے ہیں ۔ مجھے بھی وہ جام عرفان نقد ملا ہے جس شرابِ معرفت سے مست و بیخود ہو کر ہمہ وقت چرخ رقص کر رہا ہے ۔

بوسہ دینے میں اُن کو ہے انکار — دل کے لینے میں جن کو ہے ابرام

فرماتے ہیں ۔ حیرت ہے کہ بوسہ دینے سے انکار کرتے ہیں اور دل کو جلد سے جلد لینے کی ضد ہے ۔

چھیڑتا ہوں کہ اُن کو غصہ آئے — کیوں رکھوں ورنہ غالبؔ اپنا نام

فرماتے ہیں ۔ ان کو چھیڑنے کی غرض سے میں نے اپنا نام غالب رکھا ہے تاکہ انھیں غصہ آئے ورنہ میں تو کبھی کا اُن کے حسنِ دل کش سے مغلوب ہو چکا ہوں ۔

کہہ چکا میں تو سب کچھ اب تُو کہہ — اے پری چہرہ ! پیکِ تیز خرام !

فرماتے ہیں ۔ یہاں پھر راوی کی طرف خطاب ہے کہتے ہیں میں تو سب کچھ کہہ چکا جو کہنے کے لائق تھا ۔ اے پری چہرہ تیز خرام تو بتا کیا کچھ اور تو کہنا چاہتا ہے

کون ہے جس کے در پہ ناصیہ سا — ہیں مہ و مہر و زہرہ و بہرام

معنی ۔ مریخ

فرماتے ہیں ۔ وہ کون ہے جس کے در پر جبیں رگڑنے والے عاجز و مجبور یہ مہ و مہر و زہرہ و بہرام ہر وقت پڑے رہتے ہیں ۔

تو نہیں جانتا تو مجھ سے سُن   نام شاہنشہِ بلند مقام

فرماتے ہیں تو اگر نہیں جانتا تو میں تجھے بتاتا ہوں۔ وہ میرے شاہنشاہِ عالی مقام کا نام ہے۔

قبلۂ چشم و دل بہادر شاہ   مظہرِ ذوالجلالِ والاکرام

فرماتے ہیں۔ جو قبلۂ چشم و دل ہیں ان کا نام بہادر شاہ ہے اور وہ جلال والے اور اکرام والے خدا کے مظہر ہیں۔

شہسوارِ طریقۂ انصاف   نو بہارِ حدیقۂ اسلام

فرماتے ہیں۔ میرا ممدوح [illegible] طریقت وانصاف اور یہ دونوں صفات اس میں ہیں۔ اور ایسا ہونا باغِ اسلام کی نئی بہار ہے۔

جس کا ہر فعل صورتِ اعجاز   جس کا ہر قول معنیِ الہام

فرماتے ہیں۔ اس کا ہر فعل اعجاز نما ہے اور ہر قول الہامِ الٰہی کا معنی ہے۔

بزم میں میزبانِ قیصر و جم   رزم میں اوستادِ رستم و سام

فرماتے ہیں۔ میرا بادشاہ بزم میں قیصر و جم کا میزبان ہے اور رزم میں رستم و سام بہادر پہلوانوں کا استاد ہے مطلب یہ ہے کہ قیصر و جم فیض پاتے ہیں اور رستم و سام اُس سے جنگ کے داؤ پیچ سیکھتے ہیں۔

اے ترا لطف زندگی افزا   اے ترا عہد فرخی فرجام

فرماتے ہیں۔ اب خطاب کرتے ہیں کہ اے میرے بادشاہ تیرے الطاف زندگی بخش ہیں اور تیرا عہد مبارک اور نیک انجام پیدا کرنے والا ہے۔

چشمِ بد دُور! خسروانہ شکوہ — لوحش اللہ! عارفانہ کلام

فرماتے ہیں۔ خدا تجھے نظرِ بد سے ہمیشہ بچائے۔ اور تیری خسروانہ شان و شوکت کو آنچ نہ آئے۔ (چونکہ تیری شان و شوکت، دشمنوں میں حسد پیدا کرنے والی ہے) اور تیرا کلام دلوں کو موہ لینے والا اور عارفانہ ہے۔

جاں نثاروں میں تیرے قیصرِ روم — جرعہ خواروں میں تیرے مرشدِ جام

فرماتے ہیں۔ تیرے جاں نثاروں میں سے قیصرِ روم بھی ہے اور تیرے جرعہ خواروں میں جمشید بھی داخل ہے۔

وارثِ مُلک جانتے ہیں تجھے — ایرج و تور و خسرو و بہرام

فرماتے ہیں۔ میں نے جن بادشاہوں کے نام مصرعہ ثانی میں لکھے ہیں سب کو تیرے وارثِ ملک ہونے کا علم ہے۔

زورِ بازو میں مانتے ہیں تجھے — گیو و گودرز و بیژن و رہام

فرماتے ہیں۔ مصرعہ ثانی میں درج ناموں کے پہلوان تیرے زورِ بازو اور قوّت کا لوہا مانتے ہیں۔

قطعہ

مرحبا مُوشگافیٔ ناوک　　آفریں آب داریٔ صمصام
تیر کو تیرے تیرِ غیر ہدف　　تیغ کو تیری تیغِ خصم نیام

فرماتے ہیں، تیرا تیر بال کی کھال کھینچنے والا ہے کہ دشمن کا تیر اس کا نشانہ ہے اور تیری تلوار کی آب و تاب کی شان و شوکت دیکھنے والی ہے۔ تیرا تیر دشمن کے تیر کو نشانہ بناتا ہے اور تیری تلوار دشمن کے نیام میں اُتر جاتی ہے۔

قطعہ

رعد کا کر رہی ہے کیا دم بند　　برق کو دے رہا ہے کیا الزام
تیرے فیلِ گراں جسد کی صدا　　تیرے رخشِ سبک عناں کا خرام

فرماتے ہیں۔ تیرے ہاتھی کی چنگھاڑ رعد (کڑک) کا دم بند کر رہی ہے اور تیرے گھوڑے کی تیز خرامی بجلی کو سُست رفتاری کا طعنہ دے رہی ہے۔

قطعہ

فنِ صورت گری میں تیرا گرز　　گر نہ رکھتا ہو دستگاہِ تمام
اُس کے مضروب کے سر و تن سے　　کیوں نمایاں ہو صورت ادغام

فرماتے ہیں۔ تیرے گُرز کو مصوری آتی ہے۔ اور اس فن میں اُسے کمالِ تام ہے جب ہی تو وہ ایک ہی ضرب میں دشمن کے سر و تن یکسر ملا دیتا ہے اور ادغام کی تصویر کھینچ دیتا ہے۔

جب ازل میں رقم پذیر ہوئے　　　صفحہ ہائے لیالی و ایّام

فرماتے ہیں۔ روزِ ازل میں رات دان کے لئے جو احکام اوراق پر رقم ہوئے تھے۔

اور ان اوراق میں بہ کلکِ قضا　　　مجملاً مندرج ہوئے احکام

فرماتے ہیں۔ تمام احکام مجمل طریق قضا نے لکھ دیئے تھے۔ اب اُن کی تفصیل و تفسیر قیامت تک جاری رہے گی۔

لکھ دیا شاہدوں کو عاشق کُش　　　لکھ دیا عاشقوں کو دشمنِ کام

فرماتے ہیں۔ معشوقوں کو عاشقوں کا قاتل لکھا اور عاشقوں کی قسمت میں ناکامی و نامرادی لکھی گئی۔

آسماں کو کہا گیا کہ کہیں　　　گنبدِ تیز گردِ نیلی فام

فرماتے ہیں۔ آسمان کو یہ حکم ملا۔ کہ تجھے لوگ گنبد تیز نیلی فام کے نام سے پکاریں گے۔

حکمِ ناطق لکھا گیا کہ لکھیں　　　خال کو دانہ اور زُلف کو دام

فرماتے ہیں۔ اور شعرا کو یہ حکم ملا کہ معشوقوں کے خالِ عارض کو "دانہ" اور زلف کو "دام" لکھیں۔

آتش و آب و باد و خاک نے لی　　　وضعِ سوز و نم و رم و آرام

فرماتے ہیں۔ آگ، پانی، ہوا، خاک کو یہ وضع ملی۔ کہ آگ جلایا کرے۔ پانی کو نم سجھا نا عطا ہوا۔ اور

ہوا کو اڑنا اور اڑانا مِلا جبکہ مٹی کو آرام یعنی مخلوق کی غذا پیدا کر کے آرام پہنچاتے ۔

مہرِ رخشاں کا نام خسروِ روز ماہِ تاباں کا اسم شحنۂ شام

فرماتے ہیں ۔ مہرِ رخشاں کو دن کا بادشاہ (خسروِ روز) خطاب مِلا اور ماہِ تاباں کو شام کا کوتوال (شحنۂ شام)

تیری توقیعِ سلطنت کو بھی دی بدستور صورت ارقام

فرماتے ہیں ۔ تیرے فرمانِ سلطنت کو شان و شوکت والی مُہر ملی ۔ اور حسبِ دستور وزرا بھی ملے ۔ (ارقام ایران میں وزیر یا وزیروں کو کہتے ہیں)

کاتبِ حکم نے بموجبِ حکم اس رقم کو دیا طرازِ دوام

فرماتے ہیں ۔ کاتبِ حکم کے مطابق تیری سلطنت کے فرمان پر دوام لکھا گیا ۔

ہے ازل سے روائیِ آغاز ہو ابد تک رسائیِ انجام!

فرماتے ہیں یہ دُعائیہ آخری شعر قصیدہ کا ۔ کہتے ہیں کہ میری دعا ہے کہ ازل سے ابد تک خدا تیرا انجام اچھا کرے ۔

نوٹ :۔ یہ اُردو قصیدہ مرزا غالب کا اپنی مثال آپ ہے ۔

قصیدہ

صبح دم دروازۂ خاور کھُلا مہرِ عالم تاب کا منظر کھُلا

فرماتے ہیں ۔ صبح ہوتے ہی مشرق کا دروازہ کھُل گیا اور آفتاب دنیا کو گرمی و روشنی دینے والا نمودار ہوا ۔ مطلب یہ ہے کہ مشرقی دروازہ کا دروازہ طلوعِ شمس کا منظر پیش کرنے لگا ۔

خسروِ انجم کے آیا صرف میں شب کو تھا گنجینۂ گوہر کھُلا

فرماتے ہیں ۔ ستاروں کے بادشاہ نے تمام جواہرات کا خزانہ خرچ کر ڈالا ۔ جو ہم نے رات کو چمکتا دمکتا بکھرا ہوا دیکھا تھا ۔

مطلب یہ ہے کہ آفتاب کی ضیا میں تمام ستارے غائب ہو گئے ۔ چونکہ دن (سورج) کی روشنی جو کہ بہت زیادہ ہے سب کو اپنے اندر مدغم کر لیتی ہے ۔

۱۔ وہ بھی تھی اک سیمیا کی سی نمود صبح کو رازِ مہ و اختر کھُلا

۲۔ ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ دیتے ہیں دھوکہ یہ بازیگر کھُلا

فرماتے ہیں (۱) شب کو جو چاند ستارے نظر آ رہے تھے وہ اک سیمیائی نظارہ تھا جو صبح ہوتے ہی غائب ہو گیا اور ہم پر اُن کی اصل حقیقت واضح ہو گئی ۔

(نوٹ) سیمیا ایک قسم کا فن جس میں اشکال قیاسات کے مطابق دکھائی جاتی ہیں ۔ اصل میں ان کا وجود نہیں ہوتا ۔ یعنی ایک قسم کا جادو ہے ۔

(۲) دوسرے شعر کے معنی ہیں فرماتے ہیں ۔ ان ستاروں کی اصل حقیقت کچھ اور ہی ہے ۔ جو

کچھ ہم دیکھتے ہیں وہ وہ نہیں ہیں گویا کہ یہ بازیگریں جو ہمیں دھوکہ دے رہے ہیں ۔

سطحِ گردوں پر پڑا تھا رات کو　　موتیوں کا ہر طرف زیور کھُلا

فرماتے ہیں ۔ رات آسمان پر جو ستارے نظر آرہے تھے وہ موتیوں کا زیور بکھرا ہوا کھلا ہوا پڑا تھا، وہ دراصل شاہدِ اوّل کا زیور تھا جو بے بہا موتیوں سے مُرصّع تھا ۔

صبح آیا جانبِ مشرق نظر　　اک نگارِ آتشیں رُخ، سر کھُلا

فرماتے ہیں فرماتے ہیں وہی رات والا معشوق کی طرح مشرق کی طرف سے صبح دم نظر آیا جس کے رخسار آتشیں اور ننگا سر تھا مطلب یہ ہے کہ پوری آب وتاب سے اپنے حسن کی نمائش کررہا تھا ۔

تھی نظر بندی کیا جب ردِّ سحر　　بادۂ گل رنگ کا ساغر کھُلا

فرماتے ہیں ۔ وہ آتشیں رخسار معشوق گویا جادو کا پتلا تھا ۔ جب ہم نے ردِّ سحر کیا یعنی جادو توڑنے کا عمل کیا تو وہ بادۂ گل رنگ بھرا ساغر تھا ۔

لا کے ساقی نے صبوحی کے لیے　　رکھ دیا ہے ایک جامِ زر کھُلا

فرماتے ہیں ۔ معلوم دیتا ہے کہ ساقیٔ ازل نے ہمارے لئے صبح کی شراب کے لئے ایک سونے کا بہت قیمتی جام جس پر سرپوش نہیں ہے رکھ دیا ہے ۔

بزمِ سلطانی ہوئی آراستہ　　کعبۂ امن و اماں کا در کھُلا

فرماتے ہیں ۔ میں نے جتنی تشبیہات مندرجہ بالا بیان میں پیش کی ہیں اُن سے اصل غرض بزمِ سلطانی کا آراستہ وپیراستہ ہونا اور شان شوکت ظاہر کرنے کے لئے تھا ۔ اور میرے ممدوح بادشاہ

کی بزم ایسی ہے اور یہ کہ جیسے کعبۂ امن داماں کا دروازہ کھل گیا ہو۔

تاجِ زریں، مہرِ تاباں سے ہوا　　　خسروِ آفاق کے منہ پر کھلا

فرماتے ہیں۔ مہر تاباں کا تاج اتنا زیب دینے والا نہیں تھا جتنا ہمارے بادشاہِ عالم کا تاجِ زریں اُن کے منہ پر زیب دیتا ہے۔

شاہِ روشن دل، بہادر شہ، کہ ہے　　　رازِ ہستی اس پہ سرتاسر کھلا

فرماتے ہیں۔ ہمارا بادشاہ روشن دل بہادر بادشاہ ہے۔ اسی وجہ سے اُس پر رازِ ہستی پوری طرح کھل گئے ہیں

وہ کہ جس کی صورتِ تکوین ہیں　　　مقصدِ نُہ چرخ و ہفت اختر کھلا

فرماتے ہیں۔ میرے ممدوح بادشاہ کی صفات ایسی ہیں کہ جن (تکوین) کی پیدائش میں نو آسمانوں اور سات ستاروں کا مقصدِ پیدائش مضمر ہے یعنی ظاہر ہے۔

وہ کہ جس کے ناخنِ تاویل سے　　　عقدۂ احکامِ پیغمبر کھلا

فرماتے ہیں۔ ہمارا بادشاہ ایسا ہے کہ اُس کے ناخنِ تاویل سے احکام رسولؐ کے عقدے کھل جاتے ہیں یعنی حدیثوں کا علم ہم پر روشن ہو جاتا ہے۔

پہلے دارا کا نکل آیا ہے نام　　　اُس کے سرہنگوں کا جب دفتر کھلا

فرماتے ہیں۔ ہراول دستوں کے جب دفتر کھولے گئے تو سرِ فہرست دارا کا نام نکلا۔ یعنی ہمارے بادشاہ کے لئے لڑنے اور جان نثار کرنے والوں میں تھا یا یہ کہ دارا ہمارے ممدوح کی فوج میں اک ادنیٰ سپاہی شمار ہوتا تھا۔

روشناسوں کی جہاں فہرست ہے ۔ واں لکھا ہے چہرہ قیصر کھلا

معنی چہرہ قیصر، حلیہ قیصر

فرماتے ہیں ۔ میرے بادشاہ کے روشناسوں کی جہاں فہرست درج ہے ۔ وہاں واضح سرِفہرست قیصر کا حلیہ لکھا ہے ۔

قطعہ

توسنِ شہ میں وہ خوبی ہے کہ جب ۔ تھاں سے وہ غیرتِ صرصر کھلا

معنی ۔ غیرتِ صرصر، ہوا سے زیادہ تیز چلنے والا ۔

فرماتے ہیں ۔ جب بادشاہ کا گھوڑا تھان سے کھولا جاتا ہے تو وہ ایسی خوبیاں رکھنے والا تیز رفتار ہے کہ ہوا کو بھی غیرت آتی ہے ۔

نقشِ پا کی صورتیں وہ دلفریب ۔ تو کہے بُت خانۂ آزر کھلا

معنی ۔ فرماتے ہیں اور اُس گھوڑے کی چال دیکھنے میں ایسی دلفریب اور دلکش ہے جیسے بُت خانہ آزر کھُل گیا ہو ۔ یعنی سنگِ مرمر کے تراشے ہوئے بت ہیں ۔

مجھ پہ فیضِ تربیت سے شاہ کے ۔ منصبِ مہر و مہ و محور کھلا

فرماتے ہیں ۔ مجھے آفتاب و ماہتاب اور گردش و محور کا علم بادشاہ کی فیضِ تربیت سے حاصل ہوا ۔

لاکھ عقدے دل میں تھے لیکن ہر ایک ۔ میری حدِ وسع سے باہر کھلا

فرماتے ہیں ۔ میرے دل میں ہزاروں عقدے اور مسائل تھے جن کا حل کرنا میری استطاعت سے باہر تھا لیکن بادشاہ کے فیضِ تربیت اور صحبت سے سب حل ہو گئے ۔

تھا دلِ وابستہ قفلِ بے کلید کس نے کھولا کب کھلا ۔ کیونکر کھلا

فرماتے ہیں ۔ میرا دل ایک قفل تھا جس میں کوئی کنجی نہیں لگتی تھی مجھے حیرت ہے کہ وہ کھل گیا کب کھلا، کس طرح کھلا۔ مطلب یہ ہے کہ میرے دل میں عقدوں کے مسائل اور نادر مضامین کا ذخیرہ بند تھا۔ اور اُن کو کھولنے کے لئے عقل کی کنجی کارآمد نہ تھی ۔ ضرورت تھی کہ کوئی بیرونی کنجی اس کو کھولے۔ تو وہ میرے ممدوح بادشاہ نے اپنی فیضِ تربیت و محبت سے کھول دیا۔

باغِ معنی کی دکھاؤں گا بہار مجھ سے گر شاہِ سُخن گستر کھلا

یُوں تو کھُلنے کے معنی بے تکلف ہونے کے ہیں۔ لیکن آدابِ شاہ کو ملحوظ رکھتے ہوئے یہاں نظرِ عنایت اور توجہ کے مناسب ہیں ۔

فرماتے ہیں میں باغِ معنی کی بہار بادشاہ سلامت کو دکھاؤں گا اگر وہ میرے حال پر نظرِ عنایت اور توجہ فرمائیں ۔

ہو جہاں گرمِ غزل خوانی نفس لوگ جانیں طبلۂ عنبر کھلا

معنی طبلۂ عنبر۔ خوشبو کا ڈبہ

فرماتے ہیں ۔ میرا دل چاہتا ہے کہ میں اس زریں موقع پر ایک غزل پیشِ خدمت کروں ۔ تا میرے اشعار کی خوشبو سے ایسا گمان ہو کہ کسی نے عنبر کا ڈبہ کھول دیا ہے ۔

غزل

کنج میں بیٹھا رہوں، یوں پر کھلا   کاش کے ہوتا قفس کا در کھلا

فرماتے ہیں۔ کنج قفس میں پر کھلا بیٹھا ہوں۔ کیا ہی اچھا ہوتا اگر قفس کی کھڑکی کھلی ہوتی تا میں اُڑ کر آزاد ہو جاتا۔ مطلب یہ ہے کہ انساں میں بہت سی صلاحیتیں ہوتی ہیں۔ ہُنر ہوتا ہے۔ قابلیت ہوتی ہے۔ مگر انسان پھر بھی کسی نہ کسی قفس میں مقید ہوتا ہے اور اس کے لئے اس کی فلاح و بہبود کا دروازہ بند ہوتا ہے۔ ایسے وقت میں ہر ایک انسان کے دل سے یہی کلمہ نکلتا ہے۔ "کاش کہ ہوتا قفس کا در کھلا"۔

ہم پکاریں اور کُھلے یوں کون جائے؟   یار کا دروازہ پائیں گر کُھلا

فرماتے ہیں۔ ہمارا اعزاز اور وضع تو یہ چاہتی ہے کہ دروازہ پر جا کر آواز دیں دستک دیں پھر دروازہ کُھلے۔ ہمارا یار ہمیں خوش آمدید کہے پھر ہم اندر جائیں۔ دروازہ کُھلا پائیں اور ہم اندر گھس جائیں۔ نہ نہ یہ ہماری وضع قطع کے خلاف ہے۔ ہم ایسا ہرگز نہیں کریں گے۔

ہم کو ہے اُس راز داری پر گھمنڈ   دوست کا ہے راز دُشمن پر کُھلا

فرماتے ہیں۔ فرماتے ہیں۔ واہ وا کیا خوب ہم اس راز داری پر فخر کر رہے ہیں کہ دوست کا راز ہمارے سوا کسی کو معلوم نہیں۔ حالانکہ دوست کے رازوں سے دشمن خوب آگاہ ہے۔ افسوس صد افسوس اپنے گھمنڈ پر

واقعی دل پہ بھلا لگتا تھا داغ   زخم لیکن داغ سے بہتر کُھلا

معنی زخم کھلنا، زخم تازہ ہونا۔ ۲۔ چمکنا، زینت دینا، بھلا لگنا

فرماتے ہیں۔ دل پر داغ ہونا واقعی باعثِ زینت تھا مگر زخم داغ کے مقابلہ میں بہت زیادہ بہت بہتر چمکتا ہے۔ دوسرے معنی یہ ہو سکتے ہیں کہ داغِ محبت اپنی جگہ خوب تھا مگر اب تو زخمِ محبت ہے۔

ہاتھ سے رکھ دی کب ابرو نے کماں؛ کب کمر سے غمزے کی خنجر کھلا

فرماتے ہیں۔ ابروِ یار اور غمزۂ معشوق سدا عشاق کے قتل پر تلے رہتے ہیں۔ ابرو۔ کمان اور غمزہ تشبیہات ہیں۔

مفت کا کس کو برا ہے بدرقہ؛ رہروی میں پردۂ رہبر کھلا

معنی بدرقہ۔ رہبر، نگہبان

فرماتے ہیں۔ اگر مفت میں رہبر اور نگہبان ملے تو کیا برا ہے گو راہروی میں نام نہاد رہبر کی رہبری کا پردہ چاک ہو گیا کہ منزل سے ناآشنا ئے محض ہے خیر کم از کم ایک آدمی کا ساتھ تو ہے۔

سوزِ دل کا کیا کرے بارانِ اشک آگ بھڑکی مینہ اگر دم بھر کھلا

فرماتے ہیں۔ آتشِ دل کو بارانِ اشک کیونکر بجھا سکتا ہے جبکہ حالت یہ ہے کہ اگر مینہ برسنا دم بھر کے لئے بند ہو تو دبی ہوئی آگ یکدم بھڑک اٹھتی ہے یعنی روتے رہیں تو تپشِ دل کچھ ٹھنڈی ہو جاتی۔ جونہی رونا بند کیا ادھر دل میں دوبارہ شعلے بھڑک اٹھتے ہیں مطلب یہ ہے کہ ایک مصیبت ہو ایک غم ہو ایک مشکل ہو تو اس کا ہم علاج کریں مگر حالت یہ ہے کہ ہم ایک غم سے نجات نہیں پاتے کہ دوسرا غم آ کھڑا ہوتا ہے۔ کس کس غم پر صبر کریں۔

نامے کے ساتھ آگیا پیغامِ مرگ   رہ گیا خط میری چھاتی پر کھُلا

فرماتے ہیں :۔ (پیغامِ مرگ کو شادیٔ مرگ قرار دیتے ہیں)
دوست کا خط میرے لئے شادیٔ مرگ کا بہانہ بن گیا۔ اس قدر خوشی ہوئی کہ میں جان سے ہاتھ دھو بیٹھا اور خط میری چھاتی پر کھُلا کا کھُلا رہ گیا۔

دیکھیو، غالب سے گر اُلجھا کوئی   ہے ولی پوشیدہ اور کافر کھُلا

فرماتے ہیں خبردار غالب سے اُلجھنے کی کبھی جرأت نہ کرنا بظاہر وہ کافر دکھائی دیتا ہے لیکن باطن میں اللہ تعالےٰ کا دوست ہے۔ اُس سے اُلجھنے والے کی خیر نہیں۔

قصیدہ

اب غزل سے گریز کر کے قصیدے کی طرف رُخ کیا ہے۔

پھر ہوا مدحت طرازی کا خیال   پھر مہ و خورشید کا دفتر کھُلا

فرماتے ہیں ۔ پھر میں اپنے ممدوح بادشاہ کی مدحت کی طرف لوٹتا ہوں۔ پھر ایک ایک شعر آفتاب و ماہتاب جیسا قلم نے لکھنا شروع کیا۔

خامے نے پائی طبیعت سے مدد   بادباں کے اُٹھتے ہی لنگر کھُلا

فرماتے ہیں۔ قلم پکڑا ہی تھا کہ طبیعت شعر گوئی یعنی مدحت طرازی کی طرف تیزی سے مائل ہوگئی

گویا جہاز کا بادبان جونہی اُوپر اٹھا لنگر بھی کھول دیا گیا ۔

مدح سے ممدوح کی دیکھی شکوہ   عرض سے یاں رتبہ جوہر کھلا

فرماتے ہیں ۔ تعریف کرنے سے موصوف کا پتہ چلا اُس کی شان و شوکت سب سامنے آگئی ۔
گویا عرضِ بیان سے جوہر کا رُتبہ معلوم ہو گیا کہ وہ کیسا ذرّیں بہا ہے ۔

۱۔ مہر کانپا چرخ چکر کھا گیا   بادشہ کا رایتِ لشکر کھلا

۲۔ بادشاہ کا نام لیتا ہے خطیب   اب علو پایۂ منبر کھلا

پہلے اُوپر والے شعر کے معنی لکھتا ہوں
معنی رایتِ لشکر ۔ نشانِ لشکر
فرماتے ہیں ۔ نشانِ لشکر کے رعب اور دبدبے سے آفتاب لرزنے لگا اور آسمان کو چکر آنے لگے ۔
دوسرے شعر کا مطلب فرماتے ہیں ۔ منبر کا رتبہ اور شان اس وجہ سے بڑھی کہ اس پر خطیب
بادشاہ کے نام کا خطبہ پڑھتا ہے ۔

سکۂ شہ کا ہوا ہے روشناس   اب عیارِ آبروے زر کھلا

فرماتے ہیں ۔ زر و سیم کی قدر و قیمت آبرو اور عزت اس سبب سے کی جاتی ہے کہ اس پر بادشاہ
کا سکہ ہے ۔

شاہ کے آگے دھرا ہے آئینہ   اب مآلِ سعیِ اسکندر کھلا

فرماتے ہیں (کہا جاتا ہے آئینہ سکندر کی ایجاد ہے) شاہ کے آگے آئینہ رکھا ہے اب سکندر
کی کوششوں کا نتیجہ ظاہر ہو گیا ۔

مُلک کے وارث کو دیکھا خلق نے — اب فریبِ طغرل و سنجر کھُلا

فرماتے ہیں۔ مُلک کا بادشاہ بننے کا حق ہمارے ہی بادشاہ کا حق تھا اور وہی حقیقی وارث ہے تمام خلق نے جان پہچان لیا۔ اور طغرل و سنجر جو جھوٹے بادشاہ بن بیٹھے تھے ان کا فریب ظاہر ہو گیا۔

ہو سکے کیا مدح؛ ہاں اک نام ہے — دفترِ مدحِ جہاں داور کھُلا

فرماتے ہیں۔ میں مدح کا حق ادا نہ کر سکا ہاں بادشاہ کے ممدوحوں کی فہرست میں میرا نام بھی دفتر میں لکھا ہے۔

فکر اچھی، پر ستائش ناتمام — عجز و اعجازِ ستائش گر کھُلا

فرماتے ہیں۔ مدح کا حق تو ادا نہ ہو سکا لیکن اعجازِ مدح کا عجز ضرور ظاہر ہو گیا۔

جانتا ہوں ہے خطِ لوحِ ازل — تم پہ اے خاقان نام آور کھُلا

فرماتے ہیں۔ میں یہ جانتا ہوں کہ تم پر لوحِ ازل کا حال واضح ہے۔ اس لئے میں سمجھتا ہوں کہ میرا حال بھی تم سے پوشیدہ نہ ہوگا۔ اب مجھے اپنا حال عرض کرنے کی کیا ضرورت ہے۔

تم کرو صاحبقرانی جب تلک — ہے طلسمِ روز و شب کا دَر کھُلا

فرماتے ہیں تم صاحبِ قرانی کرتے رہو۔ اور شان و شوکت کے ساتھ کرتے رہو جب تلک طلسمِ روز و شب کا دروازہ کھُلا ہے۔ یعنی تا حشر۔ دُعائیہ شعر ہے۔

مثنوی آموں کی تعریف میں

ہاں دلِ دردمند زمزمہ ساز　　کیوں نہ کھولے درِ خزینۂ راز

فرماتے ہیں۔ اے میرے دلِ دردمند اور اے میرے دل زمزمہ ساز تو رازوں کے دروازے کو کیوں نہیں کھولتا۔

خامے کا صفحہ پر رواں ہونا　　شاخِ گُل کا ہے گُل فشاں ہونا

فرماتے ہیں۔ بوقت فکرِ سخن قلم کا صفحہ پر چلنا بالکل ایسا ہی ہے جیسا کہ موسمِ بہار میں شاخِ گُل سے گُلوں کا جھڑنا۔

مجھ سے کیا پوچھتا ہے کیا لکھیئے؟　　نکتہ ہائے خرد فزا لکھیئے

فرماتے ہیں۔ اے دلِ دردمند نغمہ ساز تو مجھ سے کیا پوچھتا ہے کہ کیا لکھیئے ہاں ہاں دل و دماغ کو روشن کرنے والے نکات لکھ۔ اس کے سوا اور کیا لکھے گا۔

بارے آموں کا کچھ بیاں ہو جائے　　خامہ نخلِ رطب فشاں ہو جائے

فرماتے ہیں۔ بہتر خود ہی کہتے ہیں کہ کچھ آموں کی تعریف میں لکھنا چاہیے مگر اس طور سے کہ قلم بھی آموں کی شیرینی اور لذّت سے رطب فشاں ہو جائے یعنی جو کچھ ہو وہ شیریں بیان ہو۔

آم کا کون مردِ میداں ہے؟　　ثمر و شاخ گوئے و چوگاں ہے

فرماتے ہیں حقیقت تو یہ ہے کہ آم کا کوئی اور پھل مدِ مقابل نہیں ہے کسی کی مجال ہی نہیں کہ وہ آئے

اور مقابلہ کرے لہٰذا آم ہی اپنی شاخوں کے ساتھ گیند بلّہ کھیلتے ہیں ۔

تاک کے جی میں کیوں رہے ارماں؟ آئے یہ گوئے اور یہ میداں

فرماتے ہیں ۔ انگور کے دل میں بھی کوئی ارمان نہ رہے ۔ وہ کسی وقت بھی میدانِ کارزار میں آسکتا ہے اور چوگان کی بازی ہم سے لگائے ۔ گیند بلّہ موجود ہے ۔

آم کے آگے پیش جائے خاک پھوڑتا ہے جلے پھپھولے تاک

فرماتے ہیں ۔ جب انگور کی آم کے آگے کچھ پیش نہیں گئی تو دل کے جلے پھپھولے پھوڑتا ہے ۔

نہ چلا جب کسی طرح مقدور بادۂ ناب بن گیا انگور

فرماتے ہیں ۔ جب کسی طرح طاقتِ مقابلہ نہ پائی تو ہار مان کر شرابِ ناب بن گیا ۔

یہ بھی ناچار جی کا کھونا ہے شرم سے پانی پانی ہونا ہے

فرماتے ہیں ۔ انگور کا شراب بننا بھی گویا شرمندگی سے مُنہ چھپانا اور اپنی جان کا فضول کھونا ہی ہے ۔

مجھ سے پوچھو تمہیں خبر کیا ہے آم کے آگے نیشکر کیا ہے

فرماتے ہیں ۔ مجھ سے پوچھو تم اصل حقیقت سے ناواقف ہو کر آم کے سامنے نیشکر (گنا) کی مٹھاس بے معنی ہے کوئی مقابلہ ہی نہیں نہ خوشبو ہے نہ مہک جو دِل و دماغ کو فرحت بخشے مگر یہ سب خوبیاں آم میں ہیں ۔

نہ گُل اس میں نہ شاخ و برگ نہ بار جب خزاں آئے تب ہو اس کی بہار

فرماتے ہیں ۔ نہ گنے میں پھول نہ شاخ نہ پتہ نہ کوئی پھل ۔ اور سب کمزوریوں کے علاوہ سب

سے زیادہ یہ کمزوری کہ اس کی بہار موسمِ خزاں میں ہے ۔

اور دوڑایئے قیاس کہاں ؛ جانِ شیریں میں یہ مٹھاس کہاں

فرماتے ہیں ۔ فکر و قیاس کو آخر کہاں تک دوڑائیں ہمیں تو آم کا کوئی مدِ مقابل نظر نہیں آتا ہیں

تو جانِ شیریں میں بھی سوائے تلخیوں ۔ ناکامیوں ، نامرادیوں کے اور کچھ نظر نہیں آتا ۔

نوٹ :۔ جان کو شیریں کہا ہے ۔ ممکن ہے اشارہ ذاتِ شیریں کی ہی جانب ہو ۔

جان میں ہوتی گر یہ شیرینی کوہ کن باوجود غمگینی

جان دینے میں اُس کو یکتا جان پر وہ یوں سہل دے نہ سکتا جان

نوٹ :۔ ان دونوں شعروں کا مطلب ایک دوسرے سے ملحق ہے ۔ مگر قطعہ معلوم نہیں دیتا ۔

فرماتے ہیں ۔ اگر جان میں ایسی شیرینی ہوتی تو کوہکن باوجود غمگینی اپنی جان کو ہلاک نہ کرتا جس طرح

اس نے جان دیدی لیکن جان دینے میں وہ بے مثل ہے ۔ اگر آم کی شیرینی ہوتی تو یقیناً وہ

آسانی سے جان نہ دے سکتا ۔

نظر آتا ہے یوں مجھے یہ ثمر کہ دواخانۂ ازل میں مگر

فرماتے ہیں ۔ میں تو یہ خیال کرتا ہوں کہ آم دواخانۂ ازل میں اس طرح بنایا گیا شاید

آتشِ گل پہ قند کا قوام شیرے کے تار کو ہے ریشہ نام

فرماتے ہیں ۔ آتشِ گل پہ قند کا قوام چڑھایا گیا اور شیرے کے تار کو ریشۂ آم قرار دیا ۔

یا یہ ہوگا فرطِ رافت سے باغبانوں نے باغ جنت میں

فرماتے ہیں ۔ یا یہ ہوا ہوگا کہ جوشِ محبت اور جوشِ شفقت میں باغبانوں نے باغ جنت سے لا کے لگایا ہوگا ۔

انگبیں کے، بہ حکمِ ربّ النّاس   بھر کے بھیجے ہیں سر بمہر گلاس

فرماتے ہیں ۔ شہد کو اللہ تعالٰے کے حکم سے گلاسوں میں سربند کر کے مہر لگا دی اور دنیا میں لوگوں کے لئے بھیج دیئے ۔

یا لگا کر خضر نے شاخِ نبات   مدّتوں تک دیا ہے آبِ حیات

فرماتے ہیں ۔ یا یہ ہوا ہوگا کہ حضرت خضر علیہ السلام نے اس کی شاخِ نبات لگائی اور پھر ہزاروں سال آبِ حیات سے سینچا ۔

تب ہوا ہے ثمر فشاں یہ نخل   ہم کہاں ورنہ اور کہاں یہ نخل

فرماتے ہیں ۔ تب جا کر یہ شجر اپنا پھل آم اہلِ دنیا کے لئے لایا ورنہ ہم کہاں اس لائق تھے کہ اپنی کوششوں سے آم جیسا پھل پیدا کر سکتے ۔

تھا ترنجِ زر ایک خسرو پاس   رنگ کا زرد، پر کہاں بُو باس

آم کو دیکھتا اگر اک بار   پھینک دیتا طلائے دست افشار

فرماتے ہیں خسرو کے پاس ترنج زر زرد رنگ کا تھا اُس سے جو چاہتا بنا لیتا مگر اُس میں کوئی مٹھاس یا خوشبو نہیں تھی وہ اگر کبھی آم کو دیکھ لیتا تو پھر ترنج زر کو اپنے ہاتھ سے پھینک دیتا اور اُس کی نظر میں اس کندن ترنج زر کی کوئی حیثیت نہ رہتی ۔ چونکہ آم میں تو ساری خوبیاں ہیں ۔

رونقِ کارگاہِ برگ و نوا   نازشِ دودمانِ آب و ہوا

معنی ۔ دودمان = خاندان

فرماتے ہیں ۔ دُنیا کے ساز و سامان کی رونق ہیں اور آب و ہوا ہیں ۔ خوشبو میں آم کا وجود باعثِ فخر ہے ۔

رہروِ راہِ خلد کا توشہ طُوبیٰ و سدرہ کا جگر گوشہ

فرماتے ہیں ۔ جنّت کے مسافروں کی آم زادِ راہ اور طوبیٰ سدرہ کا جگر گوشہ بھی ہے مطلب یہ ہے کہ آم کھاتے کھاتے اگر مرے گا تو وہ جنّت میں جائے گا ۔

صاحبِ شاخ و برگ و بار ہے آم ناز پروردۂ بہار ہے آم

فرماتے ہیں ۔ آم بڑے ساز و سامان والا پھل ہے ۔ بہار نے اس کی پرورش بڑے لاڈ پیار سے کی ہے ۔

خاص وہ آم جو نہ ارزاں ہو نو برِ نخلِ باغِ سلطاں ہو

فرماتے ہیں ۔ خاص کر مجھے وہ آم پسند نہیں جو سستے اور بآسانی مُیسّر آجائیں بلکہ نو برِ نخلِ باغِ سلطان ہو تو کیا ہی اچھا ہے ۔ کہا جاتا ہے کہ قلعہ معلیٰ سے ملحق دو باغ تھے ایک نام مہتاب اور دوسرے کا حیات بخش تھا ۔ اب تو ان کا نشان بھی مٹ گیا ہے ۔

وہ کہ ہے والیٔ ولایتِ عہد عدل سے اُس کے ہے حمایتِ عہد

فرماتے ہیں ۔ میں جس سلطان اور اس کے باغ کا ذکر کر رہا ہوں وہ وہی بادشاہ ہے جس کی ولایت میں عدل و انصاف ہے اور وہ عہد و پیمان کا وارث ہے ۔

فخرِ دیں عز و شان و جاہ و جلال زینتِ طینت و جمال و کمال

فرماتے ہیں ۔ میرے بادشاہ کی ذاتِ گرامی دین کے لئے باعثِ فخر و عزت اور جاہ و جلال والی ہے

اور نیک فطرت کی زینت اور جمال دکھال ہے ۔

کارفرمائے دین و دولت و بخت — چہرہ آرائے تاج و مسند و تخت

فرماتے ہیں ۔ میرا ممدوح بادشاہ دین و دولت و بخت کا کار فرما ہے اور اس کا چہرہ یعنی وجود تاج و مسند و تخت کو اپنی زینت سے آراستہ کرنے والا ہے ۔

سایہ اُس کا ہُما کا سایہ ہے — خلق پر وہ خدا کا سایہ ہے

فرماتے ہیں ۔ اس کا سایہ بابرکت ہے جیسے ہما کا ہوتا ہے اور وہ اپنی رعایا پر خدا کی طرح مہربان ہے ۔ لہٰذا ظلِ اللہ ہے ۔

اے مفیضِ وجودِ سایہ و نور — جب تلک ہے نمودِ سایہ و نور

اُس خداوندِ بندہ پرور کو — وارثِ گنج و تخت و افسر کو

شاد و دل شاد و شادماں رکھیو — اور غالبؔ پہ مہرباں رکھیو

مندرجہ بالا تینوں اشعار دُعائیہ ہیں جن کا مطلب واضح ہے ۔

قطعات

اے شہنشاہِ فلک منظرو بے مثل و نظیر　　اے جہاں دارِ کرم شیوہ، بے شبہ و عدیل

فرماتے ہیں ۔ شہنشاہِ فلک رُتبہ تو بے مثل اور بے نظیر ہے ۔ اور اے بادشاہ تیرا شیوہ کرم کرنا اور بلا شبہ عدل و انصاف کرنا ہے ۔

پاؤں سے تیرے ملے فرقِ ارادت اورنگ　　فرق سے تیرے کرے کسبِ سعادت اکلیل

معنی ۔ فرق، سر　اکلیل، جواہرات سے بنا ہوا تاج

فرماتے ہیں ۔ تخت تیرے قدموں سے اپنا سرِ ارادت (اپنا خواہشمند) ملا کر اور تیرے سر سے تاج سعادت حاصل کر رہے ہیں ۔

تیرا اندازِ سخن شانۂ زلفِ الہام　　تیری رفتارِ قلم جنبشِ بالِ جبریل

فرماتے ہیں ۔ تیرے کلام میں یہ خوبی ہے کہ کلامِ الٰہی کی بہت سی گتھیاں اس طرح اپنے شانۂ سخن سے سلجھا دیتا ہے جیسے شانہ زلفوں کو ۔ نیز تیرے قلم کی رفتار بالِ جبریل کی پرواز کی طرح ہے ۔

تجھ سے عالم پہ کھلا رابطۂ قربِ کلیم　　تجھ سے دنیا میں بچھا مائدۂ بذلِ خلیل

معنی　بذل ۔ جود، سخاوت

فرماتے ہیں ۔ قربِ کلیم اور بذلِ خلیل کی داستانیں ہم نے تیری ذات میں مشاہدہ کر لی ہیں ۔

بہ سخن اوج دہِ مرتبۂ معنی و لفظ　　بکرم ۔ داغ نہِ ناصیۂ قلزم و نیل

فرماتے ہیں ۔ تیرے کلام سے معنی ولفظ کا مرتبہ اُونچا ہو جاتا ہے اور تیری جود وسخا سے تلازم ذیل

بسی شہ رہاتے ہیں ۔

تا ترے وقت میں ہو عیش وطرب کی توقیر   تا ترے عہد میں ہو رنج والم کی تقلیل

معنی توقیر۔ ترقی ۔تقلیل۔ قلت

فرماتے ہیں ۔تیرے عہد میں عیش وطرب کی ترقی اور رنج والم کی قلت ہو جائے ۔

ماہ نے چھوڑ دیا ثور سے جانا باہر   زہرہ نے ترک کیا حوت سے کرنا تحویل

معنی حوت ۔ مچھلی

فرماتے ہیں ۔ نظام شمسی کا بارہواں بُرج جو کہ مُشتری کا گھر جانا جاتا ہے۔ اسی وجہ سے ماہ نے

ثور (برج) سے باہر نکلنا چھوڑ دیا ہے۔ اور زہرہ نے حوت (برج) میں جانا ترک کیا ہے ۔

تیری دانش مری اصلاحِ مفاسد کی رہین   تیری بخشش مری انجاحِ مقاصد کی کفیل

معنی انجاح ۔ حاجت روا ہونا یا کرنا

فرماتے ہیں ۔ اے بادشاہ تیری دانش مندی سے میری خرابیاں دُور ہوتی ہیں اور تیرے جود وکرم سے

میری حاجتیں پوری ہوتی ہیں ۔

تیرا اقبالِ ترحّم مرے جینے کی نوید   تیرا اندازِ تغافل مرے مرنے کی دلیل

فرماتے ہیں ۔ تیرا رحم کی جانب ملتفت ہونا میری زندگی کی خوشخبری ہے اور تیرا تغافل میرے

لئے موت کا پیغام ہے ۔

بختِ ناساز نے چاہا کہ نہ دے مجھ کو اماں   چرخِ کج باز نے چاہا کہ کرے مجھ کو ذلیل

فرماتے ہیں ۔ میری بدنصیبی تو یہ چاہتی تھی کہ مجھے امن واماں نہ ملے ۔ اور آسمان کی گردش بھی ذلیل ورسوا کرنے کا ارادہ کیے ہوئے تھی ۔

پیچھے ڈالی ہے سرِرشتۂ اوقات میں گانٹھ   پہلے ٹھونکی ہے بُنِ ناخنِ تدبیر میں کیل

فرماتے ہیں ۔ بخت ناساز نے پہلے ہمارے ناخنِ تدبیر میں کیل ٹھونک دی تاہم اپنی کسی تدبیر سے گرہ نہ کھول سکیں پھر سررشتہ اوقات میں گرہ لگا دی ۔ مطلب یہ ہے کہ جس قدر وقت ملا اس میں ہماری کوئی کوشش کارگر نہ ہوئی ۔

تپشِ دل نہیں بے رابطۂ خوفِ عظیم   کششِ دم نہیں بے ضابطۂ جرِ ثقیل

فرماتے ہیں ۔ اسی بخت ناساز کی وجہ سے تپشِ دل اور خوفِ عظیم ملے ہیں اور ان دونوں میں گہرا تعلق ہے حتیٰ کہ سانس لینا بھی میرے لئے ایک بڑا بھاری بوجھ اُٹھانے کے مترادف ہے ۔

دُرِ معنی سے مرا صفحہ لقا کی داڑھی   غمِ گیتی سے مرا سینہ عَمَرو کی زنبیل

فرماتے ہیں ۔ معنی کے موتیوں سے مرا کاغذ لقا کی داڑھی بن گیا ہے اور میرا سینہ عمرو عیار کی زنبیل جس میں ہر قسم کا غم لئے ہوئے ہوں ۔

نوٹ :۔ عمرو اور لقا ، داستانِ امیر حمزہ کے دو کردار ہیں ۔

فکر میری گہر اندوزِ اشاراتِ کثیر   کلک میری رقم آموزِ عباراتِ قلیل

فرماتے ہیں ۔ میری فکر گہر اندوز نے تھوڑی سی عبارت میں بے حد اشارات ڈال دیئے ہیں جن سے

آپ پر میرا سب حال روشن ہو جائے گا ۔

میرے ابہام پہ ہوتی ہے تصدق توضیح   میرے اجمال سے کرتی ہے تراوش تفصیل

فرماتے ہیں ۔ میں ایسا فصیح و بلیغ ادیب و شاعر ہوں کہ میرا مبہم بیان کیا ہوا حالِ توضیح سے بڑھ کر وضاحت کرنے والا ہے ۔ اور جو مجمل ہو اس سے تفصیل ٹپکتی ہے ۔

نیک ہوتی مری حالت تو نہ دیتا تکلیف   جمع ہوتی مری خاطر تو نہ کرتا تعجیل

فرماتے ہیں ۔ اگر میری حالت ٹھیک ہوتی اور میری طبیعت بھی پریشان نہ ہوتی تو میں ہرگز حضور والا کو نہ تکلیف دیتا اور نہ ہی جلدی کا مطالبہ کرتا ۔

قبلۂ کون و مکاں خستہ نوازی میں یہ دیر!   کعبۂ امن و اماں عقدہ کشائی میں یہ ڈھیل

سارے قطعہ کا مقصد اسی شعر میں ہے اور حیرت کی یہ بات ہے کہ یہاں مُدعا صاف صاف بیان کر گئے ۔

قطعہ نمبر ۲

گئے وہ دن کہ نادانستہ غیروں کی وفاداری   کیا کرتے تھے تم تقریر، ہم خاموش رہتے تھے

فرماتے ہیں ۔ وہ دن گئے جب تم اپنی لاعلمی کی بنا پر غیروں کی وفاداری اور تعریف و توصیف پر ہمیں لیکچر دیا کرتے تھے ۔ اور ہم چُپ چاپ اپنے دل میں کُھلتے تھے اور سُن لیتے تھے ۔

بس اب بگڑے پہ کیا شرمندگی، جانے دو۔ مل جاؤ
قسم لو ہم سے گر یہ بھی کہیں "کیوں ہم نہ کہتے تھے"

فرماتے ہیں ۔ بس اب جبکہ تمہاری اُن سے بگڑ گئی تو ہم سے شرمندگی تمھاری دامن گیر ہو گئی۔ نہ ملنا اسی شرمندگی کی وجہ سے۔ بس اب جانے دو۔ ہم سے قسم لے لو ہم کبھی یہ بھی نہ کہیں گے "کیوں ہم نہ کہتے تھے۔..

قطعہ نمبر ۳

کلکتے کا جو ذکر کیا تو نے ہم نشیں
اک تیر میرے سینے میں مارا کہ ہائے ہائے!

وہ سبزہ زار ہائے مطرا کہ ہے غضب
وہ نازنیں بتانِ خود آرا کہ ہائے ہائے!

صبر آزما وہ اُن کی نگاہیں۔ کہ حف نظر
طاقت رُبا وہ ان کا اشارا۔ کہ ہائے ہائے!

وہ میوہ ہائے تازہ و شیریں کہ واہ وا!
وہ بادہ ہائے ناب گوارا۔ کہ ہائے ہائے!

معنی حف نظر۔ چشم بد دُور

چاروں اشعار کے معنی صاف ہیں شرح کی ضرورت نہیں ۔

قطعہ نمبر ۴

اس قطعہ کی نسبت کہا جاتا ہے کہ مرزا غالب نے یہ قطعہ کلکتہ کی ایک مجلس میں ایک صاحب کے چیلنج پر فی البدیہہ کہا تھا۔ ایک چکنی ڈلی اپنی جیب سے اس مجلس میں نکال کر اپنی ہتھیلی پر رکھی اور کہا کہ آپ اس پر کچھ کہہ کر دکھائیں۔

ہے جو صاحب کے کفِ دست پہ یہ چکنی ڈلی — زیب دیتا ہے اسے جسقدر اچھا کہیئے

مطلب صاف ہے۔

خامہ انگشت بدنداں کہ اُسے کیا لکھیئے — ناطقہ سر بہ گریباں کہ اسے کیا کہیئے

معنی ۔انگشت بدنداں ، حیرت میں ڈوب جانا ، ناطقہ ، طاقتِ گویائی

فرماتے ہیں ۔ میرا قلم حیرت میں مبتلا ہے کہ اس چکنی ڈلی کو کیا لکھوں اور میری بولنے کی قوت گہرے فکر میں ہے۔

مہرِ مکتوبِ عزیزانِ گرامی لکھیئے — حرزِ بازوئے شگرفانِ خود آرا کہیئے

فرماتے ہیں ۔کسی عزیز کے مکتوبِ گرامی کی مُہر سے مشابہت دینی چاہیئے یا کسی شوخ و شنگ معشوق کے بازو کا تعویز۔

مستی آلودہ سرِ انگشتِ حسیناں لکھیئے — داغِ طرفِ جگرِ عاشقِ شیدا کہیئے

فرماتے ہیں حسینوں کی مستی آلود پور لکھنا چاہیئے ۔یا داغِ جگر عاشقِ شیدا کہنا زیادہ مناسب ہے

خاتمِ دستِ سلیماں کے مشابہ لکھیے   سرِ پستانِ پری زاد سے مانا کہیے

فرماتے ہیں۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کی انگوٹھی کے نگینہ سے تشبیہہ دی جائے یا پری زاد کے پستان جیسا کہا جائے۔

اخترِ سوختۂ قیس سے نسبت دیجے   خالِ مشکینِ رُخِ دل کشِ لیلیٰ کہیے

فرماتے ہیں۔ یا اس چکنی ڈلی کو قیس کی بدقسمتی سے مشابہہ کہا جائے یا رُخِ لیلیٰ کا تِل قرار دیا جائے۔

حجرالاسود دیوارِ حرم کیجے فرض   نافہ آہوئے بیابانِ ختن کا کہیے

فرماتے ہیں۔ اس کو سنگِ اسودِ دیوار حرم فرض کریں۔ یا اُس کو آہوئے ختن کا نافہ کہا جائے۔

وضع میں اس کو اگر جانیے قافِ تریاق   رنگ میں سبزۂ نوخیزِ مسیحا کہیے

فرماتے ہیں۔ اس کی وضع قطع شکل و صورت کو تریاق کا قاف خیال کرنا چاہیے یا رنگ اور تروتازگی کی وجہ سے حضرت مسیح علیہ السلام کا زندہ کیا ہوا مُردہ۔

صومعے میں اُسے ٹھہرائیے گر مہرِ نماز   میکدے میں اِسے خشتِ خُمِ صہبا کہیے

معنی۔ صومعہ = عبادت کی جگہ

فرماتے ہیں۔ عبادت گاہ میں اس کو سجدہ گاہ یا مے کدہ میں اس کو خشتِ پائے خم صہبا کہا جائے۔

کیوں اسے قفلِ درِ گنجِ محبّت لکھیے کیوں اسے نقطۂ پرکارِ تمنّا کہیے

فرماتے ہیں ۔ کیوں نہ اُسے گنجِ محبت کے دروازے کا قفل لکھیں ۔ اور کیوں نہ اسے پرکارِ تمنا کا مرجع نقطہ لکھیں ۔

کیوں اسے گوہرِ نایاب تصور کیجیے کیوں اِسے مردمکِ دیدۂ عنقا کہیے

فرماتے ہیں ۔ ہم کیوں نہ گوہرِ نایاب خیال کریں اور کیوں نہ اسے عنقا کی آنکھ کی پُتلی کہیں ۔

کیوں اسے تکمۂ پیراہنِ لیلیٰ لکھیے کیوں اسے نقشِ پئے ناقۂ سلما کہیے

فرماتے ہیں ۔ کیوں اُسے لیلیٰ کے کُرتے کی گھنڈی کہیں ۔ اور کیوں ہم اُسے اونٹنی کے پیر کی (چاندی سونے کی رتی) رتی کہیں ۔

اپنے حضرت کے کفِ دست کو دل کیجیے فرض اور اس چکنی سپاری کو سویدا کہیے

معنی صاف ہیں

قطعہ نمبر ۵

نہ پوچھ اُس کی حقیقت حضورِ والا نے مجھے جو بھیجی ہے بیسن کی روغنی روٹی

نہ کھاتے گیہوں ۔ نکلتے نہ خلد سے باہر جو کھاتے حضرتِ آدم یہ بیسنی روٹی

معنی صاف ہیں شعر شرح طلب نہیں ہیں ۔

سہرا

خوش ہو اے بخت کہ ہے آج ترے سر سہرا

باندھ شہزادے جواں بخت کے سر پہ سہرا

نوٹ ۔ یہ وہی سہرا ہے جس کے جواب میں استاد ذوق ۔ نے بھی سہرا لکھا تھا ۔ اور مقطع میں مرزا غالب
نے کہا جاتا ہے اشارتاً چوٹ کی تھی ۔

شعر کا مطلب واضح ہے ۔

کیا ہی اِس چاند سے مُکھڑے پہ بھلا لگتا ہے

ہے ترے حُسنِ دل افروز کا زیور سہرا

معنی صاف ہیں ۔

سر پہ چڑھنا تجھے پھبتا ہے پر اے طرفِ کلاہ!

مجھ کو ڈر ہے کہ نہ چھینے ترا لمبر سہرا

فرماتے ہیں ۔ اے گوشہ کلاہ تجھے سر پر چڑھنا زیب دیتا ہے ۔ لیکن مجھے ڈر ہے کہ تیرا رتبہ
کہیں سہرا نہ چھین لے ۔

ناؤ بھر کر ہی پروئے گئے ہوں گے موتی

ورنہ کیوں لائے ہیں کشتی میں لا کر سہرا

کس قدر آب وتاب والا شعر کہا ہے سُبحان اللہ

سات دریا کے فراہم کئے ہوں گے موتی

تب بنا ہو گا اِس انداز کا گز بھر سہرا

معنی صاف ہیں۔

رُخ پہ دُولہا کے جو گرمی سے پسینہ ٹپکا

ہے رگِ ابرِ گہر بار سراسر سہرا

یہ بھی اک بے ادبی تھی کہ قبا سے بڑھ جائے

رہ گیا آن کے دامن کی برابر سہرا

جی میں اترائیں نہ موتی کہ ہمیں ہیں اک چیز

چاہئے پھولوں کا بھی اک، مکرر سہرا

معنی صاف ہیں شرح طلب نہیں

جبکہ اپنے میں سمائیں نہ خوشی کے مارے

گوندھے پھولوں کا بھلا پھر کوئی کیوں کر سہرا

فرماتے ہیں۔ کلیاں بوجہ جوشِ مُسرت کے پھُولی نہیں سماتیں اور بایں وجہ اپنی قبائیں چاک کر بیٹھی ہیں۔ اس حالت میں سہرے کی لڑی میں کیونکر کوئی اُن کو گوندھے۔

رُخِ روشن کی دمک گوہرِ غلطاں کی چمک

کیوں نہ دکھلائے فروغِ مہ و اختر سہرا

فرماتے ہیں۔ رُخِ روشن کو فروغِ ماہ سے اور موتیوں کو (گوہرِ غلطاں) ستاروں کی چمک سے مشابہ کیا ہے۔ نوٹ شعر کی چمک، دمک ستاروں سے کم نہیں۔

تار ریشم کا نہیں۔ ہے یہ رگِ ابرِ بہار

لائے گا تابِ گراں باریِ گوہر سہرا

فرماتے ہیں۔ سہرا ریشم کے تار سے نہیں بلکہ رگِ ابرِ بہار سے گوندھا ہے۔ ریشم کے تار میں یہ تاب و تواں نہ تھی کہ موتیوں کا بوجھ اُٹھا سکے۔

ہم سخن فہم ہیں، غالبؔ کے طرف دار نہیں

دیکھیں کہہ دے کوئی اس سہرے سے بڑھ کر سہرا

ناظرین خود ہی دیکھ لیں۔

معذرت قطعہ

منظور ہے گذارشِ احوالِ واقعی　　اپنا بیانِ حُسنِ طبیعت نہیں مجھے

فرماتے ہیں۔ چاہتا ہوں کہ حالِ واقعی حضورِ والا کی خدمت میں عرض کروں۔ مجھے اپنے بیان کا حُسن دکھانا منظور نہیں ہے۔

سو پشت سے ہے پیشۂ آبا سپہ گری　　کچھ شاعری ذریعۂ عزت نہیں مجھے

فرماتے ہیں ۔ میرے باپ دادوں کا پیشہ سو پشت سے سپہ گری ہے جو اہل قلم ہونے سے میرے نزدیک بہت عزت و وقار کا حامل ہے ۔

آزادہ رو ہوں اور مرا مسلک ہے صلح کل　　ہرگز کبھی کسی سے عداوت نہیں مجھے

فرماتے ہیں ۔ میں آزادہ روش اور صلح کل مسلک رکھتا ہوں کبھی کسی سے دشمنی نہیں کرتا ۔

کیا کم ہے یہ شرف کہ ظفر کا غلام ہوں　　مانا کہ جاہ و منصب و ثروت نہیں مجھے

فرماتے ہیں ۔ یہ شرف میرے لئے کیا کم ہے کہ میں بہادر شاہ ظفر کا غلام ہوں ۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ میرے پاس کوئی عہدہ اور ثروت نہیں ہے ۔

استادِ شہ سے ہو مجھے پرخاش کا خیال　　یہ تاب یہ مجال یہ طاقت نہیں مجھے

فرماتے ہیں ۔ میں پاگل نہیں ہوں کہ استادِ شہ مکرم و محترم سے نوک جھوک کروں ۔ میرے تو خیال کے کسی گوشہ میں یہ بات نہیں ۔ ایسی نہ جرأت اور نہ ہی تاب و تواں رکھتا ہوں ۔

جامِ جہاں نما ہے شہنشاہ کا ضمیر　　سوگند اور گواہ کی حاجت نہیں مجھے

فرماتے ہیں ۔ حضور والا کو قدرت نے وہ ضمیر دیا ہے کہ دنیا جہان کا حال روشن رہتا ہے ۔ جس طرح جمشید بادشاہ کا پیالہ تھا کہ وہ اس میں جس کا چاہے حال دیکھ لیتا تھا ۔ آپ کا ضمیر ایسا ہی ہے لہٰذا مجھے قسم کھانے اور گواہ پیش کرنے کی ضرورت نہیں آپ خود فیصلہ کر لیں ۔

مَیں کون اور ریختہ ؛ ہاں اس سے مدعا　　جُز انبساط خاطرِ حضرت نہیں مجھے

فرماتے ہیں ۔ بھلا میں کہاں اور اردو شاعری کہاں ۔ میری کیا حیثیت کہ ایسا دعویٰ کروں ۔ میرا مدعا اور مقصود صرف اور صرف جہاں پناہ کی خوشنودی ہے ۔

سہرا لکھا گیا زِرہِ امتثالِ امر　　دیکھا کہ چارہ غیرِ اطاعت نہیں مجھے

فرماتے ہیں ۔ سہرا حضور والا کے حکم پر لکھا گیا ہے ۔ اس کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا ۔

مقطع میں آ پڑی ہے سخن گسترانہ بات　　مقصود اس سے قطعِ محبت نہیں مجھے

فرماتے ہیں ۔ مقطع میں مَیں کچھ کہہ گیا ہوں وہ ایک شاعرانہ بات ہے اس سے زائد اور کوئی مقصد نہیں تھا ۔ اور نہ دوستانہ مراسم قطع کرنا مقصود ہے ۔

روئے سخن کسی کی طرف ہو تو روسیاہ　　سودا نہیں جنوں نہیں وحشت نہیں مجھے

فرماتے ہیں ۔ میں نے اگر کسی پہ چوٹ کی غرض سے لکھا ہو تو میرا منہ کالا ۔ میں ایسی حرکت آخر کس لئے کرتا ۔ میں پاگل نہیں مجنوں نہیں وحشی نہیں ۔

قسمت بُری سہی پہ طبیعت بُری نہیں　　ہے شکر کی جگہ کہ شکایت نہیں مجھے

فرماتے ہیں ۔ مانا کہ بدقسمت ہوں لیکن قدرت نے طبیعت بُری نہیں بنائی اور اپنی بدقسمتی کا کسی سے گلا بھی مجھے نہیں ہے ۔

صادق ہوں اپنے قول میں غالب خدا گواہ　　کہتا ہوں سچ کہ جھوٹ کی عادت نہیں مجھے

فرماتے ہیں ۔ غالب خدا کی صفت بھی ہے اور مرزا اسد اللہ خاں صاحب کا تخلص بھی ۔ غالب خدا کہہ کر عبارت میں جو حُسن پیدا کیا ہے ۔ تعریف نہیں ہو سکتی ۔ معنی صاف ہیں ۔

قطعہ نمبر ۸

نصرتِ الملک بہادر! مجھے بتلا کہ مجھے　　تجھ سے جو اتنی ارادت ہے تو کس بات سے ہے؟

فرماتے ہیں۔ اے نصرتِ الملک بہادر آپ مجھے بتلائیں کہ آپ سے اس قدر عقیدت اور قلبی محبت کیوں ہے۔

گرچہ تو وہ ہے کہ ہنگامہ اگر گرم کرے　　رونقِ بزمِ مہ و مہر تری ذات سے ہے

فرماتے ہیں۔ تیری ذاتِ گرامی وہ ہے کہ اگر دربار لگائے تو مہ و مہر کو بھی تیری ذات سے رونق ملے۔

اور میں وہ ہوں کہ گر جی میں کبھی غور کروں　　غیر کیا خود مجھے نفرت مری اوقات سے ہے

فرماتے ہیں۔ مگر میری اپنی حالت یہ ہے کہ میں خود اپنی ذات پر نظرِ غور ڈالتا ہوں تو اس قدر کمزوریاں دکھائی دیتی ہیں۔ غیر تو غیر ہی ہے مجھے خود اپنی اوقات سے نفرت ہوتی ہے۔

خستگی کا ہو بھلا جس کے سبب سے سرِ دست　　نسبت اک گونہ مرے دل کو ترے ہات سے ہے

فرماتے ہیں۔ اپنی خستہ حالی کے سبب سے فی الحال تیری ذرہ نوازی کی جانب آنکھیں لگائے رکھتا ہوں۔ خوش قسمت ہوں کہ مجھے تجھ جیسے محسن سے عقیدت کا تعلق ہے۔

ہاتھ میں تیرے رہے توسنِ دولت کی عناں　　یہ دعا شام و سحر قاضیِ حاجات سے ہے

فرماتے ہیں۔ قاضیِ حاجات سے صبح و شام تیری اقبال مندی کے لئے دعا گو رہتا ہوں۔

تو سکندر ہے مرا فخر ہے ملنا تیرا　　　گو شرفِ خضر کی بھی مجھ کو ملاقات سے ہے

مطلب واضح ہے ۔

اس پہ گذرے نہ گماں ریو و ریا کا زنہار　　　غالبِ خاک نشیں اہلِ خرابات سے ہے

فرماتے ہیں ۔ میرے بیان سے مجھ پر مکاری و ریاکاری کا گماں ہرگز نہ کرنا ۔ میں تو اک خاک نشیں رندِ خرابات ہوں ۔ عابد و زاہد ہونے کا دعویٰ نہیں ۔ نہ ہی میری وضع قطع میں ایسے شک کی گنجائش ہے ۔

قطعہ نمبر ۹

ہے چار شنبہ آخرِ ماہ صفر چلو　　　رکھ دیں چمن میں بھر کے مَے مشک بو کی ناند

فرماتے ہیں ۔ آج آخری ماہِ صفر کا چہار شنبہ ہے ۔ ہمیں چاہیئے کہ ہم چمن میں مے و بو کی ایک ناند بھر کر رکھ دیں ۔

جو آئے جام بھر کے پئے اور ہو کے مست　　　سبزے کو روندتا پھرے پھولوں کو جائے پھاند

فرماتے ہیں ۔ اور ہر آنے والا جام بھر بھر کے ۔ پئے اور جب مست ہو جائے تو گھاس کو روندتا اور پھولوں کو پھاندتا پھرے ۔

بٹتے ہیں سونے روپے کے چھلّے حضور میں　　　ہے جن کے آگے سیم و زر و مہر و ماہ ماند

فرماتے ہیں ۔ حضورِ شاہ دربار میں آج سونے کے چھلّے بانٹتے ہیں جن کے مقابلہ میں چاندی سونے

اور مہر و مہ کی آب و تاب کچھ نہیں ۔

یوں سمجھیے کہ بیچ سے خالی کئے ہوئے   لاکھوں ہی آفتاب ہیں اور بے شمار چاند

فرماتے ہیں ۔ ان جیلوں کو یوں خیال کرنا چاہیئے کہ یہ سینکڑوں آفتاب اور بے شمار چاند ہیں جن کو بیچ میں سے خالی کر دیا گیا ہے ۔

غالب یہ کیا بیاں ہے بجز مدحِ بادشاہ   بھاتی نہیں ہے اب مجھے تیری لذت و خواند

فرماتے ہیں ۔ اے غالب یہ کیا بیان اور کیا فضول گوئی اور کیا تشبیہات لکھ رہا ہے مجھے تو اب بادشاہ سلامت کی مدح کرنی اچھی لگتی ہے ۔

قطعہ نمبر ۱۰

اے شاہِ جہاں گیر جہاں بخش جہاندار   ہے غیب سے ہر دم تجھے صد گونہ بشارت

فرماتے ہیں ۔ بادشاہ کی تین صفات بیان کر کے اشارہ فرماتے ہیں غیب سے بشارت پانے کی وجہ سے تیرا کام ہو جاتا ہے ۔

جو عقدۂ دشوار کہ کوشش سے نہ وا ہو   تو وا کرے اُس عقدے کو سو بھی بہ اشارت

فرماتے ہیں ۔ تیرے ادنیٰ اشارے سے برسوں کے عُقدے حل ہو جاتے ہیں جو دوسروں کی بے حد کد و کاوش سے نہیں حل ہوتے ۔

ممکن ہے کرے خضر سکندر سے ترا ذکر؛   گر لب کو نہ دے چشمۂ حیواں سے طہارت

فرماتے ہیں ۔ یہ عین ممکن ہے کہ حضرت خضر علیہ السلام سکندر سے تیری شان وشوکت عز وجاہ کا تذکرہ کریں مگر تیرے ذکر سے پہلے اُنہیں آبِ حیواں سے کلیاں کر کے اپنے منہ کو مزید پاکیزہ بنانا ہوگا ۔

آصف کو سلیماں کی وزارت سے شرف تھا　　ہے فخرِ سلیماں جو کرے تیری وزارت

فرماتے ہیں ۔ آصف کو سلیمان کا وزیر بننے میں شرف تھا ، مگر میں کہتا ہوں کہ تیری وزارت سے سلیماں کو فخر ہوگا ۔

ہے نقشِ مریدی ترا فرمانِ الٰہی　　ہے داغِ غلامی ترا توقیعِ امارت

فرماتے ہیں ۔ تیری عقیدت اور تیری بیعت حکم الٰہی ہے اور جس کو ترا داغِ غلامی نصیب ہو وہ اس کی امارت کی ضامن ہے ۔

تو آب سے گر سلب کرے طاقتِ سیلاں　　تو آگ سے گر دفع کرے تابِ شرارت

ڈھونڈے نہ ملے موجۂ دریا میں روانی　　باقی نہ رہے آتشِ سوزاں میں حرارت

یہ اشعار لف ونشر کہے جاتے ہیں ۔ یعنی دونوں شعر ایک دوسرے میں لپٹے ہوئے ہیں ۔

ہے گرچہ مجھے نکتہ سرائی میں توغل　　ہے گرچہ مجھے سحر طرازی میں مہارت

فرماتے ہیں ۔ مجھے شعر وشاعری کی دُھن ہے یعنی بہت مشاق شاعر ہوں نکتہ سرائی اور جادو بیانی میں بہت ماہر ہوں ۔

کیونکر نہ کروں مدح کو میں ختم دُعا پر　　قاصر ہے ستایت میں تری میری عبارت

فرماتے ہیں ۔ میں تمہارے اوصاف وبدح کے بیان میں قاصر ہوں ۔ لہٰذا مجبوراً میں مدحت کو دُعا پر

ختم کرتا ہوں۔

نوروز ہے آج اور وہ دن ہے کہ ہوئے ہیں ۔۔۔ نظارگیٔ صنعتِ حق اہلِ بصارت

تجھ کو شرفِ مہرِ جہاں تاب مبارک ۔۔۔ غالبؔ کو ترے عتبۂ عالی کی زیارت

فرماتے ہیں ۔ نیا سال ہے۔ اللہ کی نعمتوں اور قدرتوں کے لوگ نظارے کر رہے ہیں اور آپ کو بھی جہاں کو روشن کرنا مبارک ہو۔ اور غالبؔ کو آپ کے شان و شوکت والے آستاں کی زیارت

قطعہ نمبر ۱۱

افطارِ صوم کی کچھ اگر دستگاہ ہو ۔۔۔ اُس شخص کو ضرور ہے روزہ رکھا کرے

جس پاس روزہ کھول کے کھانے کو کچھ نہ ہو ۔۔۔ روزہ اگر نہ کھائے تو ناچار کیا کرے

معنی و مطالب صاف ہیں کوئی شرح طلب نہیں ۔

قطعہ نمبر ۱۲

اے شہنشاہِ آسماں اورنگ ۔۔۔ اے جہاندارِ آفتاب آثار!

فرماتے ہیں ۔ اے شہنشاہِ بلند و بالا تخت پر بیٹھنے والے اور اے فاتحِ جہاں جس طرح سورج نے دُنیا کو فتح کیا اور فیض کا باعث بنا۔ آپ کی ذاتِ والا ایسی ہے ۔

تھا میں اک بے نوائے گوشہ نشیں　　　تھا میں اک دردمند سینہ فگار

فرماتے ہیں۔ میں اک بے سروسامان گوشہ نشیں دردمند دل سینہ فگار تھا۔

تم نے مجھ کو جو آبرو بخشی　　　ہوئی میری وہ گرمیٔ بازار

فرماتے ہیں۔ آپ عزت نواز ہیں مجھے عزت بخشی جس کے باعث میری شہرت ہوئی۔

کہ ہوا مجھ سا ذرّۂ ناچیز　　　روشناسِ ثوابت و سیّار

فرماتے ہیں۔ میں ناچیز آپ کی نوازش کی وجہ سے اُن ہستیوں میں جو چمکتے ہوئے گھومتے ہیں اور گوشہ نشیں ہستیوں میں شہرت پاگیا۔ یہ سب آپ کی نظرِ عنایت ہے۔

گرچہ از روئے ننگِ بے ہنری　　　ہوں خود اپنی نظر میں اتنا خوار

فرمایا۔ اگرچہ میں بے ننگ و نام بے ہنر خود اپنی نظر میں اپنے آپ کو حقیر جانتا ہوں۔

کہ گر اپنے کو میں کہوں خاکی　　　جانتا ہوں کہ آئے خاک کو عار

شاد ہوں لیکن اپنے جی میں کہ ہوں　　　بادشہ کا غلامِ کار گزار

معنی صاف ہیں۔

خانہ زاد او مرید اور مداح　　　تھا ہمیشہ سے یہ عریضہ نگار

بارے نوکر بھی ہو گیا صد شکر　　　نسبتیں ہو گئیں مشخص چار

نہ کہوں آپ سے تو کس سے کہوں　　　مُدّعائے ضروری الاظہار

فرماتے ہیں ۔ آپ کے سوا میرا کون ہے لہٰذا ضروری امور و مشکلات آپ سے ہی مجھے کہنے ہیں ۔

پیر و مرشد اگرچہ مجھ کو نہیں ذوقِ آرائشِ سر و دستار

فرماتے ہیں ۔ پیر و مرشد مجھے لباسِ فاخرہ کا شوق نہیں ۔ صرف تن کا ڈھانکنا ضروری خیال کرتا ہوں

کچھ تو جاڑے میں چاہیئے آخر تا نہ دے بادِ زمہریر آزار

فرماتے ہیں ۔ موسم سرما میں ٹھنڈ سے بچنے کے لئے کچھ تو چاہیئے ۔ تا نقصان نہ پہنچے

کچھ نہ درکار ہو مجھے پوشش جسم رکھتا ہوں ہے اگرچہ نزار

کچھ خریدا نہیں ہے اب کے سال کچھ بنایا نہیں ہے اب کی بار

رات کو آگ اور دن کو دھوپ بھاڑ میں جائیں ایسے لیل و نہار

آگ تاپے کہاں تلک انساں دھوپ کھائے کہاں تلک جاندار

دُھوپ کی تابش آگ کی گرمی وَقِنَا رَبَّنَا عَذَابَ النَّار

(ہمارے رب ہمیں آگ کے عذاب سے بچا)

میری تنخواہ جو مقرر ہے اُس کے ملنے کا ہے عجب ہنجار

رسم ہے مردے کی چھ ماہی ایک خلق کا اسی چلن پہ مدار

مجھ کو دیکھو تو ہوں بقیدِ حیات اور چھ ماہی ہو سال میں دو بار

بس کہ لیتا ہوں ہر مہینہ قرض	اور رہتی ہے سُود کی تکرار
میری تنخواہ میں تہائی کا	ہو گیا ہے شریک ساہوکار
آج مجھ سا نہیں زمانے میں	شاعرِ نغز گوئے خوش گفتار
رزم کی داستاں اگر سُنیے	ہے زباں میری تیغِ جوہر دار
بزم کا التزام گر کیجئے	ہے قلم میرا ابرِ گوہر بار
ظُلم ہے گر نہ دو سخن کی داد	قہر ہے گر کرو نہ مجھ کو پیار
آپ کا بندہ اور پھِروں ننگا	آپ کا نوکر اور کھاؤں اُدھار
میری تنخواہ کیجئے ماہ بہ ماہ	تا نہ ہو مجھ کو زندگی دشوار
ختم کرتا ہوں اب دُعا پہ کلام	شاعری سے نہیں مجھے سروکار

تُم سلامت رہو ہزار برس
ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار!

یہ قطعہ مرزا غالب نے بہت آسان زبان میں لکھا ہے جو اُن کی خاص طرز سے مختلف ہے۔ لہٰذا اس کی تشریح اور شرح کی ضرورت نہ خیال کی۔

قطعہ نمبر ۱۳

سیہ گلیم ہوں لازم ہے میرا نام نہ لے جہاں میں جو کوئی فتح و ظفر کا طالب ہے
ہوا نہ غلبہ مُیسّر کبھی کسی پہ مجھے کہ جو شریک ہو میرا شریکِ غالب ہے

معنی۔ سیہ گلیم۔ کالا لباس پہنے ہوئے مراد۔ غموں کا مارا ہوا بدقسمت
شریکِ غالب۔ جس کا حصّہ دوسروں سے سوا ہو۔

قطعہ نمبر ۱۴

سہل تھا مسہل ولے یہ سخت مشکل آ پڑی مجھ پہ کیا گزرے گی اتنے روز حاضر نہ ہوئے
تین دن مسہل سے پہلے تین دن مسہل کے بعد تین مسہل تین تبریدیں یہ سب کتنے دن ہوئے

مسہل۔ جلاب، تبرید۔ ٹھنڈ دینے والی معجون، جلاب کے بعد
یہ قطعہ دربار سے غیر حاضر ہونے کے لیے بادشاہ کو لکھا تھا۔

قطعہ نمبر ۱۵

خجستہ انجمن طوئے میرزا جعفر کہ جس کے دیکھے سے سب کا ہوا ہے جی محظوظ

ہوئی ہے ایسے ہی فرخندہ سال میں غالبؔ ‏ ‏ ‏ نہ کیوں ہو مادۂ سالِ عیسوی "محفوظ"

۱۸۵۴ء

قطعہ نمبر ۱۶

ہوئی جب میرزا جعفر کی شادی ‏ ‏ ‏ ہوا بزمِ طرب میں رقصِ ناہید

کہا غالبؔ سے تاریخ اِس کی کیا ہے ‏ ‏ ‏ تو بولا "اِنشراحِ جشنِ جمشید"

۱۲۷۰ء

قطعہ نمبر ۱۷

گو ایک بادشاہ کے سب خانہ زاد ہیں ‏ ‏ ‏ دربار دار لوگ بہم آشنا نہیں

کانوں پہ ہاتھ دھرتے ہوئے کرتے ہیں سلام ‏ ‏ ‏ اس سے ہے یہ مراد کہ ہم آشنا نہیں

نوٹ۔ بادشاہ کے درباری جب ایک دوسرے کو سلام کرتے بجائے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر سلام کرنے کے۔ دائیں کان پہ ہاتھ رکھ لیا کرتے تھے۔ چونکہ اردو میں کانوں پر ہاتھ دھرنے کے معنی ہیں کہ ہم آشنا نہیں۔

رُباعیات

بعد از تمام بزمِ عیدِ اطفال ‏ ‏ ایامِ جوانی رہے ساغر کش حال
آ پہنچے ہیں تا سوادِ اقلیمِ عدم ‏ ‏ اے عمرِ گزشتہ یک قدم استقبال

فرماتے ہیں۔ بچپن کا زمانہ عیدِ اطفال ختم ہو گیا اور جوانی کی بے راہروی بھی اپنے اختتام کو پہنچی اب ہم بڑھاپے سے بھی گزر کر سوادِ اقلیمِ عدم میں داخل ہونے والے ہیں۔ وہاں ہمارے استقبال کو اے عمرِ گزشتہ آ جا تا دو چار دن ایک دفعہ پھر عیدِ اطفال کی بزم لگائیں اور ایامِ جوانی کے دنوں کے بادہ و ساغر اچھالیں۔ مطلب یہ ہے کہ عمرِ گزشتہ دو چار دن کے لئے ہی پلٹ آئے۔

۲

شب۔ زلف و رُخِ عرق فشاں کا غم تھا ‏ ‏ کیا شرح کروں کہ طرفہ تر عالم تھا
رویا میں ہزار آنکھ سے صبح تلک ‏ ‏ ہر قطرۂ اشک دیدۂ پُرنم تھا

فرماتے ہیں۔ رات مجھے اُس کی زلفیں اور رُخِ عرق فشاں اس قدر یاد آیا کہ کیا کہوں میں تمام رات آنسو بہاتا رہا۔ جیسے کوئی ہزار آنکھوں سے یکدم رو رہا ہو ہر آنسو آنکھ کی سفیدی اور سیاہی لیے ہوئے تھا گویا ہر آنسو میرا اک آنکھ بن گیا تھا۔

۳

آتش بازی ہے جیسے شغلِ اطفال ‏ ‏ ہے سوزِ جگر کا بھی اسی طور کا حال

تھا موجدِ عشق بھی قیامت کوئی　　لڑکوں کے لئے گیا ہے، کیا کھیل نکال

فرماتے ہیں۔ آتش بازی جس طرح بچوں کا کھیل ہے اسی طرح پر سوزِ جگر کا جلنا بجھنا ہے عشق کا ایجاد کرنے والا ضرور کوئی قیامت کا پتلا تھا۔ جب بھی حسینانِ جہاں اپنے عاشقوں پر ہمہ وقت ستم کرتے اور عاشقوں کے سوزِ جگر پیدا کرتے ہیں اور یہ شغل ان کو بہت مرغوب ہے۔

۴

دل تھا کہ جو جانِ دردِ تمہید سہی　　بے تابیٔ رشک و حسرتِ دید سہی

ہم اور فسردن اے تجلّی افسوس　　تکرار روا نہیں تو تجدید سہی

فرماتے ہیں۔ جب دل رکھتے تھے تو زندگی سے متعلق تمام مصائب و آلام برداشت کر لیا کرتے تھے مثلاً بے تابی و رشک و حسرتِ دید۔ ان کو سہہ لینے کی ہمت و طاقت تھی مگر اب ہم یا یہ افسردگی و بے تابی۔ اے تجلّیٔ طور اگر تکرار عدم سے لانا خلافِ قانون ہے جائز نہیں۔ تو کم از کم کچھ تجدید تو ہو سکتی ہے یعنی تھوڑی بہت کمی بیشی سے مجھے سوز و گداز مہیا کر۔ تا میری یہ ہوس پوری ہو۔

۵

ہے خلق حسد قماش لڑنے کے لیے　　وحشت کدۂ تلاش لڑنے کے لیے

یعنی ہر بار صورتِ کاغذِ باد　　ملتے ہیں یہ بدمعاش لڑنے کے لیے

فرماتے ہیں۔ آج کل لوگوں نے حسد کرنا اپنا شعار بنا لیا ہے۔ کام کاج کی تلاش بھی لڑنے مرنے کی غرض سے دکھائی دیتی ہے۔ جب بھی یہ بدمعاش باہم ملتے ہیں تو کاغذِ باد یعنی (پتنگ) کی طرح لڑتے ہیں۔

۶

دل سخت نژند ہو گیا ہے گویا　　اُس سے گلہ مند ہو گیا ہے گویا
پر یار کے آگے بول سکتے نہیں　　غالبؔ مُنہ بند ہو گیا ہے گویا

معنی نژند، غمگین

فرماتے ہیں۔ یار سے گلہ مند ہونے کی وجہ سے دل بہت، اُداس غمگین ہے اور ان دونوں باتوں کے سبب ہم یار کے سامنے بول نہیں سکتے جیسے کہ غالبؔ منہ بند ہو گیا ہے۔

۷

دُکھ جی کے پسند ہو گیا ہے غالبؔ　　دل رک کر بند ہو گیا ہے غالبؔ
واللہ شب کو نیند آتی ہی نہیں　　سونا سوگند ہو گیا ہے غالبؔ

معنی صاف ہیں۔

۸

مشکل ہے زبس کلام میرا اے دل،　　سُن سُن کے اُسے سخنورانِ کامل،
آساں کہنے کی کرتے ہیں فرمائش　　گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل

فرماتے ہیں۔ اے دلِ غالبؔ میرا کلام سخنورانِ کامل کے لئے بھی مشکل ہے وہ سہل اور آسان کہنے کی فرمائش کرتے ہیں۔ جو میرے لئے مشکل ہے چونکہ طبیعت کا تقاضا ہے کہ بلند و بالا مضمون اشعار میں بیاں کروں اور آسان و سہل الفاظ اُن مضموں کے حامل نہیں ہو سکتے۔ اب کروں تو کیا کروں

نہ اپنی طبیعت کو بدل سکتا ہوں اور نہ اُن کی کم فہمی دُور کر سکتا ہوں ۔

۹

بھیجی ہے جو مجھ کو شاہِ جم جاہ نے دال ہے لُطف و عنایاتِ شہنشاہ پہ دال

یہ شاہ پسند دال بے بحث و جدال ہے دولت و دین و دانش و داد کی دال

فرماتے ہیں ۔ مونگ کی دال بادشاہ کو بہت پسند تھی جو "شاہ پسند" کہلاتی تھی اس کے شکریہ میں یہ رباعی شاہ کو لکھ بھیجی تھی بطور شکریہ ۔

۱۰

ہیں شہ میں صفاتِ ذوالجلالی باہم آثارِ جلالی و جمالی باہم

ہوں شاد نہ کیوں سافل و عالی باہم ہے اب کے شبِ قدر و دیوالی باہم

فرماتے ہیں ۔ ہمارے بادشاہ سلامت جلالی اور جمالی دونوں صفات سے متصف ہیں لہٰذا ہندو مسلمان دونوں ہی (سافل و عالی) خوش ہیں چونکہ دیوالی اور شبِ قدر ایک ہی دن ہے ۔

۱۱

حق شہ کی بقا سے خلق کو شاد کرے تا شاہ شیوعِ دانش و داد کرے

یہ دی جو گئی ہے رشتۂ عمر میں گانٹھ ہے صفر کہ افزائشِ اعداد کرے

فرماتے ہیں ۔ اللہ تعالیٰ بادشاہ کو سلامتی بخشے تا بادشاہ اپنی رعایا میں عقل و دانش کی مدد سے عدل و انصاف کو جاری و ساری رکھے ۔ اور آپ کے رشتۂ عمر میں جو ایک گانٹھ لگی ہے اس میں ایک صفر کی زیادتی ہوئی ہے

۱۲

اس رشتہ میں لاکھ تار ہوں بلکہ سوا
اتنے ہی برس شمار ہوں بلکہ سوا

ہر سیکڑہ کو ایک گرہ فرض کریں
ایسی گرہیں ہزار ہوں بلکہ سوا

مزید دعائیہ رباعی معنی صاف ہیں ۔

۱۳

کہتے ہیں کہ اب وہ مردم آزار نہیں
عشاق کی پرسش سے اُسے عار نہیں

جو ہاتھ کہ ظُلم سے اُٹھایا ہوگا
کیونکر مانوں کہ اُس میں تلوار نہیں

۱۴

ہم گرچہ بنے سلام کرنے والے
کرتے ہیں درنگ کام کرنے والے

کہتے ہیں کہیں خدا سے اللہ اللہ!
وہ آپ ہیں صبح و شام کرنے والے

درنگ ۔ دیر توقف ۔تاخیر. وقفہ

۱۵

سامانِ خور و خواب کہاں سے لاؤں؟
آرام کے اسباب کہاں سے لاؤں؟

روزہ مرا ایمان ہے غالبؔ لیکن
خس خانہ و برف آب کہاں سے لاؤں؟

۱۶

ان سیموں کے بیجوں کو کوئی کیا جانے
بھیجے ہیں جو ارمغاں شہ والا نے

گن کر دیویں گے دعائیں سو بار
فیروزہ کی تسبیح کے ہیں یہ دانے

۱۷

رقعہ کا جواب کیوں نہ بھیجا تم نے
ثاقبؔ حرکت یہ کی ہے بے جا تم نے

حاجی کلّو کو دے کے بے وجہ جواب
غالبؔ کا پکا دیا کلیجا تم نے

۱۸

اے روشنیٔ دیدہ شہاب الدین خاں
کٹتا ہے بتاؤ کس طرح سے رمضاں؟

ہوتی ہے تراویح سے فرصت کب تک
سنتے ہو تراویح میں کتنا قرآں؟

وہ اشعار، قطعات اور قصیدہ جو دواوینِ مروجہ میں نہیں ہیں

قصیدہ نمبر ا

مرحبا سالِ فرخی آئین　　عیدِ شوال و ماہِ فرور دین

فرماتے ہیں ۔ مرحبا سالِ خوش نصیبی، عیدالفطر و فرور دین (فارسی سال کا پہلا مہینہ)

شب و روز افتخارِ لیل و نہار　　مہ و سال اشرفِ شہور و سنین

فرماتے ہیں، باعثِ فخر شب و روز لیل و نہار اور مہ و سال جو اشرف ہیں سارے مہینوں اور سالوں میں

گرچہ ہے بعد عید کے نو روز　　ایک بیش از سہ ہفتہ بعد نہیں

فرماتے ہیں۔ اگرچہ عید کے بعد نو روز ہے لیکن اکیس دن سے زیادہ دور نہیں

سو اس اکیس دن میں ہولی کے　　جابجا مجلسیں ہوئیں رنگیں

فرماتے ہیں۔ اُن اکیس دنوں میں جگہ جگہ ہولی کی تقریبات دھوم دھام سے منائی جائیں گی

شہر میں کو بہ کو عبیر و گلال　　باغ میں سو بسو گُل و نسریں

فرماتے ہیں ۔ سارے شہر میں خوشبو دار سفوف، گلدستے اور باغوں کی طرح پھول گُل و نسریں کھلیں گے ۔

شہر گویا نمونۂ گلزار | باغ گویا نگارخانۂ چیں

فرماتے ہیں۔ شہر گلزار ہی نہیں بلکہ چین کا نگار خانہ بنے گا۔

تین تیوہار اور ایسے خُوب | جمع ہرگز ہوئے نہ ہوں گے کہیں

فرماتے ہیں۔ اس خوبی کے ساتھ تین تیوہار کبھی جمع نہیں ہوئے ہوں گے۔

پھر ہُوئی ہے اِسی مہینے میں | منعقد محفلِ نشاط قریں

فرماتے ہیں۔ پھر خوشی کی بات یہ بھی کہ اسی مہینہ میں محفلِ نشاط (بھی) منعقد ہوگی۔

محفلِ غسلِ صحتِ نوّاب | رونق افزائے مسندِ تمکیں

فرماتے ہیں۔ اور نواب صاحب غسلِ صحت کی محفل میں رونق افروز ہو کر اپنی مسند کو قوت و تمکین بخشیں گے۔

بزم گہ میں امیرِ شاہ نشان | رزم گہ میں حریفِ شیرِ مکیں

فرماتے ہیں۔ موصوف کی ذات والا بزم میں شاہانہ اور جنگ میں شیر جیسی ہے۔

پیش گاہِ حضور شوکت و جاہ | خیر خواہِ جنابِ دولت و دیں

فرماتے ہیں۔ آپ کی مسند آسمان کا ٹکڑا اور انگوٹھی میں آفتاب جیسا نگینہ جڑا ہے

جن کی مسند کا آسماں گوشہ | جن کی خاتم کا آفتاب نگیں

فرماتے ہیں۔ آپ کی مسند آسمان کا ٹکڑا اور انگوٹھی میں آفتاب جیسا نگینہ جڑا ہے۔

جن کی دیوارِ قصر کے نیچے آسماں ہے گدائے سایہ نشیں

فرماتے ہیں۔ اور موصوف کے محل کی دیوار کا سایہ آسماں بھی چاہتا ہے کہ مل جائے۔

دہر میں اس طرح کی بزمِ سرور نہ ہوئی ہو کبھی بروئے زمیں

فرماتے ہیں۔ دنیا میں اس طرح کی بزمِ سرور کبھی نہیں دیکھی گئی۔

انجمِ چرخ گوہر آگیں فرش نورِ بے ماہ ساغرِ سیمیں

فرماتے ہیں۔ فرش پر تارے چمک دمک رہے ہیں۔ نورِ چاند کے بغیر چاندنی ہوگئی ہے

راجہ اندر کا جو اکھاڑا ہے ہے وہ بالائے سطحِ چرخِ بریں

فرماتے ہیں۔ راجہ اندر کا اکھاڑا چرخ بریں کی بالائی سطح پر پہنچ گیا لیکن یہ زمین پر رونق افروز ہے۔

وہ نظر گاہِ اہلِ وہم و خیال یہ ضیا بخشِ چشمِ اہلِ یقیں

فرماتے ہیں۔ اب تو وہ بس اہل وہم کے ہی خیال میں ہے۔ مگر یہ مسند اہل یقین کی آنکھوں کو روشن کر رہا ہے۔

واں کہاں یہ عطا و بذل و کرم؟ کہ جہاں گدیہ گر کا نام نہیں

فرماتے ہیں۔ اندر کے اکھاڑے میں ایسی جود و سخا کس نے دیکھی۔ وہاں تو کسی گداگر کا نام نہیں سنا۔

یاں زمیں پر نظر جہاں تک جائے ژالہ آسا بچھے ہیں درِ ثمین

فرماتے ہیں۔ لیکن یہاں تو جدھر نظر اٹھاؤ ہیرے جواہرات بکھرے ہوئے نظر آتے ہیں (یعنی جود و سخاوت کے لئے)

نغمۂ مُطربانِ زہرا نوا　　جلوۂ لولیانِ ماہ جبیں

فرماتے ہیں ۔ زہرہ نوا نغمے گانے والیاں اور چاند جیسی صورت والیاں جلوہ گر ہیں ۔

اس اکھاڑے میں جو کہ ہے مظنون　　یاں وہ دیکھا بہ چشمِ صورت ہیں

فرماتے ہیں ۔ جو کچھ ذہن میں آسکتا ہے وہ وہاں موجود ہے۔ ہم خود بہ چشم دیکھتے ہیں مطلب ہے خیالی نہیں ہے ۔

سرورِ مہر فر ہوا جو سوار　　بہ کمالِ تجمل و تزئیں

فرماتے ہیں ۔ آرائش و زینت کا سردار بہ کمال جلوہ افروز ہے ۔

سب نے جانا کہ ہے پری توسن　　اور بالِ پری ہے دامنِ زیں

فرماتے ہیں ۔ دُنیا نے جان لیا کہ پری توسن اور پری کے پیروں والی زین پر سوار وہ سردار ہے۔

نقشِ سمِ سمند سے یکسر　　بن گیا دشت دامنِ گلچیں

فرماتے ہیں سمِ سمند کے نشانوں سے دشت، گلچین کے دامن جیسا گل و گلزار بنا ہوا ہے ۔

فوج کی گرد راہ مشک فشاں　　رہ رووں کے مشام عطر آگیں

فرماتے ہیں ۔ فوج کی راہ گرد مشک کی خوشبو چلنے والوں کے لئے ہر طرف عطر بکھیر رہی ہے ۔

بس کہ بخشی ہے فوج کو عزت　　فوج کا ہر پیادہ ہے فرزیں

فرماتے ہیں۔ فوج کو بڑی عزت ملی ہے حتیٰ کہ پیادہ بھی بڑی عقل و دانش رکھتا ہے

موکبِ خاص یوں زمیں پر تھا　　جس طرح ہے سپہر پر پرویں
فرماتے ہیں۔ یہ لشکر زمین پر آسمان کے ستاروں جیسا معلوم دیتا ہے۔

چھوڑ دیتا تھا گور کو بہرام　　ران پر داغ تازہ دے کے وہیں
فرماتے ہیں۔ بہرام گورخر کو شکار کرتا ہے تو اس کی ران پر ضرب لگا کر چھوڑ دیتا ہے

اور داغ آپ کی غلامی کا　　خاص بہرام کا ہے زیبِ سریں
فرماتے ہیں۔ اور بہرام کا وہ داغ لگانا اصل میں آپ کی غلامی کا ٹھپہ ہے۔

بندہ پرور ثنا طرازی سے　　مدعا عرضِ فنِ شعر نہیں
فرماتے ہیں۔ بندہ پرور مدح سرائی سے مقصد فنِ شاعری نہیں ہے

آپ کی مدح اور میرا منہ　　گر کہوں بھی تو آئے کس کو یقیں
فرماتے ہیں کہاں آپ کی مدح اور کہاں میرا منہ اگر کسی سے کہوں تو اُسے یقین بھی نہ آئے۔

اور پھر اب کہ ضعفِ پیری سے　　ہو گیا ہوں نزار و زار و حزیں
فرماتے ہیں۔ اور اُس پہ بڑھاپا جس کی وجہ سے کمزور ہی نہیں بلکہ حالتِ زار اور غمگین رہتا ہوں۔

پیری و نیستی خدا کی پناہ　　دستِ خالی و خاطرِ غمگیں

فرماتے ہیں ۔ بڑھاپے کے ساتھ بدنصیبی و ناداری، پیسہ پاس نہیں اور خاطر کا غم زدہ رہنا ۔

صرف اظہار ہے ارادت کا ۔ ہے قلم کو جو سجدہ زیرِ زمیں

فرماتے ہیں ۔ جو کچھ لکھ رہا ہوں وہ محض عقیدت ہے اسی وجہ سے قلم سرنگوں ہے ۔

مدح گستر نہیں دُعا گو ہے ۔ غالبِ عاجزِ نیاز آگیں

فرماتے ہیں ۔ آپ کی محض مدح ہی نہیں بلکہ آپ مجھے اپنا خیر خواہ اور دعا گو خیال کریں۔ غالب نیاز مند ہے

ہے دُعا بھی یہی کہ دُنیا میں ۔ تم رہو زندہ جاوداں ! آمیں

فرماتے ہیں۔ بس میری دُعا یہی ہے کہ آپ کو حیاتِ جاوداں عطا ہو ۔

قطعہ نمبر ۲

ایک اہلِ درد نے سنسان جو دیکھا قفس ۔ یوں کہا آتی نہیں اب کیوں صدائے عندلیب؟

بال و پر دو چار دکھلا کر کہا صیّاد نے ۔ یہ نشانی رہ گئی ہے اب بجائے عندلیب

معنی صاف ہیں ۔

۳

اُٹھا اِک دن بگولا سا جو کچھ مَیں جوشِ وحشت میں

سراسیمہ پھرا، گھبرا گیا تھا جی بیاباں سے

نظر آیا مجھے اک طائرِ مجروحِ پر بستہ

ٹپکتا تھا سرِ شوریدہ دیوارِ گلستاں سے

کہا مَیں نے کہ او گمنام! آخر ماجرا کیا ہے

پڑا ہے کام تجھ کو کس ستمگر آفتِ جاں سے

ہنسا کچھ کھِل کھِلا کر پہلے، پھر مُجھ کو جو پہچانا

تو یہ رویا کہ جوئے خُوں بہی پلکوں کے داماں سے

کہا مَیں صید ہوں اُس کا کہ جس کے دامِ گیسو میں

پھنسا کرتے ہیں طائر روز آکر باغِ رضواں سے

اُسی کی زلف و رُخ کا دھیان ہے شام و سحر مجھ کو

نہ مطلب کفر سے ہے اور نہ ہے کچھ کام ایماں سے

بچشمِ غور جو دیکھا مرا ہی طائرِ دل تھا

کہ جل کر ہو گیا یوں خاک میری آہِ سوزاں سے

ما بحث شرح نہیں

۴

اِس کتابِ طربِ نصاب نے جب   آب و تابِ انطباع کی پائی

فرماتے ہیں۔ اس مسرت انگیز نصاب نے جب مخفی حُسن ظاہر کیا۔

فکرِ تاریخِ سال میں مجھ کو   ایک صورت نئی نظر آئی

فرماتے ہیں۔ تو مجھے فکرِ تاریخِ سال میں ایک نیا طریق نظر آیا۔

ہندسے پہلے سات سات کے دو   دیئے ناگاہ مجھ کو دکھلائی

فرماتے ہیں۔ اور وہ یہ ہے کہ پہلے سات سات ۲ عدد مجھے نظر آئے یعنی ۷۷

اور پھر ہندسہ تھا بارہ کا   باہزاراں ہزار زیبائی۔

فرماتے ہیں۔ بعد ازاں بارہ کا ہندسہ ہزاروں کا ہزار نظر آیا یعنی ۱۲۷۷

سالِ ہجری تو ہوگیا معلوم   بے شمولِ عبارت آرائی

فرماتے ہیں۔ اس طریق سے سالِ ہجری نکل آیا (بغیر حروف ابجد) کی عبارت آرائی کئے ہوئے۔

مگر اب ذوقِ بذلہ سنجی کو   ہے جداگانہ کارفرمائی

فرماتے ہیں۔ مگر ذوقِ بذلہ سنجی نے اپنا الگ، کام کیا۔

سات اور سات ہوتے ہیں چودہ　　　بہ امیدِ سعادت افزائی

فرماتے ہیں ۔ یعنی سات کو سات میں جمع کیا نیک خواہش رکھتے ہوئے ۔

غرض اس سے ہیں چار دہ معصوم　　　جس سے ہے چشم و جاں کو زیبائی

فرماتے ہیں ۔ اس طرح چودہ معصوم نکل آئے ۔ جن سے چشم جان کو زینت ملتی ہے ۔

در بارہ امام ہیں بارہ　　　جس سے ایماں کو ہے توانائی

فرماتے ہیں ۔ دربارہ میں امام ہیں بارہ ۔ جن کی وجہ سے تقویتِ ایمان ہے

اُن کو غالب یہ سال اچھا ہے
جو ائمہ کے ہیں تولائی

فرماتے ہیں ۔ اُن کے لئے غالب یہ سال مبارک ہے جو بارہ ائمہ کے تولائی ہوں ۔

غزل

شبِ وصال میں مونس گیا ہے بن تکیہ　　　ہوا ہے موجبِ آرامِ جان و تن تکیہ

فرماتے ہیں ۔ شب وصال میں تکیہ آرام دہ اور دوست ہے ۔ وہ جسم و جاں موجبِ راحت و آرام ہے

خراج بادشہِ چیں سے کیوں نہ مانگوں آج؟ — کہ بن گیا ہے خمِ جعدِ پُرشکن تکیہ

فرماتے ہیں۔ شاہِ چین سے میں خراجِ تحسین کیوں نہ چاہوں جبکہ میرے محبوب کے گھنگریالے بالوں کا تکیہ مجھے حاصل ہے مطلب یہ ہے کہ اس جیسا تکیہ شاہِ چین کو بھی حاصل ہو جائے۔

بنا ہے تختۂ گل ہائے یاسمیں بستر — ہوا ہے دستۂ نسرین و نسترن تکیہ

فرماتے ہیں۔ میرے بستر کا گدا یاسمین کے پھولوں کا ہے جس میں ماسوا پھولوں کے اور کچھ نہیں۔ تکیہ بھی پھولوں کا گلدستہ ہے اور وہ بھی بیلے اور چنبیلی کے پھولوں کا۔

فروغِ حُسن سے روشن ہے خوابگاہ تمام — جو رختِ خواب ہے پرویں، تو ہے پرن تکیہ

فرماتے ہیں۔ رختِ خواب، سونے کا لباس کہتے ہیں میرا سارا شبستاں فروغِ حسن سے جگ مگ کر رہا ہے اور رختِ خواب نبات النعش اور عقدِ ثریا ہے

مزا ملے کہو کیا خاک ساتھ سونے کا — رکھے جو بیچ میں وہ شوخ سیم تن تکیہ

معنی صاف ہیں۔

اگرچہ تھا یہ ارادہ مگر خدا کا شکر — اُٹھا سکا نہ نزاکت سے گلبدن تکیہ

معنی صاف ہیں۔

ہوا ہے کاٹ کے چادر کو ناگہاں غائب — اگرچہ زانوئے نل پر رکھے دمن تکیہ

معنی۔ نل، راجہ، دمن اس کی محبوبہ

بضربِ تیشہ، وہ اس واسطے ہلاک ہوا — کہ ضربِ تیشہ پہ رکھتا تھا کوہکن تکیہ

فرماتے ہیں ۔ کوہکن تیشہ سے یوں ہلاک ہوا کہ وہ تیشہ کے فن پر تکیہ کئے ہوئے تھا۔ اُسے چاہیئے تھا کہ شیریں کے دل کو اپنے جذبۂ محبت اور عشق سے اُسے فتح کرتا اور انہیں پر توکل کرتا نہ کہ تیشہ پر

یہ رات بھر کا ہے ہنگامہ صبح ہونے تک — رکھو نہ شمع پر اے اہلِ انجمن تکیہ

فرماتے ہیں ۔ زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں ۔ تھوڑی سی دیر کا ہنگامہ ہے ۔ بایں وجہ ! اے اہلِ انجمن زندگی پر تکیہ نہ کرو ۔

اگرچہ پھینک دیا تم نے دُور سے لیکن — اُٹھائے کیونکہ یہ رنجورِ خستہ تن تکیہ

فرماتے ہیں ۔ تم نے دُور سے اگرچہ میری طرف تکیہ پھینک بھی دیا تو میں کیسے اُٹھاؤں ۔ میں بیمار و نحیف ہوں ۔

غش آ گیا جو پس از قتل میرے قاتل کو — ہوئی ہے اُس کو مری نعشِ بے کفن تکیہ

فرماتے ہیں ۔ میرے قتل کے بعد میرا قاتل بوجہ حیرت واستعجاب بیہوش ہو کر گر گیا اور میری نعشِ بے کفن نے اُس کو سہارا دیا اور اُس کے لئے تکیہ بنا ۔

روا رکھو نہ رکھو، تھا جو لفظ تکیہ کلام — اب اس کو کہتے ہیں اہلِ سخن سخن تکیہ

فرماتے ہیں ۔ شبِ فراق میں میری اذیّت کا یہ حال ہے کہ میرا بچھونا سانپ ہے اور میرا تکیہ سانپ کا مُہرہ ہے ۔ مطلب یہ ہے کہ جسم کو چین ہے نہ دماغی سکون ہے ۔

ہم اور تم فلکِ پیر جس کو کہتے ہیں
فقیرِ غالبِ مسکیں کا ہے کہن تکیہ

معنی صاف ہیں ۔

۶

جس دن سے کہ ہم خستہ گرفتارِ بلا ہیں — کپڑوں میں جوئیں بخیے کے ٹانکوں سے سوا ہیں

معنی صاف ہیں۔

۷

میں ہوں مشتاقِ جفا مجھ پہ جفا اور سہی — تم ہو بیداد سے خوش اِس سے سوا اور سہی

غیر کی مرگ کا غم کس لئے اے غیرتِ ماہ — ہیں ہوس پیشہ بہت وہ نہ ہوا اور سہی

تُم ہو بُت پھر تمھیں پندارِ خدائی کیوں ہے — تم خداوند ہی کہلاؤ خدا اور سہی

حُسن میں حُور سے بڑھ کر نہیں ہونے کے کبھی — آپ کا شیوۂ انداز و ادا اور سہی

تیرے کوچہ کا ہے مائل دلِ مضطر میرا — کعبہ اِک اور سہی، قبلہ نما اور سہی

کوئی دُنیا میں مگر باغ نہیں ہے واعظ — خُلد بھی باغ ہے خیر آب و ہوا اور سہی

کیوں نہ فردوس میں دوزخ کو ملا لیں یارب — سیر کے واسطے تھوڑی سی فضا اور سہی

مجھ کو وہ دو کہ جسے کھا کے نہ پانی مانگوں — زہر کچھ اور سہی آبِ بقا اور سہی

مجھ سے غالب یہ علائی نے غزل لکھوائی — اک بے داد گرِ رنج فزا اور سہی

۸

بس کہ فعالِ مایرید ہے آج — ہر سلحشور انگلستاں کا

معنی۔ فعال۔ بہت کام کرنے والا اللہ ۔ مایرید۔ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔ سلحشور۔ ہتھیار بند، زرہ پہنے ہوئے سپاہی

گھر سے بازار میں نکلتے ہوئے — زہرہ ہوتا ہے آبِ انساں کا

چوک جس کو کہیں، وہ مقتل ہے — گھر بنا ہے نمونہ زنداں کا

شہر دھلی کا ذرّہ ذرّہ خاک — تشنۂ خوں ہے ہر مسلماں کا

کوئی واں سے نہ آسکے یاں تک — آدمی واں نہ جا سکے یاں کا

میں نے مانا کہ مل گئے پھر کیا — وہی رونا تن و دل و جاں کا

گاہ جل کر کیا کیے شکوہ — سوزشِ داغہائے پنہاں کا

گاہ رو کر کہا کیے باھم — ماجرا دیدہ ہائے گریاں کا

اس طرح کے وصال سے یارب — کیا مٹے داغ دل سے ہجراں کا

معنی صاف ہیں

۹

بہ رہنِ شرم ہے باوصفِ شوخی اہتمام اس کا نگیں میں جوں شرارِ سنگ ناپیدا ہے نام اس کا

فرماتے ہیں۔ معشوق نے اوصافِ شوخی کو شرم کے رہن کر دیئے ہیں۔ اس لئے ظاہر نہیں ہوتے جس طرح قیمتی نگینہ میں شرارِ سنگ۔ چھپا ہوتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ معشوق نے شوخی ناز و ادا کو بوجہ شرم چھپایا ہوا ہے لیکن شوخی کے اوصاف با اہتمام سارے موجود ہیں ۔

مسیِ آلودہ ہے مُہرِ نوازش نامہ ظاہر ہے کہ داغِ آرزوئے بوسہ دیتا ہے پیام اس کا

فرماتے ہیں ۔ نوازش نامہ پر مُہرِ مسی لگانے کا سبب یہ ہے کہ ہمیں داغِ آرزوئے بوسہ کا پیغام ملتا رہے۔ تاکہ ہم ناامید ہو کر کہیں ترکِ محبت نہ کر بیٹھیں ۔

بامیدِ نگاہِ خاص ہوں محمل کشِ حسرت مبادا ہو عناں گیرِ تغافل لطفِ عام اُس کا

فرماتے ہیں ۔ اس کے محمل سے لطفِ خاص کی امید لگائے ہوں کہ اس کا عناں گیر تغافل یک دم باگ چھوڑ دے اور لطفِ عام ہونے لگے ۔

۱۰

شب کہ ذوقِ گفتگو سے تیرے دل بیتاب تھا شوخیِ وحشت سے افسانہ فسونِ خواب تھا

فرماتے ہیں مدت تیرے ساتھ محوِ گفتگو ہونے کے لئے میرا دل بے حد تڑپتا تھا۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شوخیِ وحشت بڑھی اور خواب کا فسوں افسانہ بن کے رہ گیا ۔

واں ہجومِ نغمہ ہائے سازِ عشرت تھا اسد ناخنِ غم یاں سرِ تارِ نفس مضراب تھا

فرماتے ہیں ۔ واں ہمارا معشوق سازِ عشرت پہ نغمات گا اور سُن رہا تھا ۔ اِدھر ہم ناخنِ غم مضراب بنا کر زندگی کا ستار بجا رہے تھے ۔

۱۱

دودکو آج اُسکے ماتم میں سیہ پوشی ہوئی وہ دلِ سوزاں کہ کل تک شمع ماتم خانہ تھا

فرماتے ہیں ۔ ہمارا دلِ سوزاں جو کل تک ، ماتم خانہ میں شمع کا کام دے رہا تھا ۔ آج اس کی حالت یہ ہے کہ یکسر جل کر راکھ ہوگیا اور اب دھواں دل کے ماتم میں سیہ پوش ہے

شکوۂ یاراں غبارِ دل میں پنہاں کر دیا غالبؔ ایسے گنج کو شایاں یہی ویرانہ تھا

فرماتے ہیں ۔ دوست احباب کے شکوے شکایات ہم نے دل کے غبار میں دبا دیئے چونکہ غالب ایسے خزانے کے یہی شایانِ شان تھا کہ انہیں ہم اپنے ویران حسرت زدہ دل میں دفن کریں ۔

۱۲

پھر وہ سوئے چمن آتا ہے خدا خیر کرے رنگ اُڑتا ہے گُلستاں کے ہواداروں کا

فرماتے ہیں معشوق نے پھر سیرِ چمن کا ارادہ کیا ہے ۔ خدا خیر کرے ۔ اس وجہ سے گلستان کے خیر خواہوں میں، کھلبلی مچ رہی ہے ۔ کہ اب آبروئے چمن کا کیا حال ہو ۔

۱۳

معزولیِ تپش ہوئی افرازِ انتظار چشم کشودہ حلقۂ بیرونِ در آج

فرماتے ہیں ۔ انتظار بہت زیادہ ہونے کے سبب تپش فی الحال معطل ہے اور اسی انتظار کے سبب میری آنکھیں اس قدر کھُلی رہیں جیسے صدر دروازہ پر دستک دینے والا کھڑا ہوتا ہے ۔

۱۴

میر کے شعر کا احوال کہوں کیا غالبؔ　　جس کا دیوان کم از گلشنِ کشمیر نہیں

معنی صاف ہیں

۱۵

مے کشی کو نہ سمجھ بے حاصل　　بادہ غالبؔ عرقِ بید نہیں

معنی صاف ہیں۔

۱۶

ہے نزاکت بس کہ فصلِ گل میں معمارِ چمن　　قالبِ گُل میں ڈھلی ہے خشتِ دیوارِ چمن

فرماتے ہیں۔ فصلِ گل میں معمارِ چمن (قدرت) کی یہ ایک نزاکت اور صنّاعی تو دیکھو کہ جس نے چمن کی ہر دیوار (اُدکش) کی ہر اینٹ گُل کے سانچے میں ڈھال دی ہے۔

۱۷

ظاہر ہیں میری شکل سے افسوس کے نشاں　　خارِ الم سے پشت بہ دنداں گزیدہ ہوں

فرماتے ہیں۔ میرے چہرے پر رنج واَلم کے ایسے نشان نظر آ رہے ہیں جیسے کسی نے خارِ اَلم سے کمر پر کھجایا ہو اور دانتوں کے مشابہ نشان پڑ گئے ہوں۔

ہوں گرمیٔ نشاطِ تصوّر سے نغمہ سنج　　میں عندلیبِ گلشنِ ناآفریدہ ہوں

معنی صاف ہیں۔

۱۸

ابر روتا ہے کہ بزم طرب آمادہ کرو　　　برق ہنستی ہے کہ فرصت کوئی دم دے ہم کو

فرماتے ہیں ۔ ابر چاہتا ہے کہ بزم طرب لگے مگر برق ہنستی ہے کہ فرصت ہستی کتنی قلیل ہے مطلب یہ ہے کہ انسان محنت و مشقت کر کے سامانِ راحت اکٹھا کرتا ہے اور ادھر زندگی کی کشتی کنارے آلگتی ہے ۔

۱۹

ہندوستان سایۂ گل پائے تخت تھا　　　جاہ و جلال عہدِ وصال بتاں نہ پوچھ

معنی صاف ہیں ۔

ہر داغِ تازہ یک دلِ داغ انتظار　　　عرضِ فضائے سینۂ درد امتحاں نہ پوچھ

فرماتے ہیں ۔ ہر تازہ داغ انتظار کا دل پر ہے لہٰذا عرض و طولِ سینہ نہ پوچھ مطلب یہ ہے کہ زندگی میں غم ہی غم ہے لہٰذا صبر کیے رکھو ۔

کہتا تھا کل وہ محرمِ راز اپنے سے کہ ہاں　　　دردِ جدائی اسد اللہ خاں نہ پوچھ

فرماتے ہیں ۔ وہ محرم راز کل اپنے آپ سے کہہ رہا تھا کہ دردِ جدائی کا حال اسد اللہ خاں سے نہ پوچھ ۔ مطلب یہ ہے کہ محرم راز پہلے ہی حال سے واقف ہے ۔

۲۰

دیدہ خونبار ہے مدت سے و لے آج ندیم　　　دل کے ٹکڑے بھی کئی خون کے شامل آئے

معنی صاف ہیں ۔

اب ہے دلّی کی طرف کوچ ہمارا غالبؔ　　آج ہم حضرتِ نواب سے بھی مل آئے

معنی صاف ہیں۔

۲۱

ہجومِ ریزشِ خوں کے سبب رنگ اُڑ نہیں سکتا　　حنائے پنجۂ صیّاد مرغِ رشتہ برپا ہے

فرماتے ہیں۔ ہجومِ ریزشِ خوں کے سبب چہرے کا رنگ نہ بدلے گا۔ چونکہ پنجۂ صیاد اور مرغِ دل میں ایک گو ارشتہ قائم رہے ہے۔ معشوق اپنے ہاتھوں میں عاشق کے خون کی مہندی لگا تا رہے گا۔

۲۲

غالبؔ زبس کہ سوکھ گئے چشم میں سرشک　　آنسو کی بوند گوہرِ نایاب ہو گئی

معنی صاف ہیں

۲۳

بہلا ہے یاں تک اشکوں میں غبارِ کلفتِ خاطر　　کہ چشمِ تر میں ہر اک پارۂ دل پائے درِ گِل ہے

معنی۔ پائے درِ گِل۔ پیر دلدل میں ہونا۔

۲۴

کمالِ حسن اگر موقوفِ اندازِ تغافل ہو　　تکلّف برطرف تجھ سے تری تصویر بہتر ہے

معنی صاف ہیں۔

۲۵

حیراں ہوں شوخیٔ رگِ یاقوت، دیکھ کر　　یاں ہے کہ صحبتِ خس و آتش برار ہے

معنی صاف ہیں

۲۶

چند تصویرِ بتاں، چند حسینوں کے خطوط　　بعد مرنے کے مرے گھر سے یہ ساماں نکلا

معنی صاف ہیں ۔

یہ مسائل تصوف یہ تیرا بیان غالب
تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

علمِ و عرفان پبلشرز
34۔ اردو بازار، لاہور، فون: 7232336، 7352332
www.ilmoirfanpublishers.com, E-mail: ilmoirfanpublishers@hotmail.com